زندگیاں صحابہؓ کی
مصنف؛ ڈاکٹر عبدالرحمٰن رآفت پاشا
مترجم؛ ابو جاوید اقبال احمد قاسمی

زندگیاں صحابہؓ کی

ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا

ترجمہ

ابوجاوید اقبال احمد قاسمی

ناشر

مشتاق بک کارنر

الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

نام کتاب ——— زندگیاں صحابہؓ کی

مصنف ——— ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا

مترجم ——— ابوجاوید اقبال احمد قاسمی

ناشر ——— مشتاق بک کارنر لاہور

پرنٹرز ——— ایم عصمت پرنٹرز

قیمت ——— /- روپے

کتاب ہذا میں اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ادارہ کو مطلع فرما کر شکریہ ادا کرنے کا موقع فراہم کریں تاکہ اگلے ایڈیشن میں درستگی کی جاسکے۔ شکریہ

فہرست

"جو شخص پیروی کرنا چاہے، اُسے اُن لوگوں کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکے ہیں اس لیے کہ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے، اس کے فتنہ میں پڑنے اور دینِ حق سے ہٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔

وہ لوگ جن کی پیروی کرنی ہے اصحابِ محمدؐ ہیں۔ وہ لوگ اس اُمّت کے افضل ترین افراد تھے، اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری تھی۔ وہ دین کا گہرا علم رکھتے تھے اور تکلّف سے دُور تھے۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

مسلمانو! تم ان کا مقام پہچانو، ان کے پیچھے چلو اور ان کے اخلاق و سیرت کو حتی الامکان مضبوطی سے پکڑو اس لیے کہ وہ لوگ صراطِ مستقیم، اور اللہ کی بتائی ہوئی راہِ ہدایت پر تھے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اِنَّ اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اهْتَدَیْتُمْ

(حدیث نبویؐ)

میرے صحابہؓ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مترجم

ملت کی نوجوان نسل کی ذہنی تربیت اور عملی تحریک کے لیے ہر زمانے میں ایسے لٹریچر کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے جو اس مقصد کے لیے مفید اور کار آمد ثابت ہو، جس کے مطالعے سے نوجوانوں کے اندر اسلامی رُوح پیدا و مستحکم ہو، ان کا خوابیدہ شعور جاگ اُٹھے اور اُنھیں اپنی اس بے پناہ قوتِ تسخیر کا اندازہ ہو جائے ــــ جسے قدرت نے ان کے وجود میں ودیعت کر رکھا ہے ــــ اور وہ اپنے شکست نا آشنا عزم و حوصلہ سے کام لے کر ارواح و اجساد کی دنیا کی تسخیر کا عظیم کارنامہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔

اس مقصد کے تحت لکھی گئی کتابوں میں وہ کتابیں خاص طور سے مفید اور کارگر پائی گئی ہیں جن میں اسلاف خصوصاً صحابۂ کرامؓ کی سیرتوں اور ان کی زندگیوں کے عظیم الشان اور حیرت انگیز کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اپنی جگہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ نبی کریمؐ کی سیرت کے بعد جن مبارک ہستیوں کی سیرتوں کا مطالعہ مسلمانوں خصوصاً ان کی نوجوان نسل کی ذہنی تربیت اور عملی رہنمائی کے لیے ناگزیر اور غیر معمولی حد تک موثر ہے وہ آپؐ کے صحابۂ کرامؓ ہیں۔

مصر کے مشہور عالم اور معروف صاحبِ قلم ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا مرحوم کی کتاب "صُوَرٌ مِن حَیاۃِ الصَّحَابَۃ" سوانحی ادب میں ایک منفرد اور ممتاز مقام کی حامل کتاب ہے۔ اس کتاب میں مصنفؒ نے اٹھاون صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں کے مختلف گوشوں اور ان کے بے مثال کارناموں کو اس انداز اور ترتیب سے پیش کیا

ہے نہ دورِ صحابہ کی اسلامی تاریخ کا بہت بڑا حصہ سامنے آگیا ہے۔ یہ اٹھاون صحابہؓ ان ہزاروں بزرگ ترین ہستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کے زمانے میں رسول کریمؐ کی دعوت پر ایمان لائے، جو آپ کی نصرت وحمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جنھوں نے اپنی زندگیاں اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے وقف کردی تھیں۔ ہم ان اٹھاون صحابہ کی سیرتوں میں تمام صحابۂ کرامؓ کی قوتِ ایمانی، جاں نثاری وجاں سپاری، ثبات قدمی و بہادری اور خدا و رسول سے ان کی محبت کی حسین ودلآویز تصاویر دیکھ سکتے ہیں۔

"صُوَرٌ مِن حَیَاۃِ الصَّحَابَۃ" میں مصنفؒ کا اندازِ بیان ایسا منفرد، پُرسوز اور اس قدر موثر ہے کہ قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دورانِ مطالعہ ایسے بہت سے مقامات آتے ہیں جہاں قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ کردار وعمل اور فداکاری وجاں نثاری کے ایک ہمالیہ کے نیچے کھڑا ہے۔ وہاں اسے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس جبلِ عظیم کے سامنے اس کی حیثیت ایک ذرہ حقیر سے بھی کم تر ہے۔ پھر یہ احساس عقیدت وندامت کے ملے جلے جذبات میں ڈھل جاتا ہے اور پھر اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ اس کے حضور عقیدت کے کچھ موتی نثار کیے اور اپنی بے مائگی پر ندامت کے آنسو بہائے بغیر آگے بڑھ سکے۔ اور یہ اعجاز ہے صحابۂ کرامؓ کی دل کش شخصیات کا، اور یہ تاثیر ہے عربی زبان وادب اور مرتبِ مولف کے اندازِ بیان کی۔

مترجم کے بیان وقلم میں نہ مصنف جیسی قوت ہے نہ اس کی زبان میں عربی زبان کا حسن اور اس کی وسعت۔ پھر بھی اس نے اپنی حد تک اس بات کی کوشش کی ہے کہ اصل کتاب کا حسن اور اس کی اثر انگیزی حتی الامکان باقی رہے اور پڑھنے والوں کو اس کا احساس نہ ہو کہ وہ کسی کتاب کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں:

فروری ۱۹۸۵ء میں عزیزم طارق فارقلیط فلاحی مدیر ماہنامہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ کی فرمائش پر "صُوَرٌ مِن حَیَاۃِ الصَّحَابَۃ" کے ترجمے کا آغاز ہوا تھا اور تقریباً آدھی کتاب انتیس ۲۹ قسطوں میں حیاتِ نو میں شائع ہو چکی تھی کہ جون ۱۹۸۸ء میں یو۔کے اسلامک مشن کی دعوت پر مجھے برطانیہ منتقل ہونا پڑا۔ یہاں کتاب دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ کا یہ کام تقریباً پندرہ مہینوں تک معرضِ التوا میں پڑا رہا۔ پھر کتاب فراہم ہوتے ہی دوبارہ اس کا آغاز ہوا تو ۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ء تک اس کی آخری سطریں سپردِ قرطاس کی جا چکی تھیں۔

اب اگلا مرحلہ اس کی اشاعت کا تھا۔ میں یہاں برطانیہ میں مقیم تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ آدھی کتاب یہاں میرے پاس مسودہ کی شکل میں موجود تھی اور آدھی "حیاتِ نو" کے مختلف شماروں میں بکھری پڑی تھی۔ "حیاتِ نو" کے متعلقہ پرچوں کو تلاش کرنے اور ان میں بکھرے ہوئے اجزا کو یکجا کر کے انھیں مرتب کرنے کا کام باقی تھا۔ اور یہ کام اس وقت مکمل ہوا جب میں نومبر ۱۹۹۰ء میں وطن واپس آیا۔

"صُوَرٌ مِن حَیَاۃِ الصَّحَابَۃ" کے اسی اردو ترجمے کو "زندگیاں صحابہؓ کی" کی شکل میں ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ خدائے تعالیٰ اس جذبے کو قبول فرمائے جس کے تحت اسے اردو میں منتقل کیا گیا ہے اور اس مقصد کو پورا کرے جس کے پیشِ نظر اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

مآخذ کی جو فہرست کتاب کے آخر میں بطورِ ضمیمہ شامل کی گئی ہے اس کو اس شکل میں مرتب کرنے کی ذمہ داری تنہا مجھ پر ہے۔ مصنفؒ کا انداز یہ ہے کہ انھوں نے ہر مضمون کے اختتام پر ان کتابوں کے نام دے دیئے ہیں جن سے انہوں نے اس مضمون کی ترتیب کے دوران استفادہ کیا تھا۔ اس طرح بہت سی کتابوں کے نام بار بار آئے ہیں۔ پھر انہوں نے مصنفین کے نام بھی نہیں لکھے۔ میں نے تکرار کو

حذف کر دیا اور تلاش وجستجو کے بعد ہر کتاب کے مصنف کی نشان دہی کر دی۔ اگر اس نشان دہی میں کوئی غلطی ہو اور کسی کتاب کا انتساب اس کے اصل مصنف کے بجائے کسی دوسرے کی طرف ہو گیا ہو تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ مصنفؒ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کتاب "زندگیاں صحابہؓ کی" کی اشاعت پر میرا دل خدائے کریم کے شکر کے جذبے سے لبریز ہے کہ اگر اس کی توفیق شامل حال نہ ہوتی تو یہ کام میرے بس کا نہ تھا۔ پھر میں اپنے مخلص دوست جناب ڈاکٹر محمود الحسن صاحب اور ڈاکٹر خالد پرویز صاحب کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں جن کی حوصلہ افزائی اور مسلسل اصرار نے اس کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ایک گزارش ارباب نظر قارئین سے۔ اگر اس کتاب کے مطالعے کے دوران آپ ترجمے کی کسی غلطی یا اس کے کسی سقم سے واقف ہو جائیں تو اس سے مجھے ضرور آگاہ فرمائیں۔ یہ آپ کی علمی امانت و دیانت کا تقاضا ہے۔

اور آخر میں میں اپنے رب کریم کے حضور اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر عبدالرحمٰن رأفت پاشا مرحوم کے پیچھے کھڑا ہاتھ پھیلائے اُن کی اِس دُعا پر آمین کہتا ہوں!

"خدایا! میں تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرامؓ کے ساتھ سچی اور گہری محبت رکھتا ہوں۔ یا ارحم الراحمین! تو خوب جانتا ہے کہ میں ان لوگوں سے صرف تیری رضا کے لیے محبت کرتا ہوں لہٰذا قیامت کے سخت گھبراہٹ والے دن مجھے ان میں سے کسی ایک کو عطا فرما دے۔" آمین

اقبال احمد قاسمی
یو۔کے اسلامک مشن
۴۴، مانچسٹر روڈ۔ اولڈھم۔ انگلینڈ۔

۱۰ مئی ۱۹۹۱ء یوم جمعہ

مَثَلُ أَصْحَابِي فِي أُمَّتِي كَالْمِلْحِ فِي الطَّعَامِ لَا يَصْلُحُ الطَّعَامُ إِلَّا بِالْمِلْحِ۔ (شرح السنۃ)

میری امت کے درمیان صحابہؓ کھانے میں نمک کے مانند ہیں۔ نمک کے بغیر کھانا طبیعت کے موافق ٹھیک (خوش ذائقہ) نہیں ہوتا۔

حضرت سعید بن عامر جمحی رضی اللہ عنہ

نوجوان سعید بن عامر جمحیؓ ان ہزاروں انسانوں میں سے ایک تھا جو سرداران قریش کی دعوت پر مکّہ سے باہر مقامِ تنعیم پر صحابی رسولؐ حضرت خُبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کے قتل کا تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے، جن کو کفار نے غدّاری سے گرفتار کیا تھا۔

وہ اپنی بھرپُور جوانی اور پُرجوش شباب کے بل پر مجمع کو ڈھکیلتا اور اس میں سے اپنے لیے راستہ بناتا ہوا ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن اُمیّہ جیسے رؤسارِ قریش کے پہلو بہ پہلو جا کھڑا ہوا جو اس مجمع میں نمایاں مقام پر کھڑے تھے۔ اِس طرح اُسے اِس بات کا موقع ملا کہ وہ قریش کے قیدی کو دیکھ سکے جو وہاں پابہ زنجیر لایا گیا تھا جس کو قریش کی عورتیں، بچّے اور جوان ڈھکیلتے ہوئے موت کے میدان کی طرف لا رہے تھے، تاکہ اُسے قتل کرکے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لے سکیں اور جنگِ بدر میں مارے جانے والے اپنے اعزّہ و اقارب کا بدلہ چکا سکیں۔

جب یہ زبردست ہجوم اپنے قیدی کو لیے ہوئے اس جگہ پر پہنچ گیا جو اس کے قتل کے لیے بنائی گئی تھی تو نوجوان سعید بن عامر ایک جگہ رُک کر ہجوم کے درمیان سے حضرت خبیبؓ کو دیکھنے لگا، اس نے دیکھا کہ خبیب کو تختۂ دار کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اُس نے عورتوں اور بچّوں کی چیخ پکار اور شور و غل کے درمیان سے اُبھرتی ہوئی خبیبؓ کی وہ باوقار اور پُرسکون آواز سُنی جو اُس کے پردۂ سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"اگر تم لوگ چاہو تو قتل سے پہلے مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کا موقع دیدو"
پھر سعید نے دیکھا کہ خبیبؓ بن عدی نے قبلہ رُو ہو کر دو رکعتیں پڑھیں۔
آہ! کیسی حسین اور کتنی مکمل تھیں وہ دو رکعتیں۔ پھر اُس نے دیکھا کہ خبیبؓ نے
زعماء قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
" واللہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے متعلق اس بدگمانی میں مبتلا ہو
جاؤ گے کہ میں موت سے ڈر کر نماز کو طول دے رہا ہوں تو میں اور لمبی اور
اطمینان کے ساتھ نماز پڑھتا۔"
پھر سعید نے بچشم سر اپنی قوم کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ زندہ ہی خبیبؓ کا
مثلہ کر رہے ہیں، ان کے اعضاء جسم کو یکے بعد دیگرے کاٹ رہے اور ساتھ
ہی ساتھ یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔ "کیا تم یہ بات پسند کرو گے کہ اس وقت
محمدؐ تمہاری جگہ یہاں ہوتے اور تم اس تکلیف سے نجات پا جاتے؟"
تو خبیبؓ نے جواب دیا (اور اس وقت ان کے جسم سے بے تحاشا خون
بہ رہا تھا) " واللہ مجھے تو اتنا بھی گوارا نہیں ہے کہ میں امن و اطمینان کے ساتھ
اپنے اہل و عیال میں رہوں اور ان کے پاؤں کے تلوے میں ایک کانٹا بھی
چبھ جائے۔"
اور یہ سنتے ہی لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو فضا میں بلند کرتے ہوئے چیخنا
شروع کر دیا۔
"مار ڈالو اسے، قتل کر دو اسے۔"
پھر سعید بن عامر کی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ خبیبؓ نے تختۂ دار
ہی سے اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔
اللھم احصھم عددا۔ واقتلھم بددا ولا تغادر منھم احدا۔

خُدایا! انھیں ایک ایک کر کے گن لے۔ انہیں منتشر کر کے ہلاک کر اور ان میں سے کسی کو نہ چھوڑ۔

پھر اُنہوں نے آخری سانس لی اور رُوح پاک اپنے رب کے حضور پہنچ گئی۔ اس وقت ان کے جسم پر تلواروں اور نیزوں کے اَن گنت زخم تھے۔

اِس کے بعد قریش مکّہ لوٹ آئے اور بڑے بڑے واقعات و حادثات کے ہجوم میں خبیبؓ اور اُن کے قتل کا واقعہ ان کے ذہنوں سے اوجھل ہوگیا لیکن نوجوان سعید بن عامر جمحی خبیبؓ کی مظلومیت اور ان کے دردناک قتل کے اس دل خراش منظر کو اپنے لَوحِ ذہن سے ایک لمحہ کے لیے محو نہ کر سکا، وہ سوتا تو خواب میں ان کو دیکھتا اور عالمِ بیداری میں اپنے خیالات میں ان کو موجود پاتا۔ یہ منظر ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا کہ خبیبؓ تختۂ دار کے سامنے بڑے سکون واطمینان کے ساتھ کھڑے دو رکعتیں ادا کر رہے ہیں۔ اور اس کے پردۂ سماعت سے ہر وقت ان کی وہ درد بھری آواز ٹکراتی رہتی۔ جب وہ قریش کے لیے بد دُعا کر رہے تھے، اور اس کو ہر وقت اس بات کا ڈر لگا رہتا کہ کہیں آسمان سے کوئی بجلی یا کوئی چٹان گر کر اسے ہلاک نہ کر دے۔

پھر خبیبؓ نے سعید کو وہ باتیں بتا دیں جو پہلے سے اس کے علم میں نہ تھیں۔ خبیبؓ نے اُسے بتایا کہ حقیقی زندگی یہی ہے کہ آدمی ہمیشہ سچّے عقیدے کے ساتھ چمٹا رہے اور زندگی کی آخری سانس تک خدا کی راہ میں جدّوجہد کرتا رہے۔ خبیبؓ نے سعید کو یہ بھی بتا دیا کہ ایمان راسخ کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے اور اس سے کتنے محیر العقول افعال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ خبیبؓ نے سعید کو ایک اور بڑی اہم حقیقت سے آگاہ کیا کہ وہ شخص جس کے ساتھی اس سے اس طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ واقعی برحق رسول اور سچا نبی ہے اور اُسے

آسمانی مدد حاصل ہے۔

اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے سعید بن عامر کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ وہ قریش کی ایک مجلس میں پہنچا اور وہاں کھڑے ہوکر اس نے قریش اور ان کے کالے کرتوتوں سے اپنی بے تعلقی و نفرت اور ان کے معبودانِ باطل سے اپنی بےزاری و برأت اور اپنے دخولِ اسلام کا برملا اور کھلم کھلا اعلان کر دیا۔

اس کے بعد حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے اور مستقل طور پر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لی۔ اور غزوۂ خیبر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں آپ کے ہم رکاب رہے، اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے جوار رحمت میں منتقل ہوگئے تو حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ آپ کے دونوں خلفاء حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں میں شمشیر برہنہ بن گئے۔ اور انھوں نے اپنی تمام جسمانی اور نفسانی خواہشات کو خدائے تعالیٰ کی مرضیات کے تابع کرکے اپنی زندگی کو اس مومن صادق کی زندگی کا نادر اور بے مثال نمونہ بنا کر پیش کیا جس نے دنیوی عیش و عشرت کے عوض آخرت کی ابدی و لافانی کامیابی و فائز المرامی کا سودا کر لیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں جانشین ان کی نصیحتوں کو بہت غور و توجہ سے سنتے اور ان کی باتوں پر پورا پورا دھیان دیتے تھے۔ ایک بار وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے ابتدائی ایام میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا،

"عمرؓ! میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ رعایا کے بارے میں ہمیشہ خدائے تعالیٰ سے ڈرتے رہیے اور خدا کے معاملے میں لوگوں کا کوئی خوف نہ کیجیے۔

اور آپ کے اندر قول و عمل کا تضاد نہ پایا جائے، بہترین قول وہی ہے جس کی تصدیق عمل سے ہوتی ہو۔"

انھوں نے سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

"عمر! دُور و نزدیک کے ان تمام مسلمانوں پر ہمیشہ اپنی توجہ مرکوز رکھیے جن کی ذمّہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے، اور ان کے لیے وہی باتیں پسند کیجیے جو آپ خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے پسند کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں بڑے سے بڑے خطرے کی بھی پرواہ نہ کیجیے اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کو خاطر میں نہ لائیے۔"

"سعید! یہ سب کس کے بس کی بات ہے؟" حضرت عمرؓ نے ان کی یہ باتیں سُن کر کہا۔

"یہ آپ جیسے شخص کے بس کی بات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اُمّت محمدؐ کا ذمہ دار بنایا ہے، جس کے اور خدا کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہے۔" حضرت سعیدؓ نے کہا۔

اِس گفتگو کے بعد خلیفہؓ نے حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ سے حکومت کی ذمّہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں تعاون کی خواہش ظاہر کی اور فرمایا۔

"سعید! میں تم کو حمص کا گورنر بنا رہا ہوں۔"

"عمرؓ! میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے آزمائش میں نہ ڈالیے۔" حضرت سعیدؓ نے جواباً عرض کیا۔

ان کا یہ جواب سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"خُدا تمہارا بھلا کرے، تم لوگ حکومت کی بھاری ذمہ داریاں میرے

سر ڈال کر خود اس سے کنارہ کش ہو جانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں تم کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔"

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حمص کی گورنری ان کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں تمہارے لیے تنخواہ نہ مقرر کر دوں؟"

"امیرالمومنین! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ بیت المال سے جو وظیفہ مجھے ملتا ہے، وہ میری ضروریات سے فاضل ہے۔" حضرت سعیدؓ نے کہا۔ اور وہ حمص کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اہل حمص کے کچھ قابل اعتماد لوگوں پر مشتمل ایک وفد حضرت عمرؓ کی خدمت میں باریاب ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا کہ مجھے اپنے یہاں کے فقراء اور حاجتمندوں کے نام لکھ کر دے دو تاکہ میں ان کی ضروریات کی تکمیل کا کوئی بندوبست کر دوں۔ تعمیل حکم میں انھوں نے خلیفہ کے سامنے جو فہرست پیش کی اس میں تھا۔ فلاں ابن فلاں اور فلاں ابن فلاں اور سعید بن عامر۔

"سعید بن عامر؟ کون سعید بن عامر؟ حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارے گورنر" ارکانِ وفد نے جواب دیا۔

"تمہارا گورنر؟ کیا تمہارا گورنر فقیر ہے؟ حضرت عمرؓ نے مزید حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں امیرالمومنین! خدا کی قسم کتنے ہی دن ایسے گزر جاتے ہیں کہ ان کے گھر میں آگ نہیں جلتی۔" وفد نے مزید وضاحت کی۔

یہ سُن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ وہ دیر تک روتے رہے حتیٰ

کہ ان کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی، پھر وہ اُٹھے اور ایک ہزار دینار ایک تھیلی میں رکھ کر لے ارکان وفد کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔

"سعید سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ امیر المومنین نے یہ مال آپ کے لیے بھیجا ہے تاکہ آپ اس سے اپنی ضرورتیں پوری کریں۔"

وفد کے لوگ دیناروں کی وہ تھیلی لے کر حضرت سعیدؓ کی خدمت میں پہنچے اور اسے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے اس تھیلی اور اس میں رکھے ہوئے دیناروں کو اپنے سے دُور ہٹاتے ہوئے کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جیسے ان کے اُوپر کوئی بڑی مصیبت نازل ہوگئی ہو۔ آواز سُن کر ان کی بیوی گھبرائی ہوئی ان کے پاس آئیں اور بولیں۔

"سعید کیا بات ہے؟ کیا امیر المومنینؓ کا انتقال ہوگیا؟"

"نہیں۔ اس سے بھی بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔" حضرت سعیدؓ نے کہا۔

"کیا کسی جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوگئی ہے؟" اہلیہ نے سوال کیا۔

"نہیں اس سے بھی بڑی افتاد آپڑی ہے۔" حضرت سعید نے جواب دیا۔

"اس سے بڑی افتاد کیا ہوسکتی ہے؟" بیوی نے پھر پوچھا۔

"دنیا میرے گھر میں داخل ہوگئی ہے۔ تاکہ میری آخرت کو تباہ کر دے۔" حضرت سعیدؓ نے تشویشناک لہجے میں جواب دیا۔

"اس سے چھٹکارا حاصل کرلو۔" بیوی نے ہمدردانہ مشورہ دیا (ابھی تک وہ دیناروں کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھیں)۔

"کیا تم اس معاملے میں میری مدد کر سکتی ہو؟" حضرت سعیدؓ نے پوچھا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔" بیوی نے جواب دیا۔

پھر حضرت سعیدؓ نے تمام دیناروں کو بہت سی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں

میں رکھ کر انھیں غریب اور حاجتمند مسلمانوں میں تقسیم کروا دیا۔

اس بات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کے دورے پر وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اس دورے میں جب آپ حمص پہنچے، (اس زمانے میں حمص کو کُویفہ بھی کہا جاتا تھا اس لیے کہ وہاں کے باشندے بھی اہل کوفہ کی طرح اپنے عمّال اور حکّام کی بہ کثرت شکایتیں کرنے میں مشہور تھے) تو جب اہل حمص خلیفہ سے سلام و ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خلیفہ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے اس نئے امیر کو کیسا پایا؟ جواب میں انھوں نے امیرالمومنین کے سامنے حضرت سعید بن عامرؓ کی چار شکایتیں پیش کیں جن میں سے ہر ایک شکایت دوسری سے بڑی تھی، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ

"میں نے ان کو اور سعیدؓ کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ سعیدؓ کے متعلق میرے حسنِ ظن کو صدمہ نہ پہنچائے، کیونکہ میں ان کے متعلق بہت زیادہ خوش گمان تھا، جب شکایت کرنے والے اور ان کے امیر سعیدؓ بن عامر میرے پاس یکجا ہو گئے تو میں نے دریافت کیا کہ تم کو اپنے امیر سے کیا شکایت ہے؟

"جب تک خوب دن نہیں چڑھ آتا یہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتے۔"

معترضین نے کہا۔ میں نے سعید سے دریافت کیا کہ سعیدؓ! تم اس شکایت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ سعیدؓ تھوڑی دیر خاموش رہے پھر بولے خدا کی قسم میں اس بات کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کو ظاہر کیے بغیر چارہ نہیں ہے، بات یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی خادمہ نہیں ہے اس لیے ذرا سویرے اٹھتا ہوں تو پہلے آٹا گوندھتا ہوں پھر تھوڑی دیر انتظار کرتا ہوں تاکہ اس کا

خمیر اُٹھ جائے، پھر روٹیاں پکاتا ہوں اس کے بعد وضو کرکے لوگوں کی ضرورت کے لیے باہر نکلتا ہوں۔ میں نے اہلِ حمص سے پوچھا کہ تمہاری دوسری شکایت کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ، "یہ رات کے وقت کسی کا جواب نہیں دیتے۔"

میں نے پوچھا کہ "سعید اس شکایت کے متعلق تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" تو انھوں نے جواب دیا کہ "خدا کی قسم میں اس بات کو کبھی ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا تھا، میں نے دن کے اوقات ان لوگوں کے لیے اور رات کے اوقات اپنے رب کے لیے مخصوص کر رکھے ہیں۔"

میں نے معترضین سے کہا "اب تم اپنی تیسری شکایت بیان کرو۔" انھوں نے کہا کہ یہ مہینے میں ایک بار دن بھر گھر سے باہر نہیں نکلتے۔"

میں نے دریافت کیا کہ سعید تم اس شکایت کا کیا جواب دیتے ہو؟ سعیدؓ نے کہا کہ "امیرالمومنین میرے پاس کوئی خادم نہیں ہے، اور جسم کے ان کپڑوں کے سوا میرے پاس اور کوئی کپڑا نہیں ہے، میں ان کو مہینے میں صرف ایک بار دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے کا انتظار کرتا ہوں، اور سوکھنے کے بعد دن کے آخری حصے میں انھیں پہن کر باہر آتا ہوں۔"

میں نے معترضین سے کہا کہ اب تم اپنی آخری شکایت بیان کرو۔" انھوں نے کہا کہ "ان کو رہ رہ کر غشی کے شدید دورے پڑتے ہیں اور یہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔"

میں نے کہا، "سعیدؓ! تمھارے پاس اس شکایت کا کیا جواب ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ میں خبیبؓ بن عدی کے قتل کے وقت موقع پر موجود تھا اور اس وقت میں مشرک تھا۔ میں نے قریش کو دیکھا کہ وہ ان کے جسم کا ایک ایک عضو کاٹتے جاتے اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے کہ کیا تم یہ پسند

کرتے ہو کہ آج تمہاری جگہ پر محمدؐ ہوتے اور تم اس تکلیف سے نجات پا جاتے؟
تو وہ جواب دیتے کہ خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ میں اطمینان وسکون
کے ساتھ اپنے اہل وعیال میں رہوں اور محمدؐ کے تلوؤں میں ایک پھانس بھی
لگ جاتے۔" خدا کی قسم جب مجھ کو وہ منظر یاد آتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی
یاد آتا ہے کہ میں نے اس وقت ان کی مدد کیوں نہ کی تو مجھے اس بات کا
شدید خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس کوتاہی کو ہرگز معاف نہیں
کرے گا۔ اور اسی وقت میرے اوپر غشی طاری ہو جاتی ہے۔" یہ سن کر میں
نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے سعیدؓ کے متعلق میرے حسن ظن کو صدمہ
نہیں پہنچنے دیا۔"

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے ایک ہزار دینار بھیجے
تاکہ ان سے وہ اپنی ضروریات پوری کریں۔ جب ان کی اہلیہ نے ان دیناروں
کو دیکھا تو بولیں کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو آپ کی خدمات سے
بے نیاز کر دیا۔ اب آپ اس رقم سے ہمارے لیے ایک غلام اور ایک خادمہ
خرید دیجیے۔ یہ سن کر حضرت سعیدؓ نے کہا:

"کیا تم کو اس سے بہتر چیز کی خواہش نہیں ہے؟"

"اس سے بہتر؟ اس سے بہتر کیا چیز ہے؟" اہلیہ نے پوچھا۔

"یہ رقم ہم اس کے پاس جمع کر دیں جو اسے ہم کو اس وقت واپس
کر دے جب ہم اس کے زیادہ ضرورت مند ہوں۔" حضرت سعیدؓ نے
بات سمجھائی۔

"اس کی کیا صورت ہوگی؟" اہلیہ نے وضاحت چاہی۔

حضرت سعیدؓ نے کہا کہ "ہم یہ رقم اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دیدیں۔"

اہلیہ نے کہا، "ہاں یہ بہتر ہے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

پھر حضرت سعیدؓ نے اس مجلس سے اُٹھنے سے پہلے ان تمام دیناروں کو کو بہت سی تھیلیوں میں رکھ کر اپنے گھر کے ایک آدمی سے کہا کہ "انھیں فلاں قبیلے کی بیواؤں، فلاں قبیلے کے یتیموں، فلاں قبیلے کے مسکینوں اور فلاں قبیلے کے حاجتمندوں میں تقسیم کردو۔"

اللہ تعالیٰ حضرت سعیدؓ بن عامر جمحی سے راضی ہو۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خود محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت طُفیل بن عَمرو دَوسی رضی اللہ عنہٗ

حضرت طفیل ابن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ دوس کے سردار، عرب کے قابل ذکر اشراف اور معدودے چند اصحاب مروت میں سے تھے۔ وہ بڑے مہمان نواز اور صاحب جود و سخا آدمی تھے۔ مہمانوں کی بکثرت آمد کی وجہ سے ان کے یہاں کھانے کی دیگیں ہمیشہ چولھوں پر چڑھی رہتیں اور ان کے دروازے آنے والے مہمانوں کے استقبال کے لیے ہر وقت کھلے رہتے، وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے، خوف زدہ لوگوں کو امان دیتے اور پناہ طلب کرنے والوں کو اپنی پناہ میں لیتے۔ ان ساری خوبیوں کے علاوہ وہ نہایت باشعور اور زبردست ادیب، بڑے نازک خیال اور حساس شاعر اور کلام و بیان کے حسن و قبح اور صحت و سقم کی تمیز میں غیر معمولی درک رکھنے والے نقاد تھے۔

حضرت طفیل رضؓ بن عمرو اپنے قبیلہ کے علاقہ تہامہ کو چھوڑ کر مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کفار قریش کے درمیان حق و باطل کی زبردست کشمکش برپا تھی۔ اور فریقین میں سے ہر ایک اپنے اور اپنی جماعت کے لیے اعوان و انصار فراہم کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کے ہتھیار سے کام لے کر لوگوں کو بندگیٔ رب کی دعوت دے رہے تھے اور کفار قریش ہر قسم کے حربے استعمال کر کے اس دعوت کی مخالفت و مزاحمت میں جٹے ہوئے تھے اور لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے ایڑی سے چوٹی تک زور لگا رہے تھے۔

مکہ پہنچ کر حضرت طفیلؓ نے محسوس کیا کہ وہ کسی تیاری کے بغیر اس معرکہ میں شامل اور بلا قصد و ارادہ اس کی موجوں میں داخل ہوتے جارہے ہیں۔ نہ تو وہ اس مقصد سے مکہ آئے تھے نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے مابین برپا اس کشمکش کا انھیں وہم و گمان ہی گزرا تھا، اس وجہ سے اس کشمکش سے وابستہ ان کی ناقابل فراموش اور عجیب و غریب داستان سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ حضرت طفیل بن عمروؓ اس داستان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں جب میں مکہ پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی سرداران قریش میری طرف لپکے اور انھوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا استقبال کیا اور مجھے بڑی عزت و تکریم سے نوازا۔ پھر ان کے بڑے بڑے سردار اور سربرآوردہ لوگ میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ سے کہنے لگے "طفیل! تم ہمارے شہر میں آئے ہو۔ اور یہ شخص جو اپنے آپ کو نبی کہتا ہے، اس نے ہمارا سارا معاملہ خراب کر کے رکھ دیا ہے، اس نے ہماری جمعیت کو منتشر اور ہماری جماعت کو پراگندہ کر دیا ہے۔ ہم لوگوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں تم کو اور تمہاری قیادت و سرداری کو بھی وہی خطرہ نہ لاحق ہو جائے جس سے ہم لوگ دو چار ہیں۔ اس لیے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم نہ تو اس شخص سے کوئی بات کرنا نہ اس سے کوئی بات سننا کیونکہ اس کی باتیں بڑی جادو اثر ہیں، اس کی زبان میں بلا کی تاثیر ہے۔ یہ شخص اپنی ان باتوں کے ذریعہ باپ بیٹے، بھائی بھائی اور شوہر بیوی میں تفریق کر دیتا ہے۔"

حضرت طفیلؓ اپنی کہانی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

"خدا کی قسم وہ لوگ مسلسل اس شخص کی عجیب و غریب باتیں مجھے سناتے رہے اور اس کے حیرت انگیز کارناموں سے میری اپنی ذات اور میری قوم کے

متعلق مجھ کو خوفزدہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے اس بات کا عزم مصمم کرلیا کہ میں نہ اس شخص سے ملوں گا نہ اس سے کلام کروں گا نہ اس کی کوئی بات سنوں گا اور جب میں خانۂ کعبہ کے طواف اور اس میں رکھے ہوئے ان بتوں سے برکت حاصل کرنے کے لیے مسجد حرام میں گیا جن کی ہم تعظیم و توقیر کرتے تھے تو اس خوف سے کہ کہیں محمدؐ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے، میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی۔ مسجد میں داخل ہوا تو میں نے محمدؐ کو کعبے کے پاس کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں مشغول پایا۔ ان کا طریقۂ عبادت ہمارے طریقۂ عبادت سے مختلف تھا۔ وہ منظر مجھے بہت اچھا لگا اور ان کے عبادت کے اس طریقے کو دیکھ کر میں فرطِ مسرت سے جھوم اٹھا اور غیر ارادی طور پر بتدریج ان سے قریب ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ان کے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور خدا کو یہی منظور تھا کہ ان کی زبان سے نکلنے والے کچھ الفاظ میرے کانوں تک پہنچیں۔ چنانچہ میں نے ان سے ایک بہترین کلام سنا اور اپنے دل میں کہا۔ طفیل! تمہاری ماں تمہارے سوگ میں بیٹھے۔ تم ایک سمجھدار اور صاحب بصیرت شاعر ہو، کلام کا حسن و قبح تم پر مخفی نہیں ہے۔ آخر اس شخص کی باتیں سننے میں کیا چیز تمہارے آڑے آرہی ہے۔ اگر اس کی باتیں اچھی ہوں گی تو قبول کرلینا اور اگر بری ہوں گی تو انہیں چھوڑ دینا۔"

حضرت طفیلؓ کہانی کی اگلی کڑی اس سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں۔

"یہ سوچ کر میں وہیں رک گیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر کی طرف لوٹے تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اور جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو میں بھی ان کے پیچھے اندر چلا گیا اور ان سے کہا کہ "اے محمدؐ آپ کی قوم کے لوگوں نے مجھ کو آپ سے دور رکھنے کے لیے

آپ کے متعلق مجھ سے بہت سی ایسی باتیں کہی ہیں۔ وہ مسلسل مجھ کو آپؐ کے دین سے ڈراتے رہے حتیٰ کہ میں نے آپؐ کی باتیں نہ سننے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے کان روئی سے بند کر لیے تاکہ کہیں آپؐ کی کوئی بات میرے کانوں میں نہ پڑ جائے۔ لیکن یہ اللہ کی مرضی تھی کہ اس نے مجھے آپؐ کی باتیں سنائیں اور وہ مجھے بہت پسند آئیں۔ آپؐ اپنا دین مجھے بتائیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت میرے سامنے پیش کی اور مجھے دو سورتیں، سورۂ اخلاص اور سورۂ فلق پڑھ کر سنائیں۔ خدا کی قسم اس سے پہلے میں نے اس کلام سے بہتر کوئی کلام نہیں سنا تھا نہ ان کی باتوں سے بہتر کوئی بات دیکھی تھی۔ میں نے اسی وقت اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا۔"

حضرت طفیلؓ اب داستان کے اس موڑ سے آگے بڑھتے ہیں۔

"پھر میں بہت دنوں تک مکے میں ٹھیرا رہا۔ اس مدت میں میں نے اسلام کی تعلیمات کو حاصل کیا اور جتنا ممکن ہوا قرآن حفظ کیا۔ پھر جب میں نے اپنے قبیلے کی طرف لوٹنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ میں اپنی قوم کا سردار ہوں۔ وہاں میری باتیں مانی جاتی ہیں، اب میں واپس جا کر انہیں اسلام کی دعوت دینا چاہتا ہوں۔ آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے کوئی ایسی نشانی عطا فرما دے۔ جو میری دعوت کے لیے ممد و معاون ثابت ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی "اللھم اجعل لہ آیۃ" "خدایا طفیل کو کوئی نشانی مرحمت فرما دے۔" اس کے بعد میں اپنے قبیلے کی طرف چل پڑا، یہاں تک کہ جب میں ان کی بستی کے قریب ایک اونچی جگہ پہنچا تو میری دونوں آنکھوں کے درمیان چراغ جیسی ایک روشنی پیدا ہو گئی۔ یہ

دیکھ کر میں نے دُعا کی کہ خُدایا! اس کو چہرے کے علاوہ کسی دُوسری جگہ منتقل کر دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ یہ کوئی سزا ہے جو مجھے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑنے کے جُرم میں ملی ہے۔ تب وہ روشنی وہاں سے منتقل ہو کر میری لاٹھی کے سرے پر آگئی، اور جب میں پہاڑ کی بلندی سے نیچے اُتر رہا تھا تو میری لاٹھی کے سرے پر چمکتی ہوئی وہ روشنی لوگوں کو ایک معلق قندیل کی طرح نظر آ رہی تھی۔ جب نیچے اُتر کر اپنے قبیلے میں پہنچا تو میرے والد صاحب جو بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ میرے پاس آئے میں نے ان سے کہا کہ "ابا! مجھ سے پرے ہٹیے، اب آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا نہ میں آپ کا ہوں نہ آپ میرے۔"

"بیٹے! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" والد صاحب نے کہا۔

"میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میں نے محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بیٹے! تم نے جو دین اختیار کیا ہے میں بھی اس کو اپناتا ہوں۔" انھوں نے فرمایا۔

"تب آپ جا کر پہلے غسل کر لیجیے اور اپنے کپڑے پاک کر کے تشریف لائیے تاکہ میں آپ کو وہ دین سکھا دوں جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔" میں نے عرض کیا۔

پھر وہ اُٹھے، جا کر غسل کیا اور اپنے کپڑے پاک کر کے میرے پاس آئے۔ میں نے اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی اور انھوں نے بخوشی اسے قبول کر لیا۔

پھر میری بیوی میرے پاس آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ "مجھ سے

دور رہو۔ اب میرا اور تمھارا کوئی تعلق نہیں۔"

"میرے والدین آپ پر فدا ہوں، یہ کیوں؟" اس نے بڑی حیرت سے پوچھا
میں نے کہا کہ اسلام نے میرے اور تمہارے درمیان جدائی کی وسیع خلیج
حائل کردی ہے۔ میں نے اسلام قبول کرکے دین محمدؐ کی پیروی اختیار کرلی ہے۔"

اس نے کہا کہ" جو دین آپ کا ہے وہی دین میرا بھی ہے۔"
میں نے اس سے کہا کہ" جاؤ، جاکر ذوشریٰ کے چشمے میں غسل کرکے
پاک ہولو۔" (ذوشریٰ قبیلہ دوس کے بت کا نام تھا جس کے پاس وہ چشمہ
تھا جو پہاڑ کی بلندی سے گرتا تھا) اس نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر
قربان ہوں۔ کیا آپ کو ذوشریٰ کی طرف سے بچوں کو کسی نقصان کا اندیشہ ہے کہ
مجھے اس چشمے میں غسل کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں؟" میں نے کہا کہ تباہی ہو
تمہارے اور ذوشریٰ کے لیے، میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کی نظروں سے
دور جاکر وہاں غسل کرلو، میں تم کو اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ حقیر و
بے جان پتھر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اس کے بعد وہ گئی، غسل کیا اور پھر میرے پاس آئی تو میں نے اس کے
سامنے اسلام کی دعوت پیش کی جس کو اس نے بلا چون وچرا قبول کرلیا۔ پھر
میں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی، مگر ابوہریرہؓ کے سوا
سب نے اس کو قبول کرنے میں دیر کی۔" حضرت طفیل اس دلچسپ کہانی کو نئے
موڑ پر لاتے ہیں۔

"پھر میں ابوہریرہؓ کو ساتھ لے کر مکہ آیا۔ جب بارگاہ رسالت میں حاضر
ہوا تو آپؐ نے دریافت فرمایا۔

"طفیل تمہارے پیچھے تمہارے قبیلے کا کیا حال ہے؟" میں نے عرض،

کیا کہ "ان کے دلوں پر دبیز پردے پڑے ہوتے ہیں جو حق کے دیدار میں مانع ہیں۔ وہ لوگ کفر شدید میں مبتلا ہیں ان کے اوپر سرکشی اور نافرمانی کی کیفیت مسلّط ہے۔" یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کھڑے ہوتے۔ پھر آپؐ نے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے اندیشہ لاحق ہوا کہ آپؐ میرے قبیلے والوں کے حق میں بددُعا فرمائیں گے اور وہ تباہ و برباد ہوجائیں گے ـــــ تو بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "آہ میری قوم" لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بددُعا کرنے کے بجائے کہہ رہے تھے:

اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا...... اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا...... اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا۔

خدایا قبیلۂ دَوس کو ہدایت دے...... خدایا...... خدایا......

پھر آپؐ نے طفیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوتے فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں جاؤ، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آؤ اور ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرو۔

پھر میں مستقل طور پر قبیلۂ دوس کے علاقے میں رہ کر انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا رہا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور یکے بعد دیگرے بدر، اُحد اور خندق کے معرکے گزر گئے۔ اور جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت میرے ساتھ قبیلہ دوس کے اسّی گھرانے تھے جو اسلام قبول کرکے اس کی تعلیمات سے آراستہ ہوچکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے ہم لوگوں کو بھی حصّہ عنایت فرمایا۔ ہم نے عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول، آپؐ ہم لوگوں کو ہر غزوہ میں اپنے لشکر کے میمنہ پر مقرر فرمایئے اور ہمارا شعار "مبرور" مقرر فرمادیجیے۔"

حضرت طفیلؓ اپنی داستان کے آخری حصّے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔
اس کے بعد میں برابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہا یہاں تک کہ اللہ تعالی نے آپؐ کو مکّے پر فتح عنایت فرمائی۔ فتح مکہ کے بعد میں نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ مجھے عمرو ابن حممہ کے بُت ذوالکفین کو جلانے کی مہم پر بھیج دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس کی اجازت دیدی۔ میں اپنے قبیلے کا ایک دستہ لے کر روانہ ہوا، جب اس کے پاس پہنچ کر اسے نذر آتش کرنا چاہا تو بہت سے مرد عورتیں اور بچّے میرے گرد جمع ہو گئے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ اگر میں نے ذوالکفین کو کوئی نقصان پہنچایا تو آسمان سے بجلی گر کر مجھے ہلاک کر دے گی، لیکن میں اس کے پرستاروں کے سامنے ہی اس کی طرف بڑھا اور یہ کہتے ہوئے اس کو نذر آتش کر دیا۔

یا ذَاالکفینِ لَستُ مِنْ عُبّادِکا	ذوالکفین میں تیرے پرستاروں میں سے
مِیلادُنَا اَقْدَمُ مِن مِیلَادِکا	نہیں ہوں ہماری پیدائش تیری پیدائش
اِنّی حَشَوتُ النّارَ فِی فُوَادِکا	سے مقدم ہے میں نے تیرے دل میں آگ بھر دی ہے۔

اور اس بت کے آگ میں بھسم ہو جانے کے ساتھ ہی قبیلہ دوس میں شرک کے باقی ماندہ آثار بھی جل کر خاکستر ہو گئے۔ اور پورا قبیلہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔"
حضرت عمرو بن طفیل رضی اللہ عنہ اس کے بعد ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے یہاں تک کہ آپؐ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ اور جب آپؐ کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے تو حضرت طفیلؓ بن عمرو نے اپنے آپ کو، اپنی تلوار کو اور اپنے لڑکے کو خلیفہ کی اطاعت کے لیے وقف کر دیا اور جب مرتدین اور مدعیان نبوت کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے لیے جانے والی فوج کے ہراول میں شامل ہو گئے۔ یمامہ جاتے ہوئے راستے میں انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے اپنے رفقاء سفر سے کہا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے تم اس کی تعبیر بیان کرو۔ ساتھیوں نے خواب کی تفصیل دریافت کی۔ انھوں نے کہا کہ "میں نے دیکھا کہ میرا سر مونڈ دیا گیا ہے، میرے منہ سے ایک پرندہ نکلا، ایک عورت نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کر لیا اور یہ کہ میرا بیٹا عمرو بڑی تیزی سے میرے پیچھے آرہا ہے مگر میرے اور اس کے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کر دی گئی اور وہ میرے ساتھ اس میں داخل ہونے سے رہ گیا"

ساتھیوں نے کہا "آپ کا یہ خواب بہت اچھا ہے" حضرت طفیلؓ نے کہا کہ میں نے اپنے طور پر اس خواب کی یہ تعبیر کی ہے۔

"سر مونڈے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کاٹا جائے گا، اور پرندہ جو منہ کے راستے سے نکلا تو اس سے مراد میری روح ہے، اور عورت جس نے مجھے اپنے پیٹ میں داخل کیا، اس سے مراد میری قبر ہے جس میں میں دفن کیا جاؤں گا، اُمید ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہو گی، اور میرے بیٹے کے میرا پیچھا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ بھی شہادت کی طلب میں میرا ساتھ دے گا مگر وہ اسے کچھ دنوں کے بعد حاصل کر سکے گا۔"

معرکۂ یمامہ میں صحابی جلیل حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے زبردست داد شجاعت دی یہاں تک کہ وہ زخمی ہو کر گر گئے، اور زخموں کی تاب نہ لا کر نعمت شہادت سے بہرہ ور ہوتے مگر ان کے صاحبزادے عمرو ابن طفیل برابر جنگ میں مصروف رہے یہاں تک کہ زخموں سے نڈھال ہو گئے اور

ان کا دایاں ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ اور وہ اپنے والد اور اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو یمامہ کی سرزمین پر چھوڑ کر مدینہ واپس آگئے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک بار حضرت عمروؓ بن طفیل ان کی خدمت میں باریاب ہوئے اسی وقت حضرت عمرؓ کے لیے کھانا لایا گیا۔ مجلس میں کچھ اور لوگ بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے سب کو کھانے کے لیے بلایا مگر حضرت عمروؓ بن طفیل کھانے میں شریک نہیں ہوئے، وہ کنارے ہٹ گئے تھے، حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم کھانے میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ شاید تم اپنے کٹے ہوئے ہاتھ پر ندامت محسوس کر رہے ہو اور کھانے میں شریک ہونے سے جھجکتے ہو۔ انھوں نے کہا، جی ہاں امیرالمومنین! یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "خدا کی قسم جب تک تم اپنا کٹا ہوا ہاتھ اس کھانے میں نہیں ڈالوگے میں اس کو چکھ نہیں سکتا۔ خدا کی قسم اہل مجلس میں تمھارے سوا کوئی نہیں ہے جس کا کوئی عضو جنت میں داخل ہو۔"

حضرت عمرو بن طفیلؓ جب سے اپنے والد محترم سے جُدا ہوئے تھے، برابر اس خواب کی عملی تعبیر کی جستجو میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ جب جنگِ یرموک کا موقع آیا تو اس میں بڑے شوق سے شریک ہوئے۔ اور بڑی بے جگری سے لڑے یہاں تک کہ اس دولت شہادت سے سرفراز ہو گئے جس کی تمنا ان کے والد نے ان کے دل میں پیدا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے۔ وہ شہید ہیں اور شہید کے باپ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن حُذافہ سہمی رضی اللہ عنہٗ

ہماری اس کہانی کا ہیرو اصحاب رسولؐ میں سے وہ شخص ہے جس کا نام عبداللہ بن حُذافہ سہمی ہے۔ ممکن تھا کہ تاریخ اس شخص کی طرف بھی کوئی توجہ نہ کرتی اور اس کا کوئی خیال دل میں لائے بغیر اسی طرح گزر جاتی جس طرح اس سے پہلے کے لاکھوں عربوں کو نظرانداز کرتی ہوئی گزر گئی ہے لیکن اسلام نے عبداللہ بن حُذافہ سہمی کے لیے ان کے دو ہم عصر اور اپنے وقت کے عظیم بادشاہوں ۔ شہنشاہ ایران کسریٰ اور شہنشاہ روم قیصر سے ملاقات کا موقع فراہم کردیا تھا اور ان دونوں سے ان کی ملاقات کے ساتھ ایک ایسی داستان وابستہ ہوگئی جو ہمیشہ کے لیے زمانے کی یادداشت میں محفوظ ہوچکی ہے اور جس کو تاریخ کی زبان برابر دہراتی رہے گی ۔

شہنشاہ ایران کسریٰ کے ساتھ ان کی ملاقات کا قصہ ۶ھ سے تعلق رکھتا ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کچھ صحابہ کے ذریعہ شاہان عجم کے پاس دعوتی خطوط ارسال فرمانے اور ان خطوط کے ذریعہ انھیں اسلام کی دعوت دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مہم کے دوران پیش آنے والے خطرات کا پورا پورا اندازہ تھا۔ کیوں کہ ان قاصدوں کو ایسے دُور دراز علاقوں میں جانا تھا جن سے اس سے پہلے ان کو کوئی سابقہ نہیں پیش آیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ وہ ان علاقوں کی زبانوں سے نابلد اور ان حکمرانوں کے مزاج سے بالکل ناواقف تھے، پھر اس پہ طرہ یہ کہ انھیں ان کو اپنے سابقہ ادیان کو

ترک کرنے ، اپنے اقتدار و حکومت کے منصب سے الگ ہو جانے اور ایک ایسی قوم کے دین میں داخل ہونے کی دعوت دینی تھی جو ماضی قریب میں ان کے ماتحت رہ چکی تھی ۔ یقیناً یہ ایک نہایت پُرخطر سفر تھا جس پر روانہ ہونا موت کے مُنہ میں جانے اور اس سے زندہ و سلامت واپس آنا نیا جنم پانے کے مترادف تھا ۔ اس مہم کے متوقع خطرات کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو مشورہ کے لیے جمع کیا اور ان کے سامنے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے ۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا ۔ " میں تم سے کچھ لوگوں کو شاہانِ عجم کے یہاں سفارت پر بھیجنا چاہتا ہوں ۔ تم لوگ اس میں مجھ سے اختلاف نہ کرنا جیسا کہ بنی اسرائیل نے عیسیٰ علیہ السلام سے اختلاف کیا تھا ۔"

جواب میں صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ۔

" اللہ کے رسولؐ ! آپؐ ہم کو جہاں چاہیں بھیج دیں ۔ ہم آپؐ کا ہر پیغام خوشی خوشی پہنچانے کے لیے تیار ہیں ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوک عرب اور شاہانِ عجم کے پاس اپنے خطوط پہنچانے کے لیے چھ صحابہ کو طلب فرمایا ۔ اِن میں سے ایک حضرت عبداللہ ابن حذافہ سہمیؓ بھی تھے ۔ انھیں شہنشاہ ایران کسریٰ کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا ۔

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے اپنی اونٹنی کو سواری کے لیے تیار کیا ۔ بیوی بچوں سے رخصت ہوئے اور تنِ تنہا اپنی منزلِ مقصود کا رخ کیا ، وہ راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتے اور مصائبِ سفر کو برداشت کرتے ہوئے ایران پہنچے تو درباریوں سے کسریٰ کے ساتھ ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ۔

اوران کو اس خط سے بھی آگاہ کر دیا جسے وہ بادشاہ کے لیے لے کر آئے تھے، کسریٰ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے دربار کی تزئین و آرائش کا حکم دیا اور اپنے تمام بڑے بڑے افسروں کو دربار میں حاضری کی ہدایت کی۔ ساری تیاریاں مکمل ہوگئیں تو اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کو دربار میں طلب کیا، اس وقت ان کے جسم پر ہلکا سا کمبل اور معمولی سی عبا تھی اور ان کے حلیے سے بدوی عربوں کی سادگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن ان کا سر بہت بڑا اور قد کافی لمبا تھا اور ان کے سینے میں عظمت اسلام اور دل میں عزتِ اسلام کی آتش جوالہ شعلہ زن تھی۔ کسریٰ نے ان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو ایک درباری کو اشارہ کیا کہ وہ خط ان کے ہاتھ سے لے لے۔ مگر حضرت عبداللہؓ نے کہا کہ نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ میں یہ خط اپنے ہاتھ سے آپ کے حوالہ کروں اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ کسریٰ نے درباریوں سے کہا کہ چھوڑ دو، اس کو میرے پاس آنے دو۔ حضرت عبداللہؓ نے کسریٰ کے قریب جا کر خط اس کے سپرد کر دیا۔ اور اس نے اپنے عرب سکریٹری کو بلایا (جو حیرہ کا باشندہ تھا) اور اسے اپنے سامنے خط کھولنے اور اس کو پڑھنے کا حکم دیا۔ اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ....	خدائے رحمان و رحیم کے نام سے۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے شاہِ ایران کسریٰ کو۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے.......

خط کا اتنا حصہ سنتے ہی اس کے سینے میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی،

اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہوگیا اور گردن کی رگیں تن گئیں۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط کا آغاز اپنے نام سے کیا تھا۔ اس نے سکرٹیری کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا۔ اور اس کے مندرجات کو جانے بغیر اسے پُرزہ پرزہ کرتے ہوئے چیخ اُٹھا " میرا غلام، اور مجھے اس طرح خط لکھ رہا ہے؟" پھر اس نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ کو دربار سے نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکال دیے گئے۔ حضرت عبداللہؓ دربار سے نکلے تو انھیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اب اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ یا وہ قتل کردیے جائیں گے یا انھیں آزاد چھوڑ دیا جائے گا؟ لیکن پھر انھوں نے اپنے دل میں کہا۔

" خدا کی قسم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچانے کے بعد اب میرا جو بھی حشر ہو مجھے اس کی قطعی کوئی پرواہ نہیں ہے۔"

ادھر جب کسریٰ کا غصہ فرد ہوا تو اس نے حضرت عبداللہؓ کو دوبارہ اپنے سامنے پیش کیے جانے کا حکم دیا لیکن وہ نہیں ملے۔ اس کے آدمیوں نے بہتیرا تلاش کیا مگر ان کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ ان لوگوں نے جزیرۃ عرب تک جانے والے تمام راستوں کو چھان مارا مگر وہ ان کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔

جب حضرت عبداللہ رضؓ دربار نبویؐ میں حاضر ہوئے تو انھوں نے کسریٰ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی مکمل روداد آپؐ کے گوش گزار کردی اور خط پھاڑنے کے واقعے سے بھی آپؐ کو آگاہ کیا۔ ان کی پوری سرگزشت سُن کر آپؐ نے صرف اتنا فرمایا " مَزَّقَ اللهُ مُلْكَهُ "۔ اللہ تعالیٰ اس کی سلطنت کو پارہ پارہ کردے۔

ادھر کسریٰ نے اپنے یمن کے گورنر باذان کو لکھا کہ اس شخص کے پاس جس نے حجاز میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اپنے دو قوی اور بہادر آدمیوں کو بھیجو اور انھیں حکم دو کہ اسے پکڑ لائیں اور میرے سامنے پیش کریں۔ حسب حکم باذان نے اپنے دو بہترین آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ کیے اور ان دونوں کے ہاتھ آپؐ کو ایک خط بھی بھیجا جس میں اس نے لکھا کہ "آپ بلا تاخیر ان کے ساتھ کسریٰ کے سامنے پیش ہونے کے لیے چلے آئیں۔" اس نے ان دونوں سے یہ بھی کہا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل کریں اور ان کے متعلق مفصل معلومات فراہم کرکے اس کو آگاہ کریں۔

وہ دونوں پیہم اور تیز رفتاری کے ساتھ مراحل سفر طے کرتے ہوئے طائف پہنچے۔ وہاں ان کی ملاقات قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ہوئی۔ ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ یثرب میں ہیں۔ اس کے بعد تاجر خوش وخرم اور شاداں و فرحاں مکہ پہنچے اور انھوں نے قریش کو خوش خبری دیتے ہوئے کہا کہ "یہ بات تمھارے لیے بڑی خوش کن اور مسرت انگیز ہے کہ "کسریٰ" محمد کے درپئے آزار ہو گیا ہے اور اس نے تمھیں اس کے شر سے بچا لیا ہے۔" ادھر ان دونوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور باذان کا خط آپؐ کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ "شہنشاہ کسریٰ نے اپنے حاکم باذان کو ہدایت کی ہے کہ وہ آپ کو لانے کے لیے کسی کو بھیجے۔ چنانچہ ہم اسی لیے آئے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں، اگر آپ ہماری بات مان لیں تو ہم کسریٰ سے بات کرکے آپ کے لیے رعایت حاصل کرلیں گے اور آپ کو اس کی طرف سے پہنچنے والی ہر متوقع تکلیف اور اذیت سے بچالیں گے۔ لیکن اگر آپ نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تو

آپ خود اس کی قوت وسطوت سے بخوبی واقف ہیں۔ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ آپ کو اور آپ کی پوری قوم کو تباہ و برباد کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سُن کر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "آج تو تم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس جاؤ، کل پھر آنا"۔ جب دوسرے دن وہ دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ "کیا آپؐ نے ہمارے ساتھ چلنے اور کسریٰ سے ملنے کے لیے خود کو تیار کر لیا ہے؟" تو آپؐ نے جواب دیا کہ "آج کے بعد تم کسریٰ سے نہیں مل سکو گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے "شیرویہ" کو فلاں مہینے کی فلاں رات اس کے اُوپر مسلّط کر کے اسے ہلاک کر دیا ہے"۔

یہ سُنا تو ان کے چہروں پر دہشت و حیرانی کے آثار ظاہر ہوئے اور وہ ٹکٹکی باندھ کر آپؐ کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"جانتے ہیں آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا یہ بات ہم باذان کو لکھ دیں؟"

"ہاں، اور اس کو یہ بھی لکھ دینا کہ میرا دین کسریٰ کی سلطنت کے آخری حدُود تک پہنچے گا اور اُسے یہ بھی لکھ دو کہ اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمہارا یہ سارا زیر حکومت علاقہ تمہارے سپرد کر کے تم کو تمہاری قوم کا حکمراں بنا دوں گا"۔ آپؐ نے جواب دیا۔

اِس کے بعد وہ دونوں آپؐ سے رخصت ہو کر باذان کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر سے اس کو مطلع کیا۔ باذان نے کہا کہ اگر محمدؐ کی یہ بات درست ہے تو یقیناً وہ اللہ کے نبی ہیں، اور اگر ایسا نہیں

ہے تو سوچوں گا کہ مجھے ان کے ساتھ کیا رویّہ اپنانا چاہیے۔" پھر اس کے چند ہی روز بعد "شیرویہ" کا خط باذان کے پاس پہنچا، جس میں اس نے لکھا تھا۔
" میں نے کسریٰ کو قتل کر دیا ہے۔ میں نے اس کو اپنی قوم کے انتقام میں قتل کیا ہے۔ اس نے ہماری قوم کے اشراف کو قتل کرنا، ان کی عورتوں کو کنیز بنانا اور ان کے اموال کو غصب کرنا اپنا شیوہ بنا لیا تھا۔ جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو اپنے پاس موجود تمام لوگوں سے میری اطاعت و فرمانبرداری کا عہد لے لو۔"

باذان نے اس خط کو پڑھتے ہی ایک طرف پھینک کر اپنے دخول اسلام کا اعلان کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یمن میں رہنے والے سارے ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ کہانی تو تھی حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کی کسریٰ شاہِ ایران کے ساتھ ملاقات کی۔ رہی قیصر روم سے ان کی ملاقات کی کہانی تو وہ یہ ہے۔ قیصر روم کے ساتھ حضرت عبداللہؓ کی ملاقات، خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطابؓ کے عہد خلافت میں ہوئی تھی۔ ان کی ملاقات کا یہ قصہ بھی حد درجہ دلچسپ اور نہایت حیرت انگیز ہے۔

امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ نے ۱۹ھ میں رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے ایک فوج روانہ کی تھی جس میں حضرت عبداللہ بن حذافہؓ بھی شریک تھے۔ مسلمان مجاہدین کی صداقت ایمانی عقیدہ کی پختگی اور راہِ خدا میں ان کی جانبازی و جاں سپاری کی خبریں قیصر روم تک پہلے سے پہنچی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے فوجی افسروں کو اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ وہ اگر کسی مسلمان سپاہی کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اسے قتل نہ کریں بلکہ

زندہ اس کے سامنے پیش کریں۔ خُدا کی مرضی، اتفاق سے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ رومی فوجیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے، رومی انھیں بادشاہ کے پاس لائے اور یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے پیش کیا کہ "یہ شخص محمدؐ کے ان اصحاب میں سے ہے جنھوں نے بالکل آغاز دعوت کے زمانے میں ان کی پکار پر لبیک کہا تھا۔ ہم اس کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئے اور حسبِ حکم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔"

قیصر انھیں دیر تک بغور دیکھتا رہا۔ پھر ان سے کہنے لگا۔

"میں تمھارے سامنے ایک بات پیش کر رہا ہوں۔"

"وہ کیا بات ہے؟" حضرت عبداللہؓ نے پوچھا۔

"تم نصرانیت قبول کر لو۔ اگر تم نے میری بات مان لی تو میں تمہیں رہا کر دوں گا۔ اور تمہارے ساتھ عزت و تکریم کا بہترین سلوک کروں گا۔"

حضرت عبداللہؓ نے اس کی اس پیش کش کو پائے نفرت و حقارت سے ٹھکرادیا اور حد درجہ حزم و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ ناممکن ہے۔ موت مجھے تمہاری اس پیش کش سے ہزاروں گنا زیادہ محبوب ہے۔"

میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک نہایت زیرک و دانا آدمی ہو۔ اگر تم میری یہ پیش کش قبول کر لو تو میں تمہیں اپنے اقتدار میں شریک کر لوں گا۔" قیصر اُن کو شیشے میں اُتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بادشاہ کی اِس سطحی پیش کش کو سن کر بوجھل زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی بے ساختہ مسکرا پڑا، اور اس نے نہایت بے نیازی اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا کی قسم! اگر تم عرب و عجم کی ساری سلطنت بھی مجھے دیدو اور اس کے بدلے صرف یہ چاہو کہ میں ایک لمحے کے لیے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پھر جاؤں تو یہ بھی میرے لیے قطعاً ناقابلِ قبول ہے!"

"تب میں تم کو قتل کردوں گا!" قیصر نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"تمھاری مرضی، جو چاہو کرو!" حضرت عبداللہؓ نے اس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر جواب دیا۔

پھر قیصر نے انھیں ٹکٹکی پر باندھنے کا حکم دیا۔ اس کے اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور انھیں ٹکٹکی پر باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے جلّاد سے رومی زبان میں کہا کہ "اس کے دونوں ہاتھوں کے آس پاس تیر چلاؤ، (وہ اس وقت بھی انھیں نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا)، مگر انھوں نے انکار کردیا۔ پھر اس نے جلّاد کو ان کے پاؤں کے اردگرد تیر مارنے کا حکم دیا۔ (اس دوران بھی وہ انھیں اپنا دین چھوڑنے کی دعوت دیتا رہا لیکن انھوں نے پھر بھی انکار کیا۔) تب قیصر نے جلّاد کو رُک جانے کا اشارہ کیا اور کہا کہ اسے تختۂ دار سے نیچے اتار دو۔ پھر اس نے ایک بڑی سی دیگ منگوائی، اس میں تیل ڈلوایا اور اسے آگ پر رکھوا دیا۔ جب تیل کھولنے لگا تو اس نے مسلمان قیدیوں میں سے دو آدمیوں کو بلوایا اور ان میں سے ایک کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوا دیا۔ اس میں پڑتے ہی اس کے بدن کا گوشت الگ ہوگیا اور ہڈیاں نظر آنے لگیں۔ قیصر نے حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کی طرف رُخ کرتے ہوئے پھر ان کو نصرانیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ مگر انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ اس کی دعوت کو رد کردیا۔

جب وہ ان سے بالکل مایوس ہو گیا تو انہیں بھی اسی دیگ میں ڈلنے کا حکم دیا جس میں ان کے دونوں ساتھیوں کو ڈالا گیا تھا۔ جب انھیں کشاں کشاں دیگ کی طرف لے جایا جارہا تھا، ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ سپاہیوں نے قیصر سے کہا کہ یہ رو رہا ہے۔ قیصر نے سمجھا کہ اب ان کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ اسے میرے پاس لاؤ۔ جب حضرت عبداللہؓ اس کے پاس پہنچے تو اس نے پھر اس خواہش کا اعادہ کیا کہ وہ نصرانیت اختیار کر لیں مگر جب اُنہوں نے انکار کر دیا تو اس نے دریافت کیا کہ پھر تم رو کیوں رہے تھے؟"

"میرے دل میں یہ خیال آیا کہ عبداللہؓ! اس وقت تم اس دیگ میں ڈال دیے جاؤ گے اور تمھاری جان نکل جائے گی، حالانکہ میری خواہش تھی کہ کاش میرے بدن میں اتنی ہی جانیں ہوتیں جتنے بال ہیں اور وہ تمام جانیں ایک ایک کر کے خدا کے دین کے لیے اس دیگ میں ڈالی جاتیں۔ اسی خیال پر مجھے رونا آگیا۔" حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا۔

"اچھا کیا تم میرے سر کو بوسہ دے سکتے ہو؟" ہرقل نے پوچھا۔ "اگر تم ایسا کرو تو میں تم کو رہا کر دوں گا۔"

"اور میرے دوسرے تمام مسلمان ساتھیوں کو بھی؟" حضرت عبداللہؓ نے سوال کیا۔

"ہاں، دوسرے تمام مسلمان قیدیوں کو بھی تمہارے ساتھ رہا کر دیا جائے گا۔" قیصر نے جواب دیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کہتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا کہ یہ اللہ کا ایک دشمن ہے، اگر میں اس کے سر کو بوسہ دے دوں تو یہ اس کے بدلے

میں مجھ اور تمام مسلمان قیدیوں کو رہا کردے گا۔ ایسا کر لینے میں میرا کیا نقصان ہے؟

پھر انھوں نے قریب جاکر اس کے سر کا بوسہ لے لیا۔ اور ہرقل نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ تمام مسلمان قیدی جمع کر کے عبداللہ بن حذافہ کے حوالے کر دیئے جائیں اور اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ خلیفہ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے اپنی یہ سرگزشت ان کو سنائی، جس کو سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور قیدیوں کو دیکھا تو فرمایا کہ " ہر مسلمان پر یہ حق ہے کہ وہ عبداللہ بن حذافہ رضؓ کے سر کو بوسہ دے۔ اور یہ حق سب سے پہلے میں ادا کر رہا ہوں اور پھر انھوں نے حضرت عبداللہ بن حذافہ رضؓ کے سر کا بوسہ لیا۔

حضرت عُمیر بن وہب جُمحی رضی اللہ عنہ

عُمیر بن وہب جمحی جنگ بدر سے خود تو اپنی جان بچا کر صحیح سلامت واپس آگیا مگر اپنے پیچھے اپنے لڑکے کو مدینہ میں چھوڑ آیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگیا تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ مسلمان، باپ کے جرائم کے بدلے میں بیٹے سے مواخذہ کریں گے اور ان اذیتوں اور تکلیفوں کے بدلے میں اسے دردناک سزا دیں گے جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی دعوت سے باز رکھنے اور ان کے صحابہ کو اس سے پھیرنے کے لیے دیا کرتا تھا۔

ایک روز عمیر چاشت کے وقت بیت اللہ کا طواف کرنے اور وہاں رکھے ہوئے بُتوں سے برکت حاصل کرنے کی نیت سے مسجد حرام میں داخل ہوا۔ وہاں اُس نے صفوان بن امیہ کو حِجر[1] کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا تو اس کی طرف بڑھ گیا۔ اور اسے سلام کیا۔ صفوان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "عمیر! آؤ بیٹھو۔ کچھ دیر باتیں کریں۔ باتوں میں وقت اچھا کٹ جاتا ہے"۔ عمیر، صفوان کے بازو میں بیٹھ گیا اور دونوں کے درمیان جنگ بدر اور اس میں نازل ہونے والی مصیبت کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ اپنے ان قیدیوں کو شمار کر رہے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے تھے۔ صفوان نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

---

[1] کعبہ سے متصل شمال کی جانب ایک جگہ۔

"خدا کی قسم، ان لوگوں کے بغیر اب زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہ گیا ہے۔"

"تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو" عمیر نے اس کی تائید کی۔ پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"رب کعبہ کی قسم، اگر میرے ذمّے وہ قرض نہ ہوتے جن کی ادائیگی کا میرے پاس کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اور میرے اہل وعیال نہ ہوتے جن کے اپنے بعد ہلاک ہوجانے کا مجھے شدید اندیشہ لاحق ہے تو میں یثرب جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دیتا اور اس فتنے کا سدِ باب کر دیتا جو ہمارے لیے پریشانی کا سبب ہوا ہے۔" (نعوذ باللہ من ذالک) پھر وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"مسلمانوں کے یہاں میرے لڑکے وہب کی موجودگی کے سبب میرا وہاں جانا ان کے لیے کسی تشویش یا شبہ کا باعث بھی نہیں ہوگا۔"

صفوان نے عمیر کی اس بات کو غنیمت سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہاتھ آیا ہوا یہ بہترین موقع ضائع ہوجائے اس لیے اس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"عمیر! تم اپنا سارا قرض میرے اُوپر چھوڑ دو۔ چاہے وہ جتنا بھی ہو میں اسے تمہاری طرف سے ادا کردوں گا اور تمہارے اہل وعیال کو اپنے اہل وعیال میں شامل کرکے زندگی بھر ان کی پوری پوری کفالت کرتا رہوں گا۔ میرے پاس جو دولت ہے وہ ان سب کے گزر بسر کے لیے کافی ہے۔ وہ اس سے خوش حالی اور فراخی کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔"

"تب ہماری اس باہمی گفت گو کو اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ کسی دوسرے کو اس سے آگاہ نہ کرنا۔" عمیر نے صفوان کو راز داری کی تاکید کرتے ہوئے

کہا۔ "میں تمہارے لیے اس کا ذمّہ لیتا ہوں"۔ صفوان نے اس کو اطمینان دلایا۔

عمیر مسجد سے اُٹھ کر باہر آیا تو اس کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بغض وکینہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لیے ضروری انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اس کو اپنے اس سفر اور اس کے مقصد کے بارے میں کسی شخص کی طرف سے کسی شبہے کا قطعی کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت قیدیوں کے فدیے کی ادائیگی کے سلسلے میں ان کے قریشی رشتہ داروں کی یثرب کی طرف آمد ورفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔

عمیر نے اپنی تلوار کو صیقل کرنے اور اس کو زہر میں بجھانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے اپنی سواری کی اونٹنی طلب کی۔ وہ تیار کر کے اس کے سامنے لائی گئی اور وہ اس کی پُشت پر سوار ہو گیا۔ اور اپنے دل میں بغض وعداوت اور شر وفساد کے ناپاک جذبات لیے مدینہ کی سمت چل پڑا۔ عمیر مدینہ پہنچا اور اس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے مسجد کا رُخ کیا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) جب وہ مسجد کے دروازے کے پاس پہنچا تو اس نے اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور اس سے نیچے اُتر آیا۔ اس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کچھ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مسجد کے دروازے کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ آپس میں جنگِ بدر اور اس میں قتل ہونے والے قریشیوں اور ان کے قیدیوں کا تذکرہ کر رہے تھے۔ وہ مسلمان مہاجرین وانصار کے دلیرانہ کارناموں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کر رہے تھے جو اس نے مسلمانوں کی فتح وکامرانی اور ان کے دشمنوں کی ذلت آمیز شکست کی شکل میں ان کے اُوپر کیا تھا۔ یکایک حضرت عمرؓ کی توجہ بدلی اور ان کی نظر عمیر بن وہب پر پڑی جو اپنی سواری سے اُتر کر

تلوار لٹکائے مسجد کی طرف جا رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ گھبرا اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے دوڑے۔

"یہ کتا، دشمنِ خدا عمیر بن وہب ہے ۔۔۔۔ خدا کی قسم یہ کسی نیک ارادے سے نہیں آیا ہے۔ یہ مکہ میں مشرکین کو ہمارے خلاف اکسایا کرتا اور جنگ بدر سے پہلے ہمارے خلاف جاسوسی کیا کرتا تھا! پھر انھوں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"تم لوگ فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جاؤ اور آپؐ کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ اور ہوشیار رہنا کہیں یہ خبیث مکار کوئی دھوکا نہ کر دے۔" پھر وہ خود لپکے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ دشمنِ خدا عمیر بن وہب ہے جو تلوار سے مسلح ہو کر آیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ضرور کسی بُرے ارادے سے یہاں آیا ہے۔"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سُن کر فرمایا کہ" اسے میرے پاس لے آؤ۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ عمیر بن وہب کے پاس پہنچے اور اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔ اور اس کی گردن کو تلوار کے تسمے میں پھنسا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس حال میں دیکھا تو فرمایا کہ "عمر! اس کو چھوڑ کر دُور ہٹ جاؤ" پھر آپؐ نے عمیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اسے اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آپؐ کے نزدیک جا کر جاہلیت کے طریقے سے سلام کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ "عمیر! اللہ تعالیٰ

نے ہم کو تمہارے طریقۂ سلام سے بہتر سلام سے نوازا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو "سلام" سے نوازا ہے جو اہل جنّت کا طریقۂ سلام ہے۔"

"واللہ آپ ہمارے طریقۂ سلام سے زیادہ دُور نہیں ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے آپ کے سلام کرنے کا طریقہ بھی یہی تھا۔" عمیر نے کہا۔

"عمیر! تم یہاں کس غرض سے آئے ہو؟" رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا۔

"اس قیدی کی رہائی کی اُمّید لے کر آیا ہوں جو آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ اس کو رہا کر کے میرے اُوپر احسان کیجئے۔" عمیر نے بہانہ بنایا۔

"پھر تمہاری کمر میں یہ تلوار کیسی لٹک رہی ہے؟" آپؐ نے اس کے دل کا چور پکڑتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ ان تلواروں کا بُرا کرے، کیا جنگ بدر کے روز یہ ہمارے کسی کام آسکیں؟ اس نے ایک اور پردہ ڈالنا چاہا۔

"عمیر! مجھ سے سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے، یہاں آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟" آپؐ نے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں کیا۔

"میں واقعی صرف اسی کام سے آیا ہوں۔" وہ ایک بار پھر سفید جھوٹ بولا۔

"نہیں صحیح بات یہ ہے کہ تم اور صفوان بن امیۃ حجر کے پاس بیٹھے تھے۔ اور تم نے قریش کے ان مقتولین کا ذکر کیا جو بدر کے گڑھے میں ڈال دیے گئے تھے۔ پھر تم نے کہا تھا کہ اگر میرے اُوپر قرض کا بوجھ اور اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں یثرب جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کام تمام کر دیتا۔ تو صفوان نے اس شرط پر کہ تم مجھے قتل کر دو گے تمہارے قرضوں کی ادائیگی اور تمہارے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی لیکن

یاد رکھو تمہارے اور اس ناپاک ارادے کے درمیان اللہ تعالیٰ حائل ہے۔"
رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔
یہ سُن کر تھوڑی دیر کے لیے عمیر بن وہب بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ پھر بول اُٹھا۔" میں گواہی دیتا ہوں کہ واقعی آپ اللہ کے رسُول ہیں۔" اس کے بعد اس نے کہا۔
" یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کی بیان کردہ آسمانی خبروں اور آپ کے اُوپر نازل شدہ وحی کی تکذیب کرتے تھے۔ لیکن میرے اور صفوان کے مابین طے شدہ اس منصوبے کو میرے اور اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ خدا کی قسم اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ ہمارے اس خفیہ منصوبے سے خدا کے سوا کسی دُوسرے نے آپ کو آگاہ نہیں کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ مجھے یہاں کھینچ لایا تاکہ مجھے دولتِ ایمان سے سرفراز فرمائے۔" پھر وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ " اپنے بھائی کو دین سکھاؤ، اسے قرآن کی تعلیم دو اور اس کے قیدی کو آزاد کر دو۔"
عمیر بن وہب کے اسلام لانے پر مسلمانوں نے غیر معمولی مسرّت کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ " جس وقت عمیر بن وہب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا، وہ میرے نزدیک خنزیر سے بھی بدتر تھا، لیکن آج وہ میرے بعض بیٹوں سے بھی زیادہ مجھے محبوب ہے۔"
حضرت عمیر بن وہب مدینہ میں رُک گئے۔ وہاں رُک کر وہ اسلامی تعلیمات کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ کرتے، قرآن کے نور سے اپنے دل کو

منور کرتے اور اپنی زندگی کے بارونق اور مطمئن ترین ایّام گزارتے رہے۔ اور اس مدت کے دوران صفوان بن امیہ اپنے دل کو جھوٹی امیدوں سے بہلاتا رہا۔ جب بھی اس کا گزر قریش کی مجلسوں کی طرف ہوتا، وہ اُن کو خوش خبری دیتے ہوئے کہتا کہ "عنقریب تمہارے پاس ایک ایسی اہم اور مسرّت افزا خبر آنے والی ہے جو بدر کے اندوہناک سانحہ کے اثرات کو تمہارے دلوں سے محو کر دے گی۔"

لیکن جب اس کے انتظار کی گھڑیاں طویل ہوگئیں تو بتدریج اضطراب بے چینی اس کے دل میں سرایت کرنے لگی اور لمحہ بہ لمحہ اس کی بے قراری اور پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ وہ مدینہ کی طرف سے آنے والے قافلوں سے حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کے بارے میں دریافت کرتا مگر کسی کے پاس اس کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہوتا تھا...... آخرکار ایک سوار نے آکر اس کو یہ اطلاع دی کہ "عمیر نے اسلام قبول کرلیا ہے۔" یہ خبر صفوان بن امیہ پر بجلی بن کر گری۔ کیوں کہ اُس کو اس بات کا یقین تھا کہ عمیر بن وہب ہرگز اسلام قبول نہیں کرسکتا چاہے رُوئے زمین پر بسنے والا ہر شخص مُسلمان ہوجائے۔

ادھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ برابر اپنے دین کا علم حاصل کرتے رہے اور جہاں تک ممکن ہوا اپنے رب کے کلام کو حفظ کرتے رہے۔ پھر ایک روز انھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ماضی میں ایک طویل مدت تک میں خدا کے نور کو بجھانے کی کوشش میں لگا رہا اور دین اسلام کو قبول کرنے والوں کو سخت قسم کی اذیتیں دیتا رہا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپؐ

مجھے مکّہ جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ وہاں پہنچ کر میں قریش کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دوں۔ اگر وہ میری دعوت قبول کرلیں گے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا۔ لیکن اگر انھوں نے میری اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو میں ان کو بھی بُت پرستی اور انکارِ اسلام کے جرم میں ویسی ہی اذیتیں دوں گا جیسی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام قبول کرنے پر دیا کرتا تھا۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دیدی۔ اجازت پاکر وہ مکّہ آئے اور صفوان بن امیہ کے گھر پہنچے اور اس سے بولے۔ "صفوان! تمہارا شمار مکّہ کے سربرآوردہ لوگوں اور قریش کے اصحابِ عقل و دانش میں ہوتا ہے۔ کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو اُن پتھروں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی کرنے کا جو طریقہ تم لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے، وہ عقل کی رو سے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ ہے؟ میں تو اسے درست نہیں سمجھتا، اور اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا حقیقت میں کوئی معبود نہیں ہے اور محمّد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔"

پھر حضرت عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ مکّہ میں دعوت اِلی اللہ کے کام میں جُٹ گئے اور بڑی تعداد میں لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت عمیر بن وہبؓ کو بہترین اجر سے نوازے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

حضرت برا بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ

وہ پراگندہ مو، نحیف الجثّہ، ہلکے پھلکے، دُبلے پتلے اور چھریرے بدن کے مالک تھے۔ بظاہر ان کی شخصیت میں کوئی کشش نہ تھی۔ دیکھنے والے ان کے اُوپر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈال کر اپنی نگاہیں پھیر لیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شجاعت و جواں مردی کا یہ حال تھا کہ جنگ مغلوبہ میں دشمن کی کثیر تعداد کو قتل کرنے کے علاوہ انھوں نے انفرادی جنگ میں ایک سو مشرکین کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ وہ تلوار کے دھنی، نہایت شجاع اور جنگ کے وقت آگے بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والے تھے۔ اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف صوبہ جات کے گورنروں کو یہ حکم دیا تھا کہ انھیں لشکر مجاہدین کے کسی دستے کی قیادت پر مامور نہ کیا جائے، کیونکہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اقدام کے ذریعہ انھیں ہلاکت میں ڈال دیں گے۔

یہ ہیں خادم رسولؐ حضرت انسؓ کے بھائی حضرت برا بن مالک انصاریؓ۔ ان کی جرأت و شجاعت کے کارنامے اتنے زیادہ ہیں کہ اگر ہم ان کو بیان کرنے لگیں تو سلسلۂ بیان دراز اور وقت تنگ ہو جائے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلیرانہ کارناموں میں سے صرف ایک کا ذکر کر دیا جائے جو اُن کے دوسرے کارناموں پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہو۔

اس کہانی کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور آپؐ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے، جب عرب قبائل

بڑی تعداد میں دینِ اسلام کو چھوڑ کر اس میں سے بالکل اسی طرح نکل گئے جس طرح وہ فوج در فوج اس میں داخل ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ مکہ، مدینہ، طائف اور ادھر اُدھر کے چند قبائل کے سوا جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے ایمان پر جما دیا تھا، کوئی اسلام پر باقی نہیں رہ گیا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ ان ہلاکت خیز اور تباہ کن فتنوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور ان کے استقبال کے لیے بلند اور مضبوط پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے مہاجرین وانصار پر مشتمل گیارہ لشکر ترتیب دیے اور ان کے لیے گیارہ عَلَم تیار کرکے ان کے قائدین کے حوالے کرتے ہوئے انھیں جزیرۂ عرب کے مختلف علاقوں میں روانہ کیا تاکہ وہ مرتدین کو حق و ہدایت کی راہ پر واپس لائیں اور دینِ حق سے منحرف ہونے والوں کو بزورِ شمشیر جادۂ حق کی طرف پلٹ آنے پر مجبور کردیں۔ ان مرتدین میں مسیلمہ بن حبیب کذّاب کا قبیلہ بنو حنیفہ کثرتِ تعداد، جنگی مہارت اور شجاعت ودلیری کے لحاظ سے سب سے زیادہ مضبوط تھا۔ مسیلمہ کی حمایت وتائید کے لیے اس کے اپنے قبیلے اور اس کے حلیف قبائل کے چالیس ہزار جنگ جو اکٹھا ہوگئے تھے۔ ان کی اکثریت نے مسیلمہ پر ایمان لانے کے بجائے محض قبائلی عصبیت کی بنا پر اس کی پیروی اختیار کی تھی۔ ان میں سے بعض کا یہ کہنا تھا کہ ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ جھوٹا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے نبی ہیں مگر ربیعہ کا کذاب (مسیلمہ) مضر کے صادق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں ہمارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔

مسیلمہ نے مسلمانوں کے پہلے لشکر کو، جو اس سے لڑنے کے لیے حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کی قیادت میں نکلا تھا، شکست دے کر اُلٹے پاؤں واپس

ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کی جگہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالدؓ بن ولید کی سرکردگی میں دوسری فوج روانہ کی جس میں انھوں نے انصار و مہاجرین میں سے بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کو جمع کر دیا تھا۔ اس فوج کے ہراول میں حضرت برار بن مالک انصاریؓ اور کچھ دوسرے بہادر اور جانباز مسلمان مجاہدین شامل تھے۔

دونوں فوجیں نجد میں یمامہ کے مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں اور جنگ شروع ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد مسیلمہ کا پلہ بھاری ہونے لگا، زمین مسلمانوں کے پاؤں کے نیچے سے سرکنے لگی اور وہ اپنی جگہ سے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ مسیلمہ کے حامیوں نے آگے بڑھ کر حضرت خالدؓ بن ولید کے خیمے پر حملہ کر دیا اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اگر بنو حنیفہ ہی کے ایک شخص (مجاعہ) نے امان نہ دی ہوتی تو انھوں نے ان کی بیوی (حضرت ام حکیم) کو قتل بھی کر دیا ہوتا۔ اس وقت مسلمانوں کو زبردست خطرے کا احساس ہوا۔ انھوں نے بڑی شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا کہ اگر وہ مسیلمہ سے شکست کھا جاتے ہیں تو آج کے بعد نہ کوئی اسلام کی حمایت میں کھڑا رہ سکے گا نہ پورے جزیرہ عرب میں خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش ممکن ہوگی۔ یہ احساس ہوتے ہی حضرت خالدؓ بن ولید بڑی سرعت کے ساتھ فوج کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی اس طرح از سر نو ترتیب قائم کی کہ مہاجرین کو انصار سے اور بادیہ نشین قبائل کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا اور ہر قبیلہ کے افراد کو انھیں میں سے کسی کی قیادت میں منظم کیا تاکہ جنگ میں ہر ایک فریق کی کارکردگی کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکے اور یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمان فوج کس محاذ پر کمزور پڑ رہی ہے۔

دونوں فوجوں میں ایسی سخت اور خونریز جنگ برپا ہوئی کہ اس سے قبل

مسلمانوں کی جنگ کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں گزری تھی۔ مسیلمہ کی قوم نے اس جنگ میں غیر معمولی ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ معرکۂ کارزار میں مضبوط چٹانوں کی طرح ڈٹ گئے اور انھوں نے اپنے مقتولین کی کثرت کی کوئی پرواہ نہیں کی، نہ اس کی وجہ سے انھوں نے اپنے حوصلے پست ہونے دیے نہ اُن کے قدموں میں لغزش ہوئی۔ مسلمان مجاہدین نے بھی حیرت انگیز بہادری اور بے مثال جواں مردی کے مظاہرے کیے اور جرأت و شجاعت کے ایسے ایسے شاندار اور فقید المثال کارنامے انجام دیے کہ اگر ان کو یک جا کر کے مرتب کر دیا جائے تو ایک لاجواب رزمیہ وجود میں آجائے۔

یہ ہیں انصار کے علم بردار حضرت ثابت بن قیسؓ، وہ اپنے جسم پر خوشبو لگاتے ہیں، کفن پہنتے ہیں اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں پنڈلیوں تک اُتر کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اپنی جگہ پر جم کر لڑتے ہیں۔ اپنے قبیلے کے جھنڈے کی حفاظت کرتے ہیں اور لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں، اور یہ ہیں عمر فاروقؓ کے بھائی حضرت زید بن خطابؓ، جو مسلمانوں کو للکار رہے ہیں "لوگو! دشمن پر کاری ضرب لگاؤ اور اس کو مارتے کاٹتے آگے ہی بڑھتے رہو۔ لوگو! میں اس کے بعد اب اُس وقت تک کوئی بات نہیں کروں گا جب تک مسیلمہ کو شکست نہ ہو جائے یا میں خدا کی بارگاہ میں حاضر نہ ہو جاؤں تاکہ وہاں اپنی معذرت پیش کر سکوں۔" پھر انھوں نے دشمن پر ایک زبردست حملہ کیا اور برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ جام شہادت نوش فرمالیا۔ اور یہ ہیں حضرت ابو حذیفہؓ کے مولیٰ، حضرت سالمؓ۔ مہاجرین کا علم ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے متعلق مہاجرین کو یہ ایک اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کی طرف سے کسی کمزوری یا پسپائی کا اظہار نہ ہو، تو انھوں نے کہا کہ ہم کو خطرہ ہے کہ کہیں آپ کی

طرف سے دشمن ہمارے اُوپر حملہ نہ کر دیں تو اُنھوں نے جواب دیا کہ " اگر میری طرف سے کسی قسم کی کمزوری کا اظہار ہوا اور دشمن میری طرف سے تمہارے اُوپر حملہ کرنے کی راہ پالے تو میں بدترین حاملِ قرآن ٹھہروں گا۔" یہ کہہ کر وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے لیکن جواں مردی اور شجاعت کے یہ سارے کارنامے حضرت براء بن مالکؓ کی دلیری و شجاعت کے آگے ہیچ ہیں۔

جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے جنگ کے شعلوں کو تیزی سے بھڑکتے ہوئے دیکھا تو حضرت براءؓ بن مالک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے کہ " انصاری نوجوان! دشمن پر حملہ کرو۔"

تو حضرت براء بن مالکؓ نے اپنے قبیلے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

" انصار کے لوگو! تم میں سے کوئی شخص مدینہ واپس لوٹنے کی بات نہ سوچے۔ آج کے بعد تمہارے لیے مدینہ نہیں ہے۔ آج تو صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی رضا کی طلب ہے اور . . . . . اور پھر جنّت ہے۔" پھر اُنھوں نے مشرکین پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان کے قبیلے کے لوگوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ وہ صفوں کو چیرتے، شمشیر زنی کے جوہر دکھاتے اور دشمنوں کی گردنوں پر اس کی تیزی آزماتے رہے۔ یہاں تک کہ مسیلمہ اور اس کے سپاہیوں کے قدم اکھڑ گئے اور انھوں نے بھاگ کر اس باغ میں پناہ لی جو اس کے بعد تاریخ میں " حدیقۃ الموت " کے نام سے مشہور ہوا۔ اس لیے کہ اس روز اس باغ میں بہت کثیر تعداد میں لوگ قتل ہوئے اور کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے۔

" حدیقۃ الموت " ایک بہت وسیع و عریض باغ تھا اور اس کی فصیلیں نہایت بلند و بالا تھیں۔ مسیلمہ اور اس کے ہزاروں ہمنواؤں نے اس میں پناہ لینے کے بعد اس کے دروازے اندر سے بند کر لیے اور اس کی اُونچی دیواروں کے پیچھے

خود کو محفوظ کر لیا اور اندر سے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کرنے لگے۔ اس وقت اِسلام کے جانباز اور بہادر فرزند حضرت براء بن مالکؓ آگے بڑھے اور بولے کہ لوگو! مجھے ڈھال پر بٹھا کر نیزوں کے سہارے اُوپر اٹھاؤ اور دروازے کے قریب باغ کے اندر پھینک دو تاکہ یا تو میں شہادت کا درجہ حاصل کروں یا تمہارے لیے دروازہ کھول دوں۔ حضرت براءؓ نہایت ہلکے پھلکے اور دُبلے پتلے تھے۔ وہ فوراً ایک ڈھال پر بیٹھ گئے اور دسیوں نیزوں نے انھیں اوپر اُٹھالیا اور ان کو حدیقۃ الموت کے اندر مسیلمہ کے ہزاروں فوجیوں کے درمیان پھینک دیا گیا۔ اندر پہنچتے ہی وہ دشمنوں کے اوپر بجلی بن کر گرے۔ وہ دروازے کے پاس برابر لڑتے رہے اور اُن کی گردنیں تلوار سے قلم کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے دس آدمیوں کو قتل کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اس وقت ان کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے اَسّی سے اُوپر زخم تھے۔ مسلمانوں نے دیواروں اور دروازوں کے راستے حدیقۃ الموت پر دھاوا بول دیا اور اس میں پناہ لینے والے مرتدین کو اپنی تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور تقریباً بیس ہزار مشرکین کو واصلِ جہنم کرنے کے بعد مسیلمہ تک پہنچ کر اسے بھی فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ حضرت براءؓ کے زخموں کا علاج کرنے کے لیے ان کو خیمے میں اُٹھا کر لایا گیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ دوا علاج کے سلسلے میں ایک ماہ تک ان کے پاس ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شفاءِ کامل سے نوازا اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کو شاندار فتح عنایت فرمائی۔

حضرت براء بن مالکؓ اس دولتِ شہادت کو پانے کی حسین آرزو کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے اور برابر اس کی جستجو میں سرگرداں رہے جو حدیقۃ الموت کے روز ان کو حاصل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ وہ اپنے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے سرفراز ہونے کے لیے یکے

بعد دیگرے بہت سے معرکوں میں شریک ہوئے اور ان میں خطرناک ترین مواقع پر پہنچ کر لڑتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آگیا جب مسلمانوں نے ایران کے مشہور شہر "تستر" کو فتح کرنے کے لیے اس کا محاصرہ کرلیا۔ اہل فارس ایک نہایت مستحکم و مضبوط قلعے میں پناہ گیر ہوگئے اور مسلمانوں نے اس کو چاروں طرف سے اپنے محاصرہ میں لے لیا۔ جب محاصرہ کا یہ سلسلہ کافی طویل ہوگیا اور اہلِ ایران کی پریشانیاں حد سے بڑھ گئیں تو وہ قلعہ کی فصیلوں سے لوہے کی زنجیریں لٹکانے لگے جن کے سروں سے فولادی انکس جڑے ہوئے تھے جن کو آگ میں تپا کر انگاروں کی طرح سُرخ کردیا جاتا۔ وہ نوکیلے اور دہکتے ہوئے انکس مسلمانوں کے جسموں میں دھنس جاتے اور وہ ان میں پھنس کر رہ جاتے اور ایرانی اُوپر سے زنجیروں کے ذریعہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ان انکسوں میں پھنس کر مسلمان یا تو موت کے گھاٹ اُتر جاتے یا قریب الموت ہوجاتے تھے۔ انہی میں سے ایک انکس حضرت براءؓ کے بھائی حضرت انسؓ بن مالک کے جسم میں دھنس گیا۔ یہ دیکھتے ہی براءؓ قلعے کی دیوار کی طرف لپکے اور جھپٹ کر اس زنجیر کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا جوان کے بھائی کو اُٹھائے لیے جارہی تھی، وہ اس کو اپنے بھائی کے جسم سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کوشش میں ان کے دونوں ہاتھ بری طرح جل گئے مگر انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور اپنے بھائی کو اس انکس کی گرفت سے چھڑائے بغیر زنجیر کو اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ بھائی کو نجات دلانے کے بعد وہ زمین پر گر پڑے اس وقت ان کے ہاتھوں کا سارا گوشت جل چکا تھا۔ اور صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔

اس غزوہ کے موقع پر حضرت براء بن مالکؓ نے دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو نعمتِ شہادت سے بہرہ ور فرمائے ان کی یہ دُعا بارگاہِ رب العزت میں

شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی اور ان کی وہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی جس کو وہ مدتوں سے اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں شہید ہو کر گرے اور دیدارِ خداوندی کی بیش بہا اور قابلِ رشک نعمت سے سرفراز ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت براء بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ کے چہرے کو جنت میں شگفتہ اور تر و تازہ رکھے اور اپنے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ ان سے راضی ہو جائے اور ان کو خوش کر دے۔ آمین۔
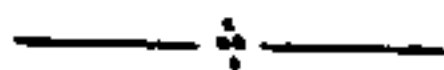
اُمُّ المومنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا

حضرت ام سلمہؓ غیر معمولی شرف وفضیلت کی حامل خاتون تھیں۔ ان کے والد کا شمار قبیلۂ بنی مخزوم کے مشہور اور اہم سرداروں اور عرب کے معدودے چند اصحابِ جود وسخا میں ہوتا تھا ، وہ اپنی سخاوت و فیّاضی کی وجہ سے "زادالراکب" کے لقب سے مشہور تھے۔ کیوں کہ ان کے علاقے کا قصد کرنے والے قافلے اور ان کی معیّت میں سفر کرنے والے مسافر کبھی اپنے ساتھ زادِ راہ لے کر چلنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے جو بالکل آغازِ دعوت کے زمانے میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان سے پہلے صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان چند لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا جن کی تعداد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بھی کم تھی۔ ان کا نام ہند بنت ابی اُمیّہ تھا، لیکن ان کی کنیت "ام سلمہ" ان کے نام سے زیادہ مشہور تھی۔

وہ اپنے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کے ساتھ ہی اسلام لائیں۔ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والی دوسری خاتون تھیں۔ یہ شرف ان سے پہلے صرف حضرت خدیجہؓ کو حاصل تھا۔ جیسے ہی ان کے اور ان کے شوہر کے مسلمان ہونے کی خبر قریش کو ملی، وہ غصّے سے آگ بگولہ ہوگئے ، ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہوگیا اور انہوں نے ان دونوں کو ایسی اذیت ناک اور عبرت انگیز سزائیں دینے کا سلسلہ شروع کردیا جو مضبوط چٹانوں کو ہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ لیکن انہوں نے ان سزاؤں کے سامنے نہ تو کسی ضعف و کمزوری

کا اظہار کیا نہ ہمت ہاری، نہ کسی قسم کے تردد و تذبذب میں مبتلا ہوئے۔
جب اذیت رسانی کا یہ سلسلہ سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ تو یہ دونوں ہجرت کرنے والے "قافلہ مہاجرین" میں پیش پیش تھے۔ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر اجنبی دیار اور انجانے علاقے کی طرف چل پڑے اور اپنے پیچھے مکہ میں اپنا عالی شان مکان، اپنا بلند مقام اور اپنی خاندانی شرافت چھوڑ گئے۔ وہ اپنے اس عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کے خواہاں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالب تھے۔
اگرچہ حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر کو نجاشی (شاہِ حبشہ) کی حمایت و سرپرستی میں نہایت سکون و اطمینان کی زندگی نصیب ہوئی تھی مگر اس کے باوجود مہبط وحی (مکہ) واپس جانے اور سرچشمۂ ہدایت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے دیدار کی آرزو ان کے دلوں کو ہر وقت مضطرب اور بے چین رکھتی تھی۔ اور پھر جب سرزمین حبشہ میں مقیم مہاجرین کے پاس مسلسل اس طرح کی خبریں آنے لگیں کہ مکہ میں مسلمانوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا ہے، حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت عمرؓ بن خطاب کے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی طاقت کافی بڑھ گئی ہے اور قریش کی اذیت رسانیوں اور ان کے ظلم و ستم کا زور بڑی حد تک ٹوٹ چکا ہے۔ تو ان میں سے کچھ لوگوں نے مکہ واپس لوٹ جانے کا ارادہ کرلیا۔ دیارِ حرم میں پہنچنے کا شوق اور بارگاہِ رسالت میں حاضری کا اشتیاق انہیں کھینچے لیے جارہا تھا چنانچہ واپسی کے اس سفر میں بھی حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر سب سے آگے تھے۔ لیکن واپس آنے والوں پر بہت جلد یہ بات منکشف ہوگئی کہ ان کے

پاس اس سلسلے میں جو خبریں پہنچی تھیں، ان میں بہت زیادہ مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں نے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد جو تھوڑی سی پیش قدمی کی تھی، قریش کی طرف سے اس کی شدید مزاحمت ہوئی ہے۔

اس کے بعد مشرکین نے مسلمانوں کو ستانے اور ان کو خوف زدہ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور ان کے ظلم و ستم کی چکی پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو ہجرت کر کے مدینہ چلے جانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اور حضرت ام سلمہؓ اور ان کے شوہر نے قریش کی اذیتوں سے نجات حاصل کرنے اور اپنے دین کی حفاظت کے خیال سے جلد از جلد ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر یہ کام ان کے لیے اتنا آسان نہ تھا جتنا وہ گمان کرتے تھے۔ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کو ایسے سخت اور المناک حالات سے گزرنا پڑا جن کے سامنے تمام سختیاں ہیچ نظر آتی ہیں۔ ہم ہجرت کی یہ المناک داستان خود حضرت ام سلمہؓ کی زبانی بیان کرتے ہیں کیونکہ اس سلسلے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور ان کی تصویر کشی زیادہ مکمل ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ـــ

"جب ابو سلمہؓ نے مکے سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی ٹھانی تو انہوں نے میرے لیے سواری کا اونٹ تیار کیا، مجھے اس پر سوار کیا اور میرے بچے سلمہ کو میری گود میں ڈالا اور کسی چیز کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اونٹ کی نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم مکّہ سے باہر نکلتے، میرے قبیلہ (بنی مخزوم) کے کچھ لوگوں نے ہم کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہمارا

راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور ابو سلمہ سے کہنے لگے کہ "تم اپنے متعلق جو چاہو فیصلہ کرو مگر تمہاری بیوی سے تمہیں کیا سروکار؟ یہ ہماری بیٹی ہے ہم تم کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ اس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے در در کی ٹھوکریں کھلاتے پھرو۔" پھر وہ ان کے اُوپر جھپٹ پڑے اور مجھے زبردستی ان سے چھین کر الگ کر دیا۔ جب میرے شوہر ابو سلمہ کے قبیلے (بنو عبدالاسد) کے لوگوں نے یہ دیکھا کہ میرے قبیلہ والوں نے مجھے اور میرے بچّے کو ابو سلمہ سے چھین لیا ہے تو وہ نہایت غضبناک ہوئے اور کہنے لگے کہ "خدا کی قسم جب تم نے اپنے خاندان کی لڑکی کو ہمارے قبیلہ کے آدمی سے چھین لیا تو ہم بھی بچے کو اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ وہ ہمارے خاندان کا بچہ ہے اور ہم اس کے زیادہ حق دار ہیں۔" پھر میری آنکھوں کے سامنے ہی وہ میرے بچّے سلمہ کو اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اس کھینچا تانی میں اس کا ہاتھ بھی اُکھڑ گیا اور وہ اس کو چھین کر لے گئے۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا ہے اور میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ ایک طرف میرے شوہر اپنے دین اور اپنی جان کی حفاظت کے لیے مدینہ چلے گئے۔ دُوسری طرف میرے بچے کو بنو عبدالاسد نے جبراً مجھ سے چھین لیا اور میرے قبیلہ بنو مخزوم نے زبردستی مجھے اپنے پاس روک لیا۔ اس طرح ذرا سی دیر میں مجھے، میرے شوہر اور میرے بچّے کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا گیا۔

پھر حضرت ام سلمہؓ اپنی داستان کا اگلا حصّہ بیان کرتی ہیں۔

"اس کے بعد سے میرا روز مرّہ کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح سویرے مکّہ کے باہر ابطح کی طرف نکل جاتی اور اس جگہ جا کر بیٹھ جاتی جہاں میرے ساتھ یہ المیہ

پیش آیا تھا میں ان بیتی ہوئی گھڑیوں کو یاد کرتی رہتی، جب میرے شوہر اور بچے کے درمیان جدائی کی دیوار حائل کردی گئی تھی۔ میں برابر روتی رہتی یہاں تک کہ رات کے سائے گہرے ہو جاتے۔ میری یہ حالت ایک سال یا اس کے لگ بھگ رہی آخرکار میرے بنی عم میں سے ایک شخص کا گزر میری طرف سے ہوا، اس کو میرے اس حال زار پر ترس آیا۔ اور اس نے میرے قبیلہ والوں سے کہا کہ تم لوگ اس غریب کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تم نے اس کو اس کے شوہر اور بچے سے جدا کر کے اس کے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ وہ برابر ان کو میرے حق میں ہموار کرتا اور ان کے جذبۂ ترحم کو مہمیز کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ اس حد تک نرم ہو گئے کہ انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی اجازت دیدی۔ لیکن میرے لیے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ میں اپنے لختِ جگر کو مکہ میں بنی عبدالاسد کے یہاں چھوڑ کر خود اپنے شوہر کے پاس مدینہ چلی جاتی اور اس صورت میں جب کہ میں خود دارالہجرت (مدینہ) میں ہوں اور میرا کم سن بچہ مکہ میں اس حال میں پڑا ہو کہ اس کے متعلق مجھے کوئی خبر نہ ملے، کیسے ممکن تھا کہ میری ماما کی آگ ٹھنڈی ہو اور میری آنکھوں سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کا سیلاب تھم سکے، بعض لوگوں نے جب مجھ کو اس طرح رنج و غم جھیلتے اور کرب والم سے نبرد آزما ہوتے دیکھا تو ان کو میری حالت پر رحم آیا اور انہوں نے بنی عبدالاسد سے بات کر کے ان کو میرے ساتھ نرم رویہ اپنانے پر آمادہ کر لیا چنانچہ انہوں نے میرے بچے سلمہ کو مجھے واپس کر دیا"،

"اب میں نے مکہ میں ٹھہر کر مدینہ جانے والے کسی ہم سفر کے انتظار میں وقت گنوانا اور اپنی روانگی میں مزید تاخیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس اثنا میں کہیں کوئی ایسا حادثہ نہ پیش آجائے جو مجھے میرے شوہر

کے پاس پہنچنے سے روک دے۔ اس لیے میں نے جھٹ پٹ اپنی سواری کے اُونٹ کو تیار کیا، بچّے کو گود میں لیا اور اپنے شوہر سے ملنے کے لیے مدینہ کی طرف چل پڑی جب میں تنعیم کے مقام پر پہنچی تو میری ملاقات عثمانؓ[1] بن طلحہ سے ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "زاد الراکب" کی بیٹی! کہاں جا رہی ہو؟"

"اپنے شوہر کے پاس مدینہ جا رہی ہوں"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا تمہارے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"نہیں، خدائے تعالیٰ اور میرے اس بچے کے سوا میرے ساتھ دوسرا کوئی نہیں ہے؟" میں نے جواب دیا۔

"خدا کی قسم، جب تک تم مدینہ نہ پہنچ جاؤ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا"۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرے اُونٹ کی نکیل تھام لی اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ خدا کی قسم اس سے پہلے مجھے کبھی ایسے عرب کی صحبت نصیب نہیں ہوئی تھی جو ان سے زیادہ کریم النفس اور شریف ہو ان کا حال یہ تھا جب وہ کسی منزل پر پہنچتے تو وہ اُونٹ کو بٹھاتے اور خود مجھ سے پرے ہٹ جاتے۔ جب میں اُونٹ سے نیچے اُتر کر زمین پر ٹھیک سے کھڑی ہو جاتی تو وہ اُونٹ کے پاس آتے، کجاوہ اُتار کر زمین پر رکھ دیتے اور اُونٹ کو لے جا کر کسی درخت سے باندھ دیتے۔ پھر مجھ سے دُور کسی سائے میں لیٹ جاتے،

---

[1] عثمان زمانہ جاہلیت میں خانہ کعبہ کے کلید بردار تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، فتح مکہ میں شریک ہوئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بیت اللہ کی کنجی ان کے حوالے کی۔

جب روانگی کا وقت ہو جاتا تو وہ اُٹھ کر اونٹ کے پاس آتے اس کو تیار کر کے میرے قریب لاتے اور مجھے اس پر سوار ہونے کی اجازت دیتے ہوئے دُور ہٹ جاتے۔ جب میں سوار ہو کر اطمینان سے بیٹھ جاتی تو آتے اور اس کی نکیل پکڑ کر آگے آگے چل پڑتے۔ مدینہ پہنچنے تک راستہ بھر میرے ساتھ ان کا یہی رویّہ رہا۔ جب ان کی نظر بنی عوف بن عمرو کی بستی قباء پر پڑی تو بولے کہ "تمہارے شوہر اسی بستی میں ہیں۔ خدا کا نام لے کر چلی جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ واپسی کے لیے مکّہ کی طرف مُڑ گئے۔ بچھڑے ہوئے ایک طویل عرصے کی جُدائی کے بعد دوبارہ ہم ایک دوسرے سے ملے۔ حضرت ام سلمہ رضؓ کی آنکھیں اپنے شوہر کے دیدار سے ٹھنڈی ہوئیں، اور حضرت ابو سلمہ رضؓ کے دل کو اپنی بیوی اور بچّے کو پا کر قرار و سکون نصیب ہوا۔ اس کے بعد واقعات اور حوادث تیزی سے گزرتے رہے، یہ غزوۂ بدر ہے جس میں حضرت ابو سلمہ رضؓ شریک ہوئے اور فتح یاب و ظفر مند ہو کر مسلمانوں کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور یہ ہے معرکہ احد، جنگ بدر کے بعد حضرت ابو سلمہ رضؓ اس غزوہ میں بھی ایک بہادر کی طرح شریک ہوئے اور اس میں اپنی جرأت و شجاعت کے انمٹ نقوش چھوڑ آئے۔ جنگ سے واپس آئے تو ان کا جسم زخموں سے چور تھا۔ وہ برابر زخموں کا علاج کرتے رہے اور بظاہر ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ زخم مندمل ہو چکے ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ زخم بظاہر تو بھر گئے تھے مگر اندر ہی اندر خراب ہو گئے تھے۔ ایک دن اچانک پھٹ گئے اور حضرت ابو سلمہ رضؓ بستر سے لگ گئے! اسی زمانے میں جب وہ اپنے زخموں کے ساتھ کشمکش میں مصروف تھے۔۔۔ ایک دن اپنی بیوی سے بولے کہ ام سلمہ رضؓ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے۔

لا یصیبُ احدًا مُصیبۃٌ فیسترجعُ عند ذالكَ یقولُ اَللّٰھمّ عندك اَحتسبُ مُصیبَتی ھٰذہ ۔ اَللّٰھمّ اخلفنی خیراً منھا، اِلا اعطاہُ اللہ عزّوجلّ ....."

" جو شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کے وقت اُنا للہ وانا الیہ راجعون ' پڑھے اور دُعا کرے کہ خدایا! میں تجھ سے ہی اس مصیبت کا اجر چاہتا ہوں ۔ الٰہی تو مجھے اس کا بہترین نعم البدل عطا فرما ۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تلافی مافات کی بہترین صورت پیدا فرما دیتا ہے ۔"

حضرت ابوسلمہؓ کئی روز تک بستر علالت پر پڑے رہے ۔ اسی دوران ایک دن صبح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے ۔ آپؐ دروازے میں داخل ہوئے اور ابھی اچھی طرح ان کو دیکھ بھی نہیں سکے تھے کہ انہوں نے زندگی کو خیرباد کہہ دیا ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کی آنکھوں کو بند کیا اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھاتے ہوئے ان کے لیے دعاء کی ۔

اَللّٰھمّ اغفر لِاَبی سَلمۃ وارفع درجتہ فی المُقرّبیْن واخلفہُ فی عَقبہ فی العابرین واغفر لَنا ولَہُ یاربّ العَالمینَ وافسح لہ فی قبرہٖ ونوّر لہ فیہ ۔

اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما دے ۔ مقربین میں ان کو بلند مرتبہ عطا کر اور ان کے پس ماندگان میں ان کا قائم مقام ہو جا ۔ رب العالمین! ہماری اور ان کی مغفرت فرما ، ان کی قبر کو کشادہ اور منور کر ۔

ادھر جب حضرت ام سلمہؓ کو وہ دعا یاد آئی ۔ جو حضرت ابوسلمہؓ نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بتائی تھی تو انہوں نے کہا ۔

اَللّٰھم عندك احتسب مصیبتی ھٰذہ لیکن ان کا دل اَللّٰھم اخلفنی فیھا خیراً منھا کہنے پر آمادہ نہ ہو رہا تھا ۔ وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں کہ ابوسلمہ

سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو نعم البدل کے طور پر طلب کیا جائے.... لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے دعا مکمل کر دی۔

حضرت ام سلمہؓ کی اس مصیبت پر مسلمانوں نے غیر معمولی صدمہ و افسوس کا اظہار کیا، انہیں "ایّم العرب" کے لقب سے نوازا۔ کیونکہ مدینہ میں ان کے ننھے بچّوں کے سوا ان کے اہل قبیلہ و خاندان میں سے ان کا کوئی قریبی سرپرست اور ہمدرد نہ تھا۔

مہاجرین و انصار دونوں نے بیک وقت اپنے اوپر حضرت ام سلمہؓ کے حق کو محسوس کیا۔ اور ان کی عدت وفات گزرتے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا۔ مگر انہوں نے ان کا پیغام منظور نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر فاروقؓ نے ان کے ساتھ نکاح کی پیش کش کی مگر انہوں نے حضرت عمرؓ کے پیغام کو بھی اسی طرح رد کر دیا جس طرح وہ حضرت ابوبکرؓ کے پیغام کو نامنظور کر چکی تھیں۔ پھر جب خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے پیغام دیا تو حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ ــــ

"اے اللہ کے رسُول! میرے اندر تین ایسی خصلتیں ہیں جو شاید آپؐ کو پسند نہ آئیں پہلی بات یہ ہے کہ میں انتہائی غیرت مند اور خود دار عورت ہوں، مجھے اندیشہ ہے کہ میری کوئی بات آپؐ کی طبع مبارک کو ناگوار گزر جائے گی اور آپؐ مجھ سے ناراض ہو جائیں تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے سزا دے گا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ میں ایک سن رسیدہ عورت ہوں۔ اور تیسری یہ کہ میں بال بچوں والی عورت ہوں۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ باتیں سُن کر ارشاد فرمایا کہ ــــ

"یہ جو تم نے اپنی غیرت مندی اور خود داری کی بات کہی ہے تو میں

اِس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہارے اندر سے اس کو دُور کردے اور جہاں تک سن رسیدگی کی بات ہے تو اس میں میری حالت تم سے مختلف نہیں ہے۔ اور یہ جو تم نے بال بچوں کا ذکر کیا ہے تو اس کے لیے کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے بچے میرے بچے ہیں۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہؓ سے نکاح کرلیا اور ان کی وہ دعا مجسّم قبولیت بن کر سامنے آگئی جو انہوں نے اپنے شوہر کے انتقال کے وقت کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ابو سلمہؓ کا نعم البدل عطا فرمادیا۔ اور اس وقت سے ہند بنت ابی امیہ مخزومیہ صرف سلمہؓ کی ماں نہیں رہ گئیں بلکہ تمام مسلمانوں کی ماں ہوگئیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت ام سلمہؓ کے چہرے کو جنت میں تروتازہ اور بارونق رکھے، ان سے راضی رہے اور ان کو راضی رکھے۔ آمین

حضرت ثُمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہٗ

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۶ھ میں دعوت اسلامی کے دائرے کو وسیع کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اس کے لیے آپؐ نے عرب وعجم کے حکمرانوں کو آٹھ دعوتی خطوط لکھے۔ آپؐ نے جن حکمرانوں کے پاس یہ خطوط ارسال فرمائے تھے، ان میں سے ایک ثمامہ ابن اثال حنفی بھی تھا۔ ثمامہ کو اہم حکمرانوں میں شامل کرنا اور اس کے یہاں دعوتی خط روانہ کرنا حیرت انگیز اور قابل تعجب اس لیے نہیں تھا کہ وہ نہایت بااثر اور اہم شخصیت کا مالک تھا۔ وہ دورِ جاہلیت میں عرب کا ایک حکمران، بنو حنیفہ کا ایک سربرآوردہ رئیس اور علاقۂ یمامہ کے ان بادشاہوں میں سے تھا جن کی کوئی بات ٹھکرائی نہیں جاتی۔

جب ثمامہ کے پاس رسُول صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام پہنچا تو اس نے اس کے ساتھ نہایت توہین آمیز اور غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنایا۔ جھوٹے پندار اور جاہلانہ غرور نے اس کو گناہ پر جما دیا اور اس نے دعوتِ حق سے اپنے کان بند کر لیے پھر شیطان اس پر سوار ہو گیا اور برابر اسے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے ان کی دعوت کو نیست ونابود کر دینے پر انگیختہ کرتا رہا۔ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر بے خبری کی حالت میں اچانک حملہ کر کے آپؐ کا کام تمام کر دینا چاہتا تھا اور اپنے اس ناپاک منصوبے کی تکمیل کے لیے وہ کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اور اگر اس کے چچا نے عین وقت پر اس کو اس منصوبے پر عمل کرنے سے روک نہ دیا ہوتا تو اس کا یہ گھناؤنا جرم پایۂ تکمیل

کو پہنچ گیا ہوتا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔ ثمامہ اگرچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادۂ قتل سے باز آگیا۔ لیکن وہ آپؐ کے صحابہؓ کو قتل کرنے کے ارادے سے دست بردار نہیں ہوا۔ وہ برابر ان کی تاک میں لگا رہا۔ آخر کار وہ چند صحابہ پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اور ان کو نہایت دردناک طریقے سے قتل کر ڈالا ہا اس وجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ میں اس بات کا اعلان فرما دیا کہ وہ جہاں کہیں ملے، قتل کر دیا جائے صحابہؓ کے قتل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے کچھ ہی دنوں بعد ثمامہ نے عمرہ ادا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس ارادے سے وہ اپنے علاقۂ یمامہ سے مکہ کی سمت روانہ ہوا، وہاں پہنچ کر وہ کعبہ کا طواف اور اس میں رکھے ہوئے بتوں کے لیے قربانی کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اپنے اس سفر کے دوران وہ مدینہ کے قریب ایک راستے سے گزرتے ہوئے اچانک ایک ایسی آفت میں پھنس گیا جس کا اسے وہم وگمان تک نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوتے کچھ مسلمانوں پر مشتمل ایک فوجی دستے نے ــ جو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں کوئی شر پسند رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر مدینہ کے باشندوں کو نقصان نہ پہنچا دے ــــ ثمامہ کو دیکھا اور اسے گرفتار کرلیا۔ (حالانکہ ان میں سے کوئی بھی اس کو پہچانتا نہ تھا) اور اس کو مدینہ لائے، اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس قیدی کے حالات سے واقفیت حاصل کرکے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ صادر فرمائیں گے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے مسجد کی طرف آئے اور اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو آپؐ کی نظر ثمامہ پر پڑی جو ستون سے بندھا ہوا تھا۔ آپؐ

نے صحابۂ کرامؓ سے دریافت فرمایا۔
" جانتے ہو تم لوگوں نے کس کو گرفتار کیا ہے؟"
" نہیں اے اللہ کے رسولؐ! ہم اس سے واقف نہیں ہیں"۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔
" یہ قبیلۂ بنی حنیفہ کا سردار ثمامہ ابن اثال ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا"۔ آپؐ نے قیدی کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ پھر آپؐ واپس گھر تشریف لے گئے اور گھر والوں سے کہا کہ " تمہارے پاس جو بھی کھانا ہو، اسے جمع کر کے ثمامہ ابن اثال کے پاس بھیج دو"۔ پھر آپؐ نے ہدایت فرمائی کہ " میری اونٹنی کا دودھ صبح و شام دوہ کر اس کو پیش کیا جائے پھر آپؐ ثمامہ کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے خیال سے اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس سے پوچھا کہ
" ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے۔ تم ہماری طرف سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"
" میں آپ کے متعلق اچھا گمان اور آپ سے اچھے برتاؤ کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن اگر آپ میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص کو قتل کرائیں گے جو قتل کا مجرم ہے۔ اور اگر احسان کر کے مجھے چھوڑ دیں تو ایک احسان شناس کو اپنا ممنونِ کرم پائیں گے۔ اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو وہ بھی فرمائیے جتنا مال چاہیں گے، دیا جائے گا"۔ اس نے جواب دیا۔
اس گفتگو کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کو اس کے حال پر چھوڑا اور دو روز تک اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس دوران اس کے پاس حسب معمول کھانے پینے کی چیزیں اور اونٹنی کا دودھ برابر پہنچتا رہا۔ دو دن بعد رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر اس کے پاس تشریف لائے اور وہی سوال کیا۔

"ثمامہ! تمہارا کیا خیال ہے۔ تم ہم سے کس قسم کے سلوک کی توقع رکھتے ہو؟"

اس نے جواب دیا۔

"میرے پاس کہنے کی وہی باتیں ہیں جو اس سے پہلے میں کہہ چکا ہوں۔ اگر آپ میرے اوپر احسان کرتے ہیں تو ایک ایسے شخص پر احسان کریں گے جو اس کی قدر پہچانتا ہے اور اگر میرے قتل کا فیصلہ کرتے ہیں تو آپ کا یہ فیصلہ حق بہ جانب ہوگا کیونکہ میں آپ کے آدمیوں کو قتل کرکے اس کا مستحق قرار پا چکا ہوں اور اگر آپ کو مال کی خواہش ہے تو بتائیے، جو چاہیں گے آپ کو پیش کیا جائے گا۔"

اس موقع پر بھی آپؐ نے اس سے مزید کچھ نہیں کہا بلکہ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ البتہ اگلے روز آپؐ پھر اس کے پاس گئے اور پھر وہی سوال دہرایا۔

"ثمامہ! تم کو ہماری طرف سے کس برتاؤ کی اُمید ہے؟"

اور اس نے بھی حسب سابق وہی جواب دیا۔

"اگر آپ میرے اُوپر احسان کرتے ہیں تو ایک احسان شناس شخص پر احسان کریں گے اور اگر مجھے قتل کرا دیتے ہیں تو میں اس کا مستحق ہوں اور اگر آپ کو مال کی ضرورت ہو تو فرمائیے، آپ کا مطلوبہ مال میں آپ کو پیش کردوں گا۔"

اس سوال وجواب کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "ثمامہ کو رہا کردو۔" اور حسب ارشاد اس کی زنجیریں کھول دی گئیں۔ رہائی پاکر ثمامہ مسجد سے نکلا اور مدینہ کے باہر بقیع کے

قریب واقع کھجوروں کے ایک باغ میں گیا جس میں کنواں تھا۔ اپنی سواری کو اسی کنویں کے پاس بٹھا کر اس کے پانی سے خوب اچھی طرح غسل کیا اور پاک صاف ہو کر پھر اسی راستے سے چل کر مسجد میں واپس آگیا۔ اس نے مسجد میں مسلمانوں کی ایک مجلس کے قریب پہنچ کر بہ آواز بلند کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"اے محمدؐ! خدا کی قسم روئے زمین پر کوئی چہرہ میرے نزدیک آپ کے چہرے سے زیادہ مبغوض اور قابل نفرت نہ تھا۔ مگر اب یہ مجھے ہر چہرے سے زیادہ محبوب ہے۔ اور خدا کی قسم آپ کے دین سے زیادہ قابل نفرت میرے نزدیک کوئی دین نہ تھا۔ لیکن اب یہ مجھے تمام ادیان سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور خدا کی قسم آپ کے شہر سے زیادہ ناپسندیدہ میرے نزدیک کوئی دوسرا شہر نہیں تھا مگر اب آپ کا یہ شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ پسند ہے۔"

تھوڑی دیر رک کر پھر بولے۔

"میں نے آپ کے کچھ ساتھیوں کو قتل کیا ہے۔ اس کی تلافی کے لیے آپ میرے اوپر کیا عائد کرتے ہیں؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ثمامہ! اس سلسلے میں تمہارے اوپر نہ قصاص ہے نہ دیت۔ کیونکہ اسلام نے تمہاری تمام سابقہ زیادتیوں اور غلط کاریوں کو حرف غلط کی طرح محو کر دیا ہے۔"

پھر آپؐ نے اسلام لانے کی وجہ سے جنت کی خوشخبری دی۔ ان کا چہرہ فرط مسرت سے چمک اٹھا۔ کہنے لگے کہ "خدا کی قسم میں نے آپ کے جتنے صحابہ کو قتل کیا ہے اس سے کئی گنا تعداد میں مشرکین کو قتل کروں گا۔ اور اپنی ذات کو، اپنی تلوار کو اور ان لوگوں کو جو میرے ماتحت اور ہم نوا ہیں۔ آپ کی اور آپ کے دین کی نصرت و تائید کے لیے وقف کرتا ہوں۔"

قدرے توقف کے بعد پھر کہا۔ "اے اللہ کے رسولؐ آپ کے سواروں

نے مجھے اس وقت گرفتار کیا تھا جب میں عمرہ کی نیت سے نکلا تھا۔ تو آپ کے خیال میں اب مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔" رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "تم مکّہ جاکر عمرہ ادا کرلو۔ مگر یہ عمرہ اب تم اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے مطابق ادا کروگے۔" پھر آپ نے مناسک حج اور افعال عمرہ کی تعلیم دی۔

حضرت ثمامہؓ ابن اثال عمرہ کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئے، جب بطن مکّہ میں پہنچے تو وہیں کھڑے ہوکر بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا شروع کردیا۔

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ۔ لَاشَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔

میں حاضر ہوں، خدایا میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں حاضر ہوں۔ بیشک ساری تعریفیں اور تمام نعمتیں تیرے لیے ہیں۔ اور اقتدار تیرا ہے تیرا کوئی شریک نہیں۔

وہ دنیا کے سب سے پہلے مسلمان تھے جو تلبیہ پڑھتے ہوئے مکّہ میں داخل ہوئے تھے۔ قریش کے لوگ اس ناگہانی اور غیر متوقع آواز کو سُن کر سہم گئے اور غضبناک ہوکر دوڑے۔ انھوں نے اپنی تلواریں بے نیام کرلیں آواز کی طرف لپکے تاکہ اس شخص پر ٹوٹ پڑیں جو ان کے کچھار میں گھس آیا تھا۔ وہ لوگ ثمامہ کی طرف بڑھے تو انہوں نے تلبیہ کی آواز اور تیز کردی۔ وہ ان کی طرف نہایت لاپرواہی اور بے خوفی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ایک قریشی جوان نے تیر چلاکر ان کو قتل کرنا چاہا۔ مگر دوسروں نے اس کو یہ کہتے ہوئے ایسا کرنے سے روک دیا کہ "تیرا بُرا ہو۔ جانتا ہے یہ کون ہے؟ یہ یمامہ کا بادشاہ ثمامہ ابن اثال ہے۔ اگر تم نے اس کو کوئی نقصان پہنچایا تو اس

کے قبیلے والے ہمارے یہاں غلّے کی برآمد روک کر ہم کو بھوکوں ماردیں گے۔"
پھر وہ لوگ اپنی تلواریں میان میں کر کے حضرت ثمامہؓ کے سامنے آئے اور ان سے بولے۔

"ثمامہ! یہ تم کو کیا ہوگیا ہے۔کیا تم بے دین ہوگئے ہو اور تم نے اپنا اور اپنے آباء و اجداد کا دین ترک کر دیا ہے؟"

"نہیں میں بے دین نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے سب سے اچھے دین، محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کرلی ہے۔" حضرت ثمامہؓ نے جواب دیا اس کے بعد انھوں نے کہا کہ۔

"اس گھر والے کی قسم، میرے واپس جانے کے بعد یمامہ کے گیہوں کا ایک دانہ اور وہاں کی پیداوار کا کوئی حصّہ اس وقت تک تمہارے یہاں نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ تم سب کے سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ اختیار کرلو۔"

حضرت ثمامہؓ نے قریش کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمرہ کے ارکان ادا کیے۔ انہوں نے غیر اللہ اور بتوں کے لیے نہیں، خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربانی کے جانور ذبح کیے اور واپس اپنے وطن لوٹ آئے۔ واپس آکر انہوں نے اپنے قبیلہ والوں کو قریش کے یہاں غلّے کی سپلائی روک دینے کا حکم دیا۔ قبیلہ والوں نے ان کے اس حکم کی تعمیل کی اور اہل مکہ کے یہاں اپنی پیداوار کی سپلائی بند کر دی۔

اقتصادی پابندی جو ثمامہؓ ابن اثال نے قریش کے خلاف لگائی تھی، بتدریج سخت سے سخت تر ہوتی چلی گئی۔ اس کے نتیجے میں غلّے کی قیمتوں میں غیرمعمولی اضافہ ہوگیا، لوگوں میں فاقہ کشی عام ہوگئی اور ان کی تکلیف اور پریشانی زیادہ بڑھ

گئی۔ اور جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کو اپنے اور بال بچوں کے بھوک سے مرجانے کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا تو انہوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا۔

"ہم آپ کے متعلق پہلے سے یہ بات جانتے ہیں کہ آپ صلہ رحمی کرتے اور دُوسروں کو اس کی تاکید کرتے ہیں۔ مگر اس وقت ہم جس صورتِ حال کا سامنا کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ نے ہمارے ساتھ قطع رحمی کا طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے۔ آپ نے باپوں کو تلوار سے قتل کیا اور بیٹوں کو بھوکوں مار رہے ہیں۔ ثمامہؓ ابن اثال نے غلّے کی برآمد پر پابندی لگا کر ہمیں سخت تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو لکھ دیں کہ وہ غلّہ وغیرہ ہماری ضرورت کی چیزوں پر عائد کردہ پابندی ختم کر دیں۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثمامہؓ کو لکھ دیا کہ وہ قریش کے خلاف پیداوار کی برآمد پر لگائی ہوئی بندش ختم کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے آپؐ کے حکم کے مطابق وہ پابندی اُٹھالی۔ اور قریش کے یہاں غلّے کی سپلائی جاری کر دی۔

حضرت ثمامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ زندگی بھر اپنے دین کے وفادار اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوئے عہد کے پابند رہے۔ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور اہل عرب اجتماعی اور انفرادی طور پر اللہ کے دین سے نکلنے لگے اور مسیلمہ کذاب نے بنو حنیفہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے انھیں اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت دینی شروع کی تو حضرت ثمامہؓ اس کے سامنے ڈٹ گئے۔ انھوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ "بنو حنیفہ کے لوگو! خبردار اس گمراہ کن دعوت کو ہرگز قبول نہ کرنا جس میں

نورِ ہدایت کا دُور دُور تک پتہ نہیں ہے۔ خُدا کی قسم یہ شقاوت و بدبختی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہم میں سے ان لوگوں پر مسلط کیا ہے جو اسے اختیار کریں اور زبردست امتحان و آزمائش ہے ان لوگوں کے لیے جو اس سے اجتناب کریں۔"

انہوں نے مزید فرمایا۔

" بنو حنیفہ والو! ایک وقت میں دو نبی نہیں ہو سکتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں، ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، نہ ان کی نبوت میں کسی کو شریک کیا گیا ہے۔"

حٰمٓ۔ تَنْزِیْلُ الکتاب من اللہ العزیز الحکیم غافر الذّنب و قابل التوب۔ شَدِیدِ العِقَابِ ذِی الطَّولِ۔ لَا اِلٰہ اِلَّا ھُوَ وَ الیہِ المصِیْرُ

ح۔م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست ہے، سب کچھ جاننے والا گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ سخت عذاب دینے والا اور بڑا صاحبِ فضل ہے۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

پھر فرمایا کہ کہاں اللہ کا یہ عظیم کلام اور کہاں مسیلمہ کذّاب کا قول۔

"یا ضِفْدَعُ نِقّی ما تنقین۔ لا الشراب تمنعین ولا الماء تُکَدِّرِیْنَ۔

اے مینڈک! تم جتنا چاہو ٹرٹر کرتے رہو۔ اپنی اس ٹرٹر سے نہ تم پینے سے روک سکتے نہ پانی کو گدلا کر سکتے ہو!"

پھر وہ اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو لے کر الگ ہو گئے جو اسلام پر ثابت قدم رہ گئے تھے اور راہ خدا میں جہاد اور اس کے دین کو زمین پر غالب کرنے کے لیے مرتدین کے ساتھ جنگ و قتال میں مشغول

ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ حضرت ثمامہ ابن اثال رضی اللہ عنہ کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین جزا دے اور اس جنت سے نوازے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔

حضرت ابوایّوب انصاری رضی اللہ عنہ

اِس جلیل القدر صحابی کا اسمِ گرامی خالد بن زید ابن کلیب تھا، ان کی کنیت ابوایوب تھی اوران کا تعلق انصار کے قبیلہ بنو نجّار سے تھا۔ ہم مسلمانوں میں سے کون ہے جو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ناواقف ہو! اللہ تعالیٰ نے سارے مسلمانوں کے مکانات کو چھوڑ کر ان کے مکان کو اس وقت اپنے رسولؐ کے قیام کے لیے منتخب فرماکر، جب وہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ منوّرہ تشریف لائے، ان کے ذکر کو سارے عالم میں مشہور اور ان کے مقام کو ساری مخلوق میں بلند کر دیا اور تنہا یہی ایک بات ان کے فخر کے لیے کافی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں نزولِ اجلال فرمانے کی داستان بڑی دلکش اور شیریں داستان ہے جس کا ذکر کانوں کو ہر بار ایک نئی اور عجیب لذّت سے آشنا کر جاتا ہے۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ پہنچے تو اس کے باشندوں نے ادب واحترام اور عقیدت ومحبّت سے بھرے ہوئے دل ونگاہ کو فرشِ راہ کردیا۔ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیے کہ آپ ان کی گہرائیوں میں اُتر جائیں۔ اُنھوں نے اپنے گھروں کے پٹ وا کردیے کہ آپؐ ان کے اندر پوری عزت وتوقیر کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز مدینے کی مضافاتی بستی قبا میں گزارے اس دوران آپؐ نے وہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ وہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد تقوے پر رکھی گئی تھی۔ پھر

آپؐ وہاں سے اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر نکلے اور یثرب کے تمام بڑے بڑے سردار اس کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے دل میں یہ حسین آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں قیام کرنے پر آمادہ کرنے کا شرف حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ تمام سردارانِ یثرب باری باری اونٹنی کے آگے کھڑے ہو جاتے اور اس کا راستہ روک کر عرض کرتے:

"اے اللہ کے رسول! آپؐ ہمارے یہاں قیام فرمائیں۔ ہم اپنی قوت، سازوسامان اور کثیر افراد کے ذریعے آپ کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔"

لیکن آپؐ ہر ایک کو جواب دیتے کہ "اسے چھوڑ دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔"

اونٹنی اپنی متعین منزل کی طرف بڑھتی رہی اور پُرشوق نگاہیں، آرزومند قلوب کے جلو میں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ جب وہ کسی مکان کے سامنے پہنچ کر اس سے آگے نکل جاتی تو اس کے مکینوں پر حزن وملال طاری ہو جاتا۔ ان کے اوپر مایوسی و ناامیدی مسلط ہو جاتی اور ان کے بعد والوں کے دلوں میں امید کی شمع جگمگا اٹھتی تھی۔ اونٹنی اسی طرح ایک ایک کر کے مختلف گھروں کے سامنے سے گزرتی رہی اور لوگ اپنی محرومی پر غم واندوہ کی تصویر بنے اس خوش بخت کو جاننے کے شوق میں، جس کے حصے میں یہ نعمت سرمدی آنے والی تھی، اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ حتّٰی کہ اونٹنی حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مکان کے سامنے خالی پڑے ہوئے میدان میں پہنچ کر بیٹھ گئی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی پشت سے اُتر کر نیچے تشریف نہیں لائے۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اُٹھی اور آگے چل پڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نکیل ڈھیلی چھوڑ دی۔ چند قدم چل کر اونٹنی مڑی اور واپس آ کر دوبارہ اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں پہلی بار بیٹھی

تھی۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا دل فرحت و انبساط سے لبریز ہو گیا اور وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ لپکے۔ اُنھوں نے آپ کا سامان اُٹھا لیا اور اسے خوشی خوشی اپنے گھر میں اس طرح لائے جیسے دُنیا کا سارا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہو۔

حضرت ابو ایوبؓ کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے بالائی منزل کو اہلِ خانہ کے سازو سامان سے خالی کرا دیا تاکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں قیام فرمائیں لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نچلی منزل کو بالائی منزل پر ترجیح دی اور اسے اپنے قیام کے لیے پسند فرمایا۔ حضرت ابو ایوبؓ نے آپؐ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور آپؐ کو اسی جگہ ٹھہرایا جسے آپؐ نے پسند فرمایا تھا۔

جب رات ہوئی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرمانے کے لیے اپنی خواب گاہ میں تشریف لے جا چکے تو حضرت ابو ایوبؓ اور ان کی اہلیہ بالائی منزل میں چلے گئے لیکن جیسے ہی اُنھوں نے دروازہ بند کیا معاً ان کے دل میں خیال آیا اور اپنی اہلیہ سے مخاطب ہوئے۔

"تمھارا بھلا ہو، یہ ہم نے کیا کیا؟ کیا یہ بات مناسب ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نیچے اور ہم ان سے اُوپر رہیں؟ کیا یہ بات ہم کو زیب دیتی ہے کہ ہم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر چلیں؟ کیا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وحیٔ الٰہی کے درمیان حائل ہونا ہمارے لیے زیبا ہے؟ آہ! اس صورت میں تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔"

اس وقت دونوں میاں بیوی سخت حیرانی و پشیمانی سے دوچار تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ وہ دونوں رات بھر بے چین رہے۔ آخر کار ان کو اس وقت تھوڑا سا سکون میسّر آیا جب وہ بالاخانے کے اس

گوشے میں سمٹ گئے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُوپر واقع نہیں تھا، وہ دونوں وہیں گوشہ گیر ہو گئے۔ اگر چلتے تو بیچ میں چلنے کے بجائے کنارے کنارے چلتے تھے۔ صبح کو حضرت ابوایوبؓ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ "آج رات میں نے اور اُمّ ایوب نے آنکھوں میں کاٹی ہے۔" آپؐ نے وجہ پوچھی تو عرض کیا ــــ

"اے اللہ کے رسُول! رات بھر ہم کو یہ احساس بے چین کیے رہا کہ ہم جس مکان کی بالائی منزل میں ہیں، آپ اس کے نیچے تشریف فرما ہیں اور جب ہم چلتے اور حرکت کرتے ہیں تو دھول اور گرد و غبار آپ کے اُوپر گر کر آپ کے لیے اذیت کا سبب بنتی ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ ہم آپ کے اور وحیِ الٰہی کے درمیان حائل ہو رہے ہیں۔"

"ابوایوب! اس کی فکر اور پرواہ مت کرو۔" رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "چونکہ بکثرت لوگ میرے پاس ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اس لیے نیچے ہی رہنا میرے لیے زیادہ مناسب اور آرام دہ ہے۔"

حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر دیا اور بالائی منزل میں قیام پذیر رہا۔ یہاں تک کہ ایک سرد رات کو ہمارا پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا اور اس کا پانی اوپری منزل کے فرش پر پھیل گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی اس کے پھیلے ہوئے پانی کو جذب کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت ہمارے پاس صرف ایک ہی کمبل تھا جس کو ہم لحاف کے طور پر استعمال کرتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں یہ پانی نیچے ٹپک کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث پریشانی نہ بن جائے، ہم نے اسی کمبل میں پانی کو جذب کر لیا۔ پھر صبح کے وقت میں نے بارگاہ رسالت میں

حاضر ہو کر عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ سے اُوپر رہوں اور آپ مجھ سے نیچے رہیں۔ پھر میں نے رات کو پیش آنے والا گھڑے کا واقعہ آپ کے گوش گزار کر دیا اور آپ سے بالائی منزل میں منتقل ہو جانے کی درخواست کی۔ آپ نے میری یہ درخواست منظور فرمائی اور اُوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے اور میں اُمِ ایوب کے ساتھ نیچے آ گیا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوبؓ کے مکان میں تقریباً سات مہینے تک قیام پذیر رہے۔ یہاں تک کہ جب اس زمین میں مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی جس میں اونٹنی بیٹھی تھی تو آپؐ ان حُجروں میں منتقل ہو گئے جو مسجد کے اردگرد آپ کے اور آپ کی ازواج مطہرات کے لیے بنائے گئے تھے اور آپؐ حضرت ابوایوبؓ کے پڑوس میں رہنے لگے۔ کتنے اچھے اور شریف پڑوسی تھے جو ان دونوں کو میسر آئے تھے۔

حضرت ابوایوبؓ، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان سے ایسی محبت تھی جس نے باہمی تکلفات کے سارے پردے درمیان سے اُٹھا دیے تھے۔ یہاں تک کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ گرمی کی ایک سخت دوپہر میں گھر سے نکل کر مسجد کی طرف آئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ "ابوبکر! آپ اس وقت گھر سے کیوں نکلے ہیں؟"

"بھوک کی شدت اور بے چینی کی وجہ سے!" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا۔
"خدا کی قسم میرے گھر سے نکلنے کا سبب بھی یہی ہے!" حضرت عمرؓ نے کہا۔

اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے حجرے سے تشریف لائے اور ان دونوں حضرات سے دریافت کیا۔ "آپ دونوں اس وقت کس غرض سے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے ہیں؟"

"واللہ ہم سب اس بھوک سے بے چین ہو کر نکلے ہیں جس کو ہم اپنے اندر شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔" دونوں نے جواباً عرض کیا۔

"اس ہستی کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں نے بھی اسی سے پریشان ہو کر گھر سے قدم نکالا ہے۔" آپ نے فرمایا "اٹھیے! میرے ساتھ چلیے۔" اور تینوں حضرات حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے یہاں پہنچے۔ حضرت ابوایوبؓ کا معمول تھا کہ وہ روزانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز بچا کر رکھتے تھے اور جب آپؐ کسی وجہ سے تاخیر کرتے اور وقت مقررہ پر تشریف نہ لاتے تو وہ کھانا گھر والوں کو کھلا دیتے۔ جب یہ لوگ دروازے پر پہنچے تو حضرت امّ ایوبؓ گھر سے نکل کر ان کے پاس پہنچیں اور بولیں۔ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب کی تشریف آوری ہماری عزت افزائی کا باعث ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ "ابوایوبؓ کہاں ہیں؟"

حضرت ابوایوبؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سن لی۔ وہ قریب ہی اپنے کھجوروں کے باغ میں کام کر رہے تھے۔ وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے لپکے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کا آنا ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔" پھر انھوں نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! یہ آپ کی تشریف آوری بے وقت کیسے ہوئی؟ آپ تو اس وقت کبھی تشریف نہیں لاتے تھے۔" حضورؐ نے فرمایا "ابوایوب تم ٹھیک کہتے ہو۔"

پھر حضرت ابو ایوبؓ باغ میں گئے اور اس میں سے کھجوروں کا ایک گچھا کاٹ لائے جس میں تمر، رُطب، اور بُسر ہر قسم کی کھجوریں لگی ہوئی تھیں۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا۔

"اسے کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیوں نہیں تم نے اس میں سے صرف پکّی ہوئی کھجوریں ہی توڑ لیں؟"

اُنھوں نے کہا کہ "میں نے مناسب سمجھا کہ آپؐ اس میں سے تمر، رُطب، اور بُسر ہر قسم کی کھجور اپنی پسند کے مطابق تناول فرمائیں۔ اِس کے علاوہ میں آپ کے لیے ایک بکری بھی ذبح کروں گا۔" تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر ذبح کرنا تو دُودھاری بکری مت ذبح کرنا۔"

پھر حضرت ابو ایوبؓ نے بکری کا ایک سالہ بچہ لیا اور اُسے ذبح کر دیا پھر اُنھوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: "ایوب کی ماں! آٹا گوندھ کر ہمارے لیے روٹیاں پکا لو۔ تم بہت عمدہ روٹیاں پکانا جانتی ہو۔"

اِس کے بعد اُنھوں نے آدھا گوشت پکایا اور آدھے کو بھون لیا۔ جب کھانا پک کر تیار ہو گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں ساتھیوں کے سامنے رکھ دیا گیا تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت میں سے ایک ٹکڑا لیا اور اس کو روٹی میں رکھ کر فرمایا "ابو ایوب! یہ ٹکڑا جلدی سے فاطمہ کو دے آؤ۔ اس کو کئی دنوں سے ایسا کھانا نہیں ملا ہے۔"

پھر جب سب لوگ کھا کر آسودہ ہو گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "روٹی، گوشت، تمر، رُطب اور بسر" یہ کہتے ہوئے آپ کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ پھر ارشاد فرمایا۔

"قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہی وہ نعمت ہے

جس کے متعلق قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا۔ تو جب تم کو اس قسم کی نعمت ملے اور تم اسے کھانے کے لیے اپنے ہاتھ میں لو تو کہو بسم اللہ اور جب آسودہ ہو جاؤ تو کہو۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَشْبَعَنَا وَاَنْعَمَ عَلَیْنَا فَاَفْضَلَ .	اللہ کا شکر ہے جس نے ہم کو آسودگی بخشی ہم کو انعام سے نوازا اور ہمارے اوپر مہربانی کی۔

پھر آپؐ جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلتے چلتے حضرت ابوایوبؓ سے فرمایا۔ "کل ہمارے پاس آنا" (آپؐ کا معمول تھا کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ احسان کرتا تو آپؐ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ اس کے احسان کا بدلہ چکادیں)۔ حضرت ابوایوبؓ حضورؐ کی یہ بات نہیں سن سکے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ:

" ابوایوب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کل تم میرے پاس آنا۔ حضرت ابوایوبؓ نے کہا کہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم میرے سر اور آنکھوں پر۔"

جب دوسرے دن حضرت ابوایوبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو ایک لونڈی (جو آپؐ کی خدمت کیا کرتی تھی) یہ کہتے ہوئے عنایت فرمائی " ابوایوب! اس کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا۔ یہ جب تک ہمارے یہاں رہی ہے ہم نے اس میں سوائے خیر کے کچھ نہیں دیکھا۔"

وہ لونڈی کو لیے ہوئے گھر لوٹے۔ جب اُمّ ایوبؓ نے دیکھا تو بولیں:

" ابوایوب! یہ لونڈی کس کی ہے؟"

"ہماری ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں عنایت فرمائی ہے"۔ انھوں نے جواب دیا۔

یہ سن کر اُمِّ ایوبؓ نے کہا "کتنا عظیم ہے عطا کرنے والا اور کتنا عمدہ ہے یہ عطیہ"۔

"اور آپؐ نے ہم کو اس کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے"۔ حضرت ابوایوبؓ نے دوبارہ کہا۔

"ہم اس کے ساتھ کون سا رویّہ اختیار کریں کہ آپؐ کی ہدایت پر پورا پورا عمل کرسکیں"۔ انھوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرنے کی اس سے بہتر دوسری کوئی صورت نہیں ہوسکتی کہ اس کو آزاد کردیں"۔ انھوں نے حل پیش کردیا۔

"آپ کو صحیح راہ سوجھی۔ آپ کو درست بات کی توفیق ملی"۔ حضرت اُمِّ ایوبؓ نے ان کی تائید کی۔ اور حضرت ابوایوبؓ نے لونڈی کو آزاد کردیا۔

یہ حضرت ابوایوبؓ کی عام اور روزمرّہ کی زندگی کی چند جھلکیاں تھیں۔ اگر آپ کو ان کی مجاہدانہ اور سرفروشانہ زندگی کی کچھ جھلکیاں دیکھنے کا موقع ملے تو یقیناً آپ حیرت واستعجاب سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک غازی اور مجاہد کی طرح گزاری۔ کہا جاتا ہے کہ وہ عہد نبوی سے لے کر دورِ معاویہؓ تک کسی غزوے سے پیچھے نہیں رہے۔ جو مسلمانوں کو پیش آیا، سوائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے محاذ پر برسرِ پیکار ہوں۔

وہ غزوہ حضرت ابوایوبؓ کا آخری غزوہ تھا۔ جب حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اپنے بیٹے یزید کی قیادت میں قسطنطنیہ

کی فتح کے لیے فوج بھیجی تھی۔ حضرت ابوایوبؓ اس وقت کافی عمر رسیدہ تھے۔ اس وقت ان کی عمر اسّی سال کے قریب تھی لیکن یہ کبر سنی ان کو یزید کی فوج میں شامل ہونے اور معرکۂ کارزار میں ایک مجاہد کی حیثیت میں داخل ہونے سے نہ روک سکی۔ وہ فوج میں ایک عام سپاہی کی طرح شریک ہوئے لیکن دشمن کے ساتھ جنگ چھڑے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے اوپر بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا جس نے ان کو شرکت جنگ سے معذور کر دیا۔ ان کی شدید علالت کی خبر پاکر قائدِ سپاہ اسلامی یزید بن معاویہؓ ان کی عیادت کے لیے آیا اور ان سے دریافت کیا۔

"ابوایوبؓ! آپ کی کوئی خواہش ہے؟"

"غازیانِ اسلام کو میرا سلام کہنا" حضرت ابوایوبؓ نے فرمایا۔ اور ان سے کہنا کہ ابوایوب کی وصیت ہے کہ دشمن کی سرحد میں اندر تک گھس جاؤ اور مجھے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاؤ اور میری لاش کو قسطنطنیہ کی فصیلوں کے نیچے دفن کر دو" یہ کہتے کہتے میزبانِ رسول نے آخری ہچکی لی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مجاہدین نے صحابیٔ رسول کی آخری خواہش اور وصیت کا پورا پورا احترام کیا۔ انھوں نے دشمن پر پے در پے اور شدید حملے کیے اور اسے دھکیلتے ہوئے فصیل شہر تک پہنچ گئے۔ وہ حضرت ابوایوبؓ کی لاش مبارک کو ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ وہاں ان کی وصیت کے مطابق قبر تیار کی گئی اور اس میں ان کو دفن کیا گیا ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

انھوں نے اس کے سوا اور کسی صورت کو پسند نہیں کیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں گھوڑے کی پیٹھ پر ان کو موت آئے۔ حالانکہ ان کی عمر اس وقت اسّی سال کے قریب تھی۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابو ایوبؓ پر رحم فرمائے اور ان سے راضی ہو۔ آمین۔
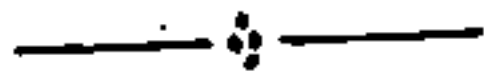
حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

عمرو بن جموح کا شمار دورِ جاہلیت میں یثرب کے زُعما میں ہوتا تھا۔ وہ قبیلہ بنو سلمہ کے ہر دل عزیز سردار، مدینے کے مشہور صاحب جود و سخا اور ارباب ثروت میں سے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں اشراف کی یہ امتیازی شان سمجھی جاتی تھی کہ ان میں سے ہر ایک اپنے لیے خاص طور سے الگ الگ بُت اپنے گھر میں رکھتا تھا تاکہ ہر صبح و شام اس سے برکت حاصل کرے۔ موسم حج میں اس کی خوشنودی حاصل کرے اور اظہار عقیدت کے طور پر اس کے لیے جانور ذبح کرے اور مصیبت اور پریشانی کی کٹھن گھڑیوں میں اس سے امان و پناہ کی درخواست کرے۔ اس وقت کے رواج کے مطابق عمرو بن جموح کے پاس بھی ایک بُت تھا جس کا نام "مناۃ" تھا۔ اس کو اُنھوں نے بہت قیمتی اور نفیس لکڑی سے بنایا تھا۔ عمرو بن جموح اس سے غیر معمولی عقیدت رکھتے، اس کے رکھ رکھاؤ کا بڑا اہتمام کرتے، اس کی دیکھ ریکھ کے لیے برابر فکر مند رہتے اور ہمیشہ اس کو نفیس ترین خوشبو سے معطر کیے رہتے تھے۔

آفتاب اسلام کی شعائیں جس وقت مبشر اوّل حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ذریعہ یثرب کے ایک ایک گھر پر ضوفگن ہو رہی تھیں، عمرو بن جموح کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اور اس وقت ان کے تینوں بیٹے معاذؓ، معوذؓ، خلادؓ اور ان کے ایک ہم جولی معاذؓ بن جبل ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام

ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ ان تینوں بیٹوں کے ساتھ ان کی ماں ہند بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں لیکن عمرو بن جموح اس سے بالکل بے خبر تھے۔

عمرو بن جموح کی بیوی نے دیکھا کہ اہلِ یثرب کی بڑی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا ہے اور ان کے شوہر اور معدودے چند لوگوں کے سوا قبائل کے سربرآوردہ سرداروں میں سے کوئی بھی اب شرک پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ہند اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرتی اور ان کا غیر معمولی احترام کرتی تھیں اور ان کے متعلق اس بات سے ڈرتی تھیں کہ اگر انہوں نے کفر کو نہیں چھوڑا اور اسی حال میں ان کو موت آگئی تو وہ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ ادھر عمرو بن جموح اپنے لڑکوں کے متعلق یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں یہ لوگ آباء واجداد کے دین کو چھوڑ کر اس داعیٔ اسلام مصعب بن عمیرؓ کی پیروی نہ اختیار کرلیں، جس نے قلیل مدّت میں بہت سے لوگوں کو ان کے دین سے پھیر کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل کرلیا ہے۔ اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اپنی بیوی سے کہا۔" ہند! دیکھو اس بات کا خیال رکھنا کہ جب تک ہم کسی فیصلے پر نہ پہونچ جائیں۔ تمہارے لڑکے اس شخص سے ملنے نہ پائیں!"

" میں اس کا خیال رکھوں گی!" ہند نے کہا۔" لیکن کیا آپ پسند کریں گے کہ اپنے بیٹے معاذ سے وہ باتیں سُن لیں جو اس شخص سے سُن کر بیان کر رہا ہے۔"

" تمہارا بھلا ہو، کیا وہ میری لاعلمی میں اپنے دین سے پھر گیا ہے؟" عمرو بن جموح نے پوچھا۔ نیک بیوی کو ان کے اُوپر ترس آیا اور انھوں نے جواب دیا۔

" نہیں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ وہ اس داعی کی مجلس میں شامل ہوا تھا اور

وہاں اُس نے اس کی کچھ باتیں سُن لی ہیں۔"

عمرو نے کہا۔" اس کو میرے پاس بلاؤ۔"

اور جب معاذ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ" یہ شخص جو کچھ کہتا ہے اس میں سے کچھ باتیں مجھے سناؤ۔" یہ سُن کر بیٹے نے باپ کو کلامِ الٰہی کے یہ دل نشیں بول پڑھ کر سنائے۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمد للّٰہ رب العلمین۔ الرحمٰن الرحیم۔ مالك یوم الدین۔ ایّاك نعبد و ایّاك نستعین۔ اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

شروع کرتا ہوں اس خدا کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ ساری تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو تمام عالم کا رَب ہے جو رحمان و رحیم اور روزِ جزا کا مالک ہے۔ خدایا! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ خدایا! صراطِ مستقیم کی طرف ہماری رہ نمائی فرما۔ ان لوگوں کے راستے کی طرف جن پر تو نے انعام فرمایا جو نہ تیرے غضب کے مستحق ہیں نہ گم کردہ راہ۔

عمرو بڑے غور و انہماک کے ساتھ اپنے بیٹے کی زبان سے ادا ہونے والے ان دل نشین بولوں کو سُنتے رہے پھر اُنہوں نے سر اُٹھایا اور بیٹے سے مخاطب ہوئے۔" کتنا خوب صورت اور حسین ہے یہ کلام کیا اس کا سارا کلام ایسا ہی ہے؟"

" اس کا کلام اس سے بھی خوب صورت ہے۔" معاذ نے کہا۔" ابا جان کیا آپ اس کی بیعت کرنا پسند کریں گے؟ آپ کا پورا قبیلہ اس کی بیعت کر چکا ہے۔"

یہ سُن کر بڑے میاں تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ پھر بولے۔

"مناۃ" سے مشورہ کیے بغیر میں ایسا نہیں کرسکتا۔ دیکھتا ہوں وہ مجھے کیا رائے دیتا ہے۔"

"ابا جان! مناۃ اس سلسلے میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ تو لکڑی کا ایک بے جان ٹکڑا ہے۔ سننے، سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم۔" نوجوان معاذ نے حقیقت کی نشاندہی کی۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس سے رائے لیے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا۔" بڑے میاں نے غصے سے تیز ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد عمرو بن جموح وہاں سے اٹھ کر مناۃ کے پاس پہنچے۔ (اہل جاہلیت کا معمول تھا کہ جب وہ کسی بت سے بات کرنا چاہتے تھے تو اس کے پیچھے کسی بوڑھی عورت کو کھڑا کر دیتے اور وہ ان کے زعم باطل کے مطابق جو بات اس بڑھیا کے دل میں ڈالتا وہی کہتی تھی) اور اس کے سامنے اپنے سیدھے اور تندرست پاؤں کے بل کھڑے ہوگئے۔ ان کا ایک پاؤں لنگڑا تھا۔۔ پہلے تو انھوں نے بت کی بہترین حمد وثنا کی۔ پھر بولے۔

"مناۃ! تجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ داعی جو مکے سے ہمارے یہاں پہنچا ہے، وہ تیرے علاوہ کسی اور کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ وہ صرف اس لیے یہاں آیا ہے کہ ہم کو تیری عبادت سے روک دے۔ اور میں اس کی اچھی باتیں سن چکنے کے باوجود ان کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں، جب تک تم سے مشورہ نہ کرلوں تو تم مجھے اس سلسلے میں مناسب مشورہ دو۔"

لیکن جب مناۃ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو عمرو نے کہا کہ "شاید تم ناراض ہوگئے ہو اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔ جو تمہارے لیے باعث اذیت ہو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں تم کو چند روز کی مہلت دیتا

ہوں تاکہ تمہارا غصہ فرو ہو جائے۔"

عمرو بن جموح کے لڑکے مناۃ کے ساتھ اپنے باپ کے غیر معمولی تعلق خاطر کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کو یہ بات بھی خوب معلوم تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ان کے لیے ایک جزو لازم بن چکا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ ان کے دل میں اس کی عقیدت و نیازمندی کی بنیاد متزلزل ہو رہی ہے۔ اب یہ ان کا کام ہے کہ اس کی عقیدت کو ان کے دل سے پورے طور پر نکال دیں۔ ان کو ایمان کی طرف لانے کی یہی ایک شکل تھی۔

عمرو بن جموح کے لڑکے رات کی تاریکی میں اپنے دوست معاذؓ بن جبل کے ساتھ مناۃ کے پاس پہنچے اور اس کو اس کی جگہ سے اٹھا کر بنو سلمہ کے اس گڑھے پر لے گئے جس میں وہ کوڑا کرکٹ اور گندگی ڈالتے تھے۔ لڑکے اس کو گڑھے میں پھینک کر گھر لوٹ آئے۔ اور اس کارروائی کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ صبح کو جب عمرو اپنے بُت کے پاس اظہارِ عقیدت کے لیے پہنچے تو اسے اپنی جگہ سے غائب پایا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے گھر والوں سے کہا کہ ـــــ

"تم لوگوں کا بُرا ہو۔ آج رات میرے معبود کے ساتھ کس نے زیادتی کی ہے؟"

لیکن کسی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر اور باہر اس کو تلاش کرتے پھرے۔ وہ شدتِ غضب میں چیخ چیخ کر گھر والوں کو دھمکی دیتے رہے۔ اور آخر کافی تلاش کرنے کے بعد وہ ان کو گڑھے میں منہ کے بل اوندھا پڑا ہوا مل گیا۔ انھوں نے اسے وہاں سے نکالا، اسے دھو کر صاف کیا اور خوشبو لگا کر دوبارہ اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے بولے۔

"خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ کس نے یہ حرکت

کی ہے تو میں اسے سخت سزا دوں گا۔"

دوسری رات بھی لڑکوں نے مناۃ کے ساتھ وہی حرکت کی جو پچھلی رات کر چکے تھے۔ صبح کو جب بڑے میاں نے اسے تلاش کیا تو اسی گڑھے میں گندگی میں ملوث پایا۔ آج بھی انھوں نے اس کو وہاں سے باہر نکال کر دھویا اور خوشبو لگا کر اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

لڑکے ہر رات اس کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے یہاں تک کہ جب عمرو بن جموح ان کی اس حرکت سے بالکل تنگ آ گئے تو رات سونے سے پہلے اس کے پاس گئے، اور اپنی تلوار اس کی گردن میں لٹکاتے ہوتے بولے ۔

"اے مناۃ! خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے، اگر تیرے اندر ذرا بھی خیر ہو تو اپنا دفاع کر۔ یہ تلوار تیرے پاس ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ اور جب لڑکوں کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ بڑے میاں گہری نیند میں پہنچ کر گرد و پیش سے بے خبر ہو چکے ہیں تو وہ جھٹ پٹ بت کے پاس پہنچے، انھوں نے اس کی گردن میں پڑی ہوئی تلوار نکال لی اور اس کو گھر کے باہر لے گئے۔ اب کی بار انہوں نے ایک مردہ کتے کو اس کے ساتھ باندھ دیا اور دونوں کو بنو سلمہ کے اسی گڑھے میں پھینک دیا جس میں گندگی اور غلاظت بھری ہوئی تھی۔ صبح کو جب بڑے میاں سو کر اٹھے اور بت کو اپنی جگہ موجود نہیں پایا تو اس کی تلاش میں نکلے اور حسب معمول اس کو اسی گڑھے میں اس حال میں منہ کے بل پڑا ہوا پایا کہ اس کے ساتھ ایک مردہ کتا بندھا ہوا تھا اور تلوار اس سے چھین لی گئی تھی۔ اب کی بار انھوں نے اس کو گڑھے سے نہیں نکالا بلکہ جہاں لڑکوں نے اسے پھینکا تھا، وہیں چھوڑ دیا اور بولے ۔

واللہ لو کنت الہا لم تکن "خدا کی قسم اگر تو واقعی معبود ہوتا تو

انت دکلب وسط بئر فی قرن۔ تو کُتّے کے ساتھ بندھا ہوا گڑھے میں نہ پڑا ہوتا۔"

پھر اس کے بعد انھیں خدا کے دین میں داخل ہوتے دیر نہ لگی۔

جب حضرت عمروؓ بن جموح نے حلاوت ایمان کا مزہ چکھ لیا تو اپنی عمر کے اس ایک ایک لمحے پر پریشانی اور ندامت کا اظہار کرنے لگے جو شرک کی حالت میں گزرا تھا۔ ایمان لانے کے بعد وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ دین کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اور اپنے نفس، اپنے مال اور اپنی اولاد کو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے لیے وقف کر دیا۔

حضرت عمرو بن جموح کے مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ عرصے کے بعد اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ انھوں نے اپنے تینوں بیٹوں کو دشمنان خدا سے مقابلہ کی تیاریاں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ انھیں صبح و شام بپھرے ہوئے شیروں کی طرح آتے جاتے دیکھتے۔ ان کے چہرے دولت شہادت اور رضاء الٰہی کے حصول کے شوق میں جگمگا رہے تھے۔ اس صورت حال نے ان کے اندر بھی جوش وحمیت کو برانگیختہ کر دیا اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر قیادت اپنے بیٹوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کا تہیہ کر لیا۔ لیکن ان کے لڑکے ان کو اس ارادے سے باز رکھنے پر متفق الرائے ہو گئے۔ کیونکہ وہ ایک سن رسیدہ بوڑھے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاؤں میں شدید لنگ تھا اور ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شرکت جہاد سے معذور قرار دیا تھا۔ ان کے بیٹوں نے ان سے کہا کہ "ابا جان! اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور قرار دیا ہے۔" آپ خود کو ایسی بات کا مکلف کیوں قرار دے رہے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔" حضرت عمروؓ ان کی اس بات سے سخت ناراض ہوئے

اوران کی شکایت کرنے کے لیے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوتے اور آپؐ سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسُول! میرے یہ بیٹے مجھے اس خیر سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ میں لنگڑا ہوں اور معذور ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک ہونا میرے لیے ضروری نہیں ہے۔ خُدا کی قسم مجھے اُمید ہے کہ میں اپنی اسی ٹانگ سے جنّت میں داخل ہوں گا۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ ذوق وشوق دیکھا تو اُن کے لڑکوں سے فرمایا کہ "ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ ان کو شہادت عطا فرماتے۔" چنانچہ لڑکے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق خاموش ہو گئے۔

جب مجاہدین کی روانگی کا وقت آیا تو حضرت عمرو بن جموحؓ اپنی اہلیہ سے ملے اور ان سے اس طرح رخصت ہوتے، جیسے انہیں لوٹ کر واپس نہیں آنا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے قبلہ رو ہو کر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا دیے اور دُعا کی۔

"اللّٰھمّ ارزقنی الشھادۃ ولا تردّنی الی اھلی خایباً۔"

"خدایا! مجھے شہادت کی دولت نصیب فرما۔ خدایا! مجھے ناکام اور نامُراد اور شہادت سے محروم کرکے واپس نہ لوٹا۔"

پھر وہ اس شان سے میدان جہاد کی طرف روانہ ہوتے کہ ان کے تینوں لڑکے اور ان کے قبیلہ بنوسلمہ کی ایک کثیر تعداد نے انھیں اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مسلمان رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے تو یہ عجیب منظر دیکھنے میں آیا کہ حضرت عمروؓ بن جموح

اپنی تندرست ٹانگ سے کودتے ہوئے مسلمانوں کی اس اگلی جماعت میں شامل ہوگئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے آگے بڑھی تھی۔ اور اس وقت تمنائے شہادت لفظوں کی شکل میں ان کے لبوں پر مچل رہی تھی۔

"انی لمشتاق الی الجنۃ۔ انی لمشتاق الی الجنۃ" "میں جنت کا مشتاق ہوں۔ میں جنت کا مشتاق ہوں"

اس وقت ان کے ایک صاحب زادے حضرت خلاد رضی اللہ عنہ عقب سے ان کی حفاظت کر رہے تھے۔ وہ دونوں باپ بیٹے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے ہوئے مشرکین سے برابر لڑتے رہے، یہاں تک کہ دونوں میدان جنگ میں شہید ہو کر گر پڑے۔ اور دونوں کی شہادت کے درمیان چند لمحات سے زیادہ کا وقفہ حائل نہ تھا۔

جب جنگ ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء احد کی تجہیز و تکفین کے لیے کھڑے ہوئے اور صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ "انھیں ان کے خون اور زخموں سمیت ہی دفن کر دو، میں ان کا گواہ ہوں" پھر آپؐ نے فرمایا کہ "جو مسلمان راہ خدا میں زخمی ہوگا، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ زخموں سے اس کا خون جاری ہوگا، اس خون کا رنگ زعفرانی اور اس کی خوشبو مشک کی خوشبو کی طرح ہوگی" پھر فرمایا۔ "عمروؓ بن جموح کو عبداللہ بن عمروؓ کے ساتھ دفن کرنا۔ یہ دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے کے نہایت گہرے اور مخلص دوست تھے۔

اللہ تعالیٰ حضرت عمروؓ بن جموح اور ان کے ساتھی شہداء احد سے راضی ہو۔ اور ان کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

——— ٭ ———

حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہٗ

وہ صحابیِ جلیل جن کی زندگی کی چند جھلکیاں ہم اس وقت پیش کر رہے ہیں —رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کا بہت گہرا اور مضبوط رشتہ تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے دعوت اسلامی کے اولین مرحلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پکار پر لبیک کہا — وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ محترمہ حضرت اُمیمہ بنت عبدالمطلب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادر نسبتی تھے۔ ان کی ہمشیرہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ اور امہات المومنین میں تھیں۔ وہ پہلے شخص تھے جن کو اسلام میں کسی فوجی مہم کی قیادت سونپی گئی۔ ان سب کے علاوہ وہ پہلے آدمی ، جن کو امیرالمومنین کے لقب سے پکارا گیا وہ بزرگ اور محترم صحابی حضرت عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دار ارقم میں داخل ہونے سے قبل مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ ان کا شمار سابقین اولین میں ہوتا تھا۔ جب نبیؐ نے قریش کی اذیت رسانیوں سے بچنے کے لیے اور اپنے دین کی حفاظت کے لیے صحابۂ کرامؓ کو ہجرتِ مدینہ کی اجازت مرحمت فرمائی تو قافلۂ مہاجرین میں صرف ایک شخص ان سے آگے تھا۔ ان سے پہلے اس شرف کی طرف سوائے حضرت ابوسلمہؓ کے کسی اور نے سبقت نہیں کی تھی۔

خُدا کے لیے ہجرت کرنا اور اس کی راہ میں گھر بار اور اہل وعیال سے جُدائی اختیار کرنا حضرت عبداللہؓ بن جحش کے لیے کوئی نیا تجربہ نہ تھا اس سے پہلے وہ اور ان کے گھرانے کے کچھ لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے لیکن اب کی بار ان کی ہجرت نہایت مکمل اور وسیع ہجرت تھی۔ اس بار ان کے اہل وعیال، ان کے متعلقین اور اہل خاندان سب نے ہجرت میں ان کا ساتھ دیا۔ ان میں سے مرد، عورتیں، بچے، بچیاں اور بوڑھے، جوان سبھی ان کے شریک سفر تھے کیوں کہ ان کا گھر اسلام کا گھر اور ان کا خاندان ایمان کا خاندان تھا۔

جب یہ لوگ مکہ چھوڑ کر نکل گئے تو ان کے مکانات رنج وملال اور حزن افسردگی کی تصویر پیش کر رہے تھے۔ ان کے اُوپر اس طرح ویرانی اور اُداسی مسلّط ہو گئی اور زندگی کی رونق اور چہل پہل کے آثار اس طرح وہاں سے مٹ گئے جیسے پہلے وہاں کوئی رہتا ہی نہ تھا۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے اہل خانہ کو ہجرت کیے ہوئے ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ ایک دن سردارانِ قریش یہ معلوم کرنے کے لیے مکہ کے محلوں اور آبادیوں میں گشت کرنے نکلے کہ مسلمانوں میں سے کون کون سے لوگ مکہ چھوڑ کر جا چکے ہیں اور کون سے لوگ ابھی تک یہاں سکونت پذیر ہیں۔ ان گشت کرنے والوں میں ابوجہل بھی تھا اور عتبہ ابن ربیعہ بھی۔ عتبہ ابن ربیعہ نے دیکھا کہ بنو جحش کے مکانات میں گرد وغبار اُڑاتی ہوئی ہوائیں نوحہ کرتی پھر رہی ہیں اور ان کے دروازوں کے کھلے ہوئے پٹ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بڑی بھیانک آواز پیدا کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس نے کہا کہ بنو جحش کے مکانات ویران ہو گئے ہیں اور یہ اپنے مکینوں کے فراق میں رو رہے ہیں۔ یہ سُن کر ابوجہل نے کہا کہ یہ کیسے لوگ تھے کہ ان

کی جُدائی کے صدمے سے ان کے مکانات تک رو رہے ہیں۔ پھر ابو جہل نے حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ کے مکان پر قبضہ کرلیا اور اس پر اور اس میں باقی ماندہ سامان واسباب پر مالکانہ طور پر تصرف کرنے لگا۔ جب اپنے مکان پر ابو جہل کے قبضے کی خبر حضرت عبداللہ رضؓ کو ہوئی اور انھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ عبداللہ! کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے عوض تم کو جنّت میں مکان عطا فرمائے۔ انھوں نے کہا کہ کیوں نہیں؟ اے اللہ کے رسُولؐ! میں اس پر راضی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم کو اس کے بدلے جنّت میں اس سے عمدہ اور عالیشان مکان ملے گا۔ یہ سُن کر ان کا جی خوش ہوگیا اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔

حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ اپنی دونوں ہجرتوں کی مشقّتیں جھیلنے کے بعد ابھی مدینہ میں قرار وسکون کی دو گھڑیاں بھی نہیں گزار پائے تھے۔ قریش مکّہ کے ہاتھوں دُکھ اور اذیت برداشت کرنے کے بعد ابھی انصار مدینہ کے زیر سایہ اور ان کے حفظ وامان میں رہ کر وہ سُکھ چین کے چند لمحات بھی نہیں بتا سکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے انھیں ان کی زندگی کی سب سے کڑی آزمائش اور ان کے اسلام لانے کے بعد کے سب سے تلخ تجربے سے دو چار کر دیا۔

ہوا یہ کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی اوّلین فوجی مہم کے لیے آٹھ صحابہ کرام کو جن میں حضرت عبداللہ رضؓ بن جحش اور حضرت سعد رضؓ بن ابی وقاص بھی شامل تھے، طلب فرمایا اور کہا کہ میں تمہارا امیر اس شخص کو مقرر کروں گا جو بھوک پیاس کی شدّت سب سے زیادہ برداشت کر سکتا ہو۔ پھر آپؐ نے اس دستے کی قیادت حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ کے سپرد فرمائی

اِس طرح حضرت عبداللہ بن جحش ؓ سب سے پہلے مسلمان تھے جن کو مسلمانوں کے کسی فوجی دستے کی قیادت سونپی گئی۔

روانگی سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے سمتِ سفر کا تعین فرمایا اور ایک خط ان کے حوالے کرتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ دو دن کی مسافت طے کرنے سے پہلے اس کو نہ پڑھیں۔ حسبِ ہدایت جب انھوں نے اس خط کو کھولا تو اس میں یہ ہدایت درج تھی:

" میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد آگے بڑھ کر طائف اور مکہ کے درمیان "نخلہ" کے مقام پر پڑاؤ ڈالو اور وہاں ٹھہر کر قریش کی ٹوہ لگاؤ اور ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرو۔"

حضرت عبداللہ ؓ نے خط پڑھ کر نبی ؐ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مقام نخلہ پر پہنچ کر وہاں خفیہ طور پر قریش پر نظر رکھوں اور ان کے حالات سے آپؐ کو آگاہ کروں۔ انھوں نے مجھے تم میں سے کسی کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے تم میں سے جو شخص شہادت کا طالب اور اس کا آرزومند ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کا جی چاہے بلا خوفِ ملامت واپس چلا جائے لیکن سب نے یک زبان ہوکر کہا کہ ہم رسُول اللہ ؐ کے حکم کو بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو جہاں جانے کا حکم دیا ہے، چلیے۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔

وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھے اور نخلہ کے مقام پر پہنچ کر قریش کے حالات معلوم کرنے کے لیے مختلف راستوں پر چکر لگانے لگے۔ اس تلاش و جستجو کے دوران ان کی نظر دُور سے آتے ہوئے قریش کے ایک تجارتی

قافلے پر پڑی جو چار آدمیوں عمرو بن حضرمی، عمر بن کیسان، عثمان ابن عبداللہ اور اس کے بھائی مغیرہ بن عبداللہ پر مشتمل تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ قریش کا سامانِ تجارت تھا جس میں کھال اور کشمش وغیرہ وہ چیزیں تھیں جن کی وہ تجارت کرتے تھے۔

وہ تاریخ ماہِ حرام (رجب) کی آخری تاریخ تھی۔ صحابہ نے آپس میں اس بات پر مشورہ کیا کہ قافلے کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ اگر ہم انھیں قتل کرتے ہیں تو ماہ حرام میں جنگ و خونریزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ماہِ حرام کی حرمت پامال ہوگی اور ہم اہلِ عرب کی ناراضی اور اُن کی ملامت کا ہدف بن جائیں گے اور اگر انھیں آج کی تاریخ گزرنے تک مہلت دے دیں تو یہ حدودِ حرم میں داخل ہو کر ہماری پہنچ سے باہر ہو جائیں گے اور خود کو ہماری گرفت سے محفوظ کرلیں گے۔ وہ دیر تک اس مسئلے پر غور و فکر کرتے رہے آخرکار وہ ان کے اوپر حملہ کرنے، انھیں قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب کو بطور غنیمت لے لینے پر متفق الرائے ہوگئے اور پھر.... تھوڑی دیر میں وہ ان میں سے ایک کو قتل اور دو گرفتار کر چکے تھے۔ البتہ چوتھا شخص بھاگ کر اپنی جان بچا لینے میں کامیاب ہوگیا۔

حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھی دونوں اسیروں اور سامانِ تجارت سے لدے ہوئے اُونٹوں کو لیے ہوئے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب یہ لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پہنچے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کارروائی سے آگاہ ہوئے تو آپؐ نے ان کے اس فعل پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ان سے کہا:

"خدا کی قسم میں نے تمہیں جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں نے تو

تم کو صرف قریش کے حالات معلوم کرنے کا حکم دیا تھا اور یہ ہدایت کی تھی
کہ ان کی نقل و حرکت پر خفیہ طور پر نظر رکھو۔"
آپؐ نے قیدیوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ ان کے معاملے کو
فی الحال ملتوی کر دیا۔ آپؐ نے مالِ غنیمت سے بھی اعراض فرمایا اور اس میں
سے کچھ نہیں لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل سے حضرت عبداللہ
بن جحشؓ اور ان کے ساتھیوں کو سخت صدمہ پہنچا اور انھیں اس بات کا یقین
ہو گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب
ہو کر مکمل طور پر تباہی و بربادی کا سامنا کر رہے ہیں۔ مزید برآں ان پر یہ بات
بھی شاق گزری کہ ان کے مسلمان بھائی انھیں ملامت کرنے لگے۔ جب
بھی ان کا گزر مسلمانوں کی کسی ٹولی کی طرف سے ہوتا وہ یہ کہتے ہوئے ان
کی طرف سے منہ پھیر لیتے کہ "یہ ہیں وہ لوگ جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے!" اور انھیں اس وقت اور زیادہ
صدمہ پہنچا جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ قریش نے ان کی اس حرکت کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم پر اعتراض کرنے اور ان کو قبائل میں بدنام کرنے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے۔ مشرکین مکہ یہ
کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرتے پھر رہے تھے کہ "محمدؐ نے حرام مہینے کو حلال کر لیا! اس
میں خونریزی کی، مال لوٹا اور آدمیوں کو گرفتار کیا" پھر نہ پوچھیے کہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور
ان کے رفقاء کو اپنی اس فروگزاشت پر کتنا گہرا رنج اور صدمہ ہوا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے کتنی شرمندگی اور ندامت لاحق ہوئی کیونکہ ان کی اس کارروائی کی وجہ سے
آپؐ سخت ذہنی کوفت واذیت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جب ان لوگوں کی بے چینی اور
پریشانی حد سے متجاوز اور ان کی قوت برداشت سے باہر ہو گئی تو اچانک
ایک شخص نے آکر انھیں یہ مژدۂ جانفزا سنایا کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی

ہوگیا اور اس نے اس سلسلے میں اپنے نبی پر قرآن نازل کیا ہے ۔ یہ سُن کر انھیں ناقابلِ بیان مسرت حاصل ہوئی ۔ لوگ قرآن کی اس آیت کو پڑھتے ہوئے انھیں خوش خبری سُناتے، انھیں مبارک باد دیتے اور ان کے ساتھ معانقہ کرتے ۔

یسئلونك عن الشهر الحرام قتال فیه ۔ قل قتال فیه کبیر ۔ وصد عن سبیل الله وکفر به والمسجد الحرام ۔ واخراج اهله اکبر عند الله والفتنة اکبر من القتل ۔ (البقرة - ۲۱۷)	لوگ پوچھتے ہیں ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے ؟ کہو اس میں لڑنا بہت بُرا ہے مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پہ بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی برا ہے ۔ اور فتنہ تو خونریزی سے شدید تر ہے ۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی خوش ہوگیا ۔ آپؐ نے قافلے کا مال قبول کرلیا اور دونوں قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا فرما دیا ۔ پھر آپؐ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور ان کے رفقاء سے بھی راضی ہوگئے ۔ کیونکہ ان کا یہ غزوہ مسلمانوں کی زندگی میں ایک بہت بڑے اور عظیم واقعے کی حیثیت رکھتا تھا ۔ اس غزوہ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت اسلام میں سب سے پہلا مالِ غنیمت تھا، اس میں قتل ہونے والا شخص پہلا مشرک تھا جس کا خون مسلمانوں نے بہایا ۔ اس میں گرفتار ہونے والے قیدی پہلے قیدی تھے جو مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ۔ اس کا جھنڈا پہلا جھنڈا تھا جسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے باندھا اور اس کے امیر حضرت عبداللہ بن جحشؓ وہ

شخص تھے جن کو امیر المومنین کے لقب سے پکارا گیا۔ پھر بدر کا معرکہ
پیش آیا۔ اس میں حضرت عبداللہ بن جحش رضؓ نے شجاعت و مردانگی کے وہ
جوہر دکھائے جو اُن کے ایمان کے شایانِ شان تھے۔ پھر غزوۂ اُحد پیش آیا۔
جس میں حضرت عبداللہ رضؓ اور ان کے دوست حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے
مابین ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش واقعہ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ اپنے اور
اپنے دوست کے واقعے کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہؓ بن جحش مجھ سے ملے اور بولے: "کیا
تم اللہ تعالیٰ سے دُعا نہیں کرو گے؟" میں نے جواب دیا: "کیوں نہیں"
پھر ہم دونوں ایک طرف خلوت میں چلے گئے اور میں نے دعا کی، "میرے
رب! جب دشمن سے میری مُڈ بھیڑ ہو تو میرا مقابلہ کسی ایسے شخص سے کرانا
جس کی گرفت نہایت سخت اور جس کا غیظ و غضب انتہائی شدید ہو۔ میں
اس سے لڑوں، وہ مجھ سے لڑے، پھر تو مجھے اس کے اُوپر غلبہ و کامرانی عطا
فرما، حتیٰ کہ میں اسے قتل کر کے اس کے اسلحے کو اپنے قبضے میں کروں!"
عبداللہؓ بن جحش نے میری اس دعا پر آمین کہی پھر انھوں نے دُعا کی:
"خدایا! میدانِ جنگ میں میرا مقابلہ ایسے شخص سے کرانا جو انتہائی غضبناک
اور سخت گیر ہو۔ میں تیری راہ میں اس سے جنگ کروں اور وہ مجھ سے لڑے
پھر وہ میرے اُوپر غالب آجائے اور میری ناک اور میرے کان کاٹ لے اور
جب قیامت کے دن میں تیرے سامنے حاضر ہوں تو، تو مجھ سے پوچھے کہ
میرے بندے! تیری ناک اور تیرے کان کیوں کاٹے گئے۔ تو میں کہوں کہ
خدایا! تیری اور تیرے رسولؐ کی راہ میں اور تو کہے کہ تو نے سچ کہا۔"
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن جحشؓ کی دُعا میری دُعا

سے اچھی تھی۔ میں نے دن کے آخری حصّے میں دیکھا کہ انھیں قتل کر کے ان کا مثلہ کر دیا گیا ہے اور ان کی ناک اور کانوں کو ایک دھاگے کے ذریعہ درخت پر لٹکا دیا گیا ہے۔

اللہ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کی دعا قبول فرمائی اور انھیں شہادت کی نعمت سے نوازا جیسا کہ ان کے ماموں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو نوازا تھا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا۔ اس وقت آپ کے مقدس آنسُو ان کی قبر کو تر کر رہے تھے۔ جو شہادت کی خوشبو سے معطّر ہو رہی تھی۔
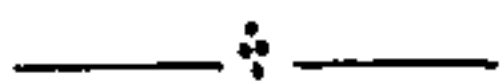
حضرت ابوعبیدہ بن جرّاح رضی اللہ عنہٗ

وہ پاکیزہ رو، خوش شکل، لاغر اندام اور سبک رفتار شخصیت کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو راحت ملتی اور ان سے مل کر روح کو سکون اور دل کو قرار میسر آتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ بے حد خوش اخلاق منکسر المزاج اور شرم و حیا کے پیکر تھے لیکن جب کوئی سخت معاملہ پیش آتا یا کوئی کٹھن گھڑی سامنے آتی تو وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی مانند نظر آتے۔ وہ رونق و صفائی اور تیزی اور کاٹ میں تلوار کی دھار کے مشابہ تھے۔ یہ امت محمدؐ کے امین حضرت ابوعبیدہ عامر بن عبداللہ بن جراح فہری قرشی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"قریش کے تین آدمی سب سے زیادہ درخشندہ رو، سب سے زیادہ خوش اخلاق اور سب سے زیادہ باحیا ہیں۔ اگر وہ تم سے بات کریں گے تو کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے اور اگر تم ان سے بات کرو گے تو کبھی تمہاری تکذیب نہیں کریں گے وہ ہیں ابوبکر صدیق، عثمان بن عفّان اور ابوعبیدہؓ ابن جراح رضوان اللہ علیہم"

حضرت ابوعبیدہؓ السابقون الاولون میں سے تھے وہ حضرت ابوبکرؓ کے مسلمان ہونے کے دوسرے دن انہی کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حضرت ابوبکر ان کو، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو حضرت عثمان بن

مظعون کو اور حضرت ارقم بن ابی ارقم کو لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان لوگوں نے آپ کے روبرو کلمۂ حق کا اعلان کیا۔ یہ لوگ بنیاد کی وہ خشتِ اولین تھے جس پر اسلام کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔

اگرچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے مکّہ میں رہتے ہوئے شروع سے آخر تک ان شدید ترین آزمائشوں کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گزاری جن میں مسلمانوں کو مبتلا کیا گیا۔ انھوں نے ابتدائی مسلمانوں کے ساتھ مصائب و آلام کی جو سختیاں جھیلیں، روئے زمین پر کسی دین کے متبعین نے نہ جھیلی ہوں گی۔ انھوں نے بڑی پامردی اور عزم و حوصلہ کے ساتھ ان ابتلاؤں کا مقابلہ کیا اور ہر موقع پر خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ سچی محبت کا ثبوت دیا لیکن غزوۂ بدر کے موقع پر وہ جس آزمائش میں مبتلا ہوئے اس کی سختی ہر خیال و تصور سے بالاتر تھی۔

وہ جنگ بدر میں صفوں کے درمیان اس طرح بڑھ بڑھ کر اور پینترے بدل بدل کر حملے کر رہے تھے جیسے ان کو نہ تو موت کا کوئی ڈر ہے نہ ہلاکت کا کوئی اندیشہ۔ ان کے حملوں نے مشرکین پر ان کی ہیبت طاری کر دی اور قریش کے بڑے بڑے سورما ان کا سامنا کرنے سے کترانے لگے لیکن ان میں سے ایک شخص ایسا تھا جو ہر وقت ان کا سامنا کرنے کی کوشش کرتا اور ہر موقع پر ان کے بالمقابل آجاتا مگر وہ اس کے راستے سے ہٹ جاتے اور اس کے ساتھ مقابلہ کرنے سے پرہیز کرتے۔ وہ شخص بار بار ان کے اوپر حملہ آور ہوتا اور وہ ہر بار کترا کر دوسری طرف نکل جاتے۔ آخر کار اس نے ان کے لیے سارے راستے مسدود کر دیے، ان کے سامنے

آ کھڑا ہوا اور ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان حائل ہو گیا۔ جب اس کی یہ حرکتیں حضرت ابوعبیدہؓ کی قوتِ برداشت سے باہر ہو گئیں تو انھوں نے اس کے سر پر تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ اس کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور وہ بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔

قارئین کرام یہ اندازہ لگانے کی کوشش نہ کریں کہ یہ مرنے والا شخص کون ہو گا۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ کا امتحان ہر قسم کے خیال و گمان سے بلند تھا۔ اور آپ کا سر چکرا جائے گا جب یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ حضرت ابوعبیدہؓ کے ہاتھ سے مارا جانے والا شخص کوئی اور نہیں خود ان کے والد عبداللہ بن جرّاح تھے۔ انھوں نے اپنے والد کو نہیں، ان کی شخصیت میں پائے جانے والے کفر کو قتل کیا تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوعبیدہؓ اور ان کے والد کے متعلق قرآن نازل کرتے ہوئے فرمایا:

لا تجد قومًا یومنون باللّٰه و الیوم الآخر، یوادون من حاد اللّٰه ورسوله ولو کانوا اٰباءھم اوابناءھم او اخوانھم او عشیرتھم اولٰئك کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منه ویدخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا۔ رضی اللّٰه عنھم

تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا

ورضوا عنه ۔ اولئك حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون ۔
(مجادلہ : ۲۲)

کرکے ان کو قوت بخشی ہے ۔ وہ ان لوگوں کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں ۔

حضرت ابوعبیدہؓ کی طرف سے اس بات کا صادر ہونا کچھ حیرت انگیز اور تعجب خیز نہ تھا ۔ وہ اپنی قوتِ ایمانی، دینی نصح و خیر خواہی اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے امانت داری کے اس مقام بلند پر فائز تھے کہ بہت سے لوگوں کی رشک آمیز نگاہیں ان کی طرف اٹھتی رہتی تھیں۔

محمد بن جعفر نے بیان کیا ہے کہ ایک بار نصاریٰ کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوا اور اس نے آپؐ سے درخواست کی کہ " ابوالقاسم ! آپ ہمارے ساتھ اپنے اصحاب میں سے کسی ایسے شخص کو بھیجیے جس کو آپ ہمارے لیے پسند کرتے ہوں تاکہ وہ ہمارے درمیان ان جائدادوں کا فیصلہ کرے جن کے بارے میں ہمارے اندر اختلاف پیدا ہوگیا ہے "۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ " تم دن کے وقت مجھ سے ملو ۔ میں تمہارے ساتھ ایک قوی امین کو روانہ کروں گا ۔"

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں ظہر کی نماز کے لیے بہت سویرے پہنچا۔ اس روز کی طرح میرے دل میں امارت کی کبھی خواہش نہیں پیدا ہوئی

تھی اور امارت کی یہ خواہش میرے دل میں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ممکن ہے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ وصف کا میں ہی مصداق ٹھہروں۔ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگے تو میں اُچک اُچک کر خود کو نمایاں کرنے لگا تاکہ آپؐ کی نظر میرے اُوپر پڑ سکے لیکن آپ میری طرف متوجہ ہونے کے بجائے اپنی نگاہوں کو مجمع کے درمیان گردش دیتے رہے یہاں تک کہ آپؐ کی متجسّس نظریں ابوعبیدہؓ بن جرّاح پر جا کر ٹک گئیں۔ آپؐ نے ان کو اپنے پاس بلایا اور اہلِ وفد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

"ان کے ساتھ جاؤ اور ان کے درمیان پیدا شدہ نزاعی معاملے کا برحق اور مبنی برانصاف فیصلہ کردو۔" یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا، "ابوعبیدہ اس فضیلت کو لے اُڑے۔"

حضرت ابوعبیدہؓ صرف صفت امانت ہی سے متصف نہ تھے وہ امانت داری کے ساتھ ساتھ زبردست قوتِ ایمانی کے مالک بھی تھے اور بہت سے مواقع پر ان کی اس قوت کا اظہار بھی ہو چکا تھا۔ اس قوت کا اظہار خاص کر اس وقت ہوا تھا جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کا ایک دستہ قریش کے تجارتی قافلے سے تعرض کرنے کے لیے روانہ فرمایا اور حضرت ابوعبیدہؓ کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔ روانگی کے وقت آپ نے کھجوروں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ان کے حوالے کی تھی انھیں زادِ سفر کے طور پر دینے کے لیے اس وقت اس کے علاوہ دوسری کوئی چیز آپؐ کو میسّر نہ تھی۔ حضرت ابوعبیدہؓ اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کو روزانہ ایک ایک کھجور دیتے اور ہر شخص اس کھجور کو اس طرح چوستا جس طرح شیر خوار

بچہ ماں کی چھاتیوں کو چوستا ہے، اور اُوپر سے پانی پی لیتا تھا اور یہی اس کی پورے ایک دن کی خوراک ہوتی تھی۔

ان کی قوت ایمانی کا اظہار اس وقت بھی ہوا تھا جب غزوہ احد کے موقع پر مسلمانوں کو شکست اور ان کے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کے بعد مشرکین پیہم آوازیں لگا رہے تھے۔ "ہمیں بتاؤ! محمد کہاں ہے؟ بتاؤ ہمیں کہاں ہے محمد؟ تو حضرت ابو عبیدہؓ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے لیے ان کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا تاکہ آپؐ کی طرف بڑھنے والے مشرکین کے نیزوں کو اپنے سینوں پر روک لیں۔

جنگ ختم ہوئی تو آپؐ کے سامنے کے دو دانت شہید ہو چکے تھے۔ پیشانی مبارک زخمی ہو گئی تھی اور رخسارِ مبارک میں خود کی کڑیاں چبھ گئی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو رخسارِ مبارک سے نکالنا چاہا تو حضرت ابوعبیدہؓ نے انھیں قسم دے کر کہا کہ یہ کام آپ میرے لیے چھوڑ دیں اور انھوں نے چھوڑ دیا کہ ابوعبیدہؓ یہ خدمت انجام دیں۔

حضرت ابوعبیدہؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ ان کڑیوں کو ہاتھوں سے کھینچ کر نکالتے ہیں تو آپؐ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے انھوں نے ایک کڑی کو دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑا اور زور لگا کر کھینچا تو وہ باہر آگئی مگر ساتھ ہی ان کا ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ پھر انھوں نے دوسری کڑی کو بھی اپنے دانتوں کی مضبوط گرفت میں لے کر زور لگایا، کڑی پیشانی مبارک سے نکل گئی مگر ان کا دوسرا دانت بھی ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کہا کرتے تھے کہ " ابوعبیدہؓ ان لوگوں میں سب سے اچھے

ہیں جن کے آگے کے دانت ٹوٹے ہوئے ہوں۔"

حضرت ابو عبیدہؓ شروع سے آخر تک تمام غزوات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور جب سقیفہ بنی ساعدہ کا موقع آیا (جس موقع پر حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کی گئی تھی)، تو حضرت عمرؓ بن خطاب نے حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ "اپنا ہاتھ بڑھائیے آپ کی بیعت کروں، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ سے یہ کہتے سنا ہے کہ ہر اُمت کا ایک امین ہوتا اور ہماری اُمت کے امین تم ہو۔" تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں اس شخص سے آگے بڑھنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم مسلمانوں کا امام بنایا اور آپؐ کی وفات تک وہ ہماری امامت کرتا رہا۔" اور اس کے بعد جب حضرت ابو بکرؓ کے دستِ مبارک پر خلافت کی بیعت ہوگئی تو حضرت ابو عبیدہؓ حق و صداقت کے معاملہ میں ان کے بہترین خیر خواہ اور خیر و فلاح میں ان کے قابلِ اعتماد معاون ثابت ہوئے۔

پھر جب حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی وصیت کی اور اس کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں تو حضرت ابو عبیدہؓ نے مکمل طور پر ان کی اطاعت کی اور ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی ان کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ وہ کون سا موقع تھا جب حضرت ابو عبیدہ نے خلیفۃ المسلمین کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی؟

ہوا یہ کہ جس زمانے میں وہ شام کے علاقے میں لشکرِ مجاہدین کی قیادت فرما رہے تھے اور یکے بعد دیگرے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے، پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے ایک طرف مشرق میں

دریائے فرات اور دوسری جانب شمال میں ایشیائے کوچک تک پہنچ گئے
تھے۔ شام میں اچانک طاعون کی زبردست اور غیر معمولی وبا پھوٹ پڑی
جس نے بے شمار انسانوں کو اپنے بھیانک خونی پنجوں میں جکڑ لیا اور
دیکھتے دیکھتے ان گنت انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم
ہوا تو وہ سخت تشویش میں مبتلا ہو گئے اور انھوں نے ایک قاصد کو اس
پیغام کے ساتھ ابو عبیدہؓ کی خدمت میں روانہ کیا کہ " اچانک مجھے ایک
ضرورت پیش آگئی ہے جس میں میرے لیے آپ سے مشورہ کرنا ناگزیر ہے۔
میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ اگر میرا خط آپ کے پاس رات کے وقت پہنچے تو
صبح کا انتظار کیے بغیر عازم سفر ہو جائیے اور اگر دن کو ملے تو شام ہونے سے
پہلے رخت سفر باندھ لیجیے۔" حضرت ابو عبیدہؓ کو جب حضرت عمر کا یہ خط ملا
تو انھوں نے فرمایا:

" مجھے معلوم ہے کہ امیر المومنین کو مجھ سے کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک
ایسے شخص کو بچانا چاہتے ہیں جو بچنے والا نہیں ہے۔" پھر انھوں نے ان
کے جواب میں لکھا: " امیر المومنین! میں سمجھ گیا کہ آپ کو مجھ سے کیا ضرورت
ہے۔ میں مسلمانوں کے لشکر میں اور اپنے دل میں اس قسم کی کوئی خواہش
نہیں پاتا کہ میں اپنے آپ کو اس وبا سے محفوظ کر لوں جس میں یہ سب
لوگ مبتلا ہیں۔ میں اس وقت تک ان سے الگ نہیں ہو سکتا جب
تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے بارے میں اپنا فیصلہ نافذ نہیں
کر دیتا۔ اس لیے جب میرا یہ خط آپ کو ملے تو آپ مجھے اپنی قسم سے
بری کر دیجیے اور مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت مرحمت فرما دیجیے۔" حضرت
عمرؓ نے یہ خط پڑھا تو رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو

جاری ہوگئے، حاضرین نے ان کی شدتِ گریہ کو دیکھ کر پوچھا کہ کیا ابوعبیدہؓ کا انتقال ہوگیا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا ہے مگر موت ان سے زیادہ دور نہیں ہے۔" اور حضرت عمرؓ کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا اس لیے کہ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ طاعون میں مبتلا ہوگئے اور جب ان کی موت کی گھڑی قریب آگئی تو انھوں نے اپنی فوج کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا "میں تم لوگوں کو ایک وصیت کر رہا ہوں، اگر اس پر عمل کروگے تو ہمیشہ خیر و فلاح پر قائم رہوگے۔ دیکھو! نماز قائم کرو، ماہِ رمضان کے روزے رکھو، صدقہ و خیرات کرتے رہو، حج اور عمرہ ادا کرو، آپس میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کیا کرو، اپنے امراء کے ساتھ خیرخواہی کرو، ان کے ساتھ خیانت اور فریب سے کام نہ لو اور دنیا تم کو دھوکے میں نہ ڈالے۔ اس لیے کہ اگر آدمی کو ہزاروں سال کی طویل زندگی بھی مل جائے تب بھی اُس کے لیے اِس انجام سے دوچار ہونا ضروری ہے جس سے اس وقت میں دوچار ہوں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔"

پھر انھوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا "معاذ! میرے بعد لوگوں کو نماز تم پڑھاؤگے۔" اور تھوڑی دیر بعد طائرِ رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتقال کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا:

لوگو! تم ایک ایسے شخص کی موت کے صدمے سے دوچار ہو کہ بخدا میں نے آج تک کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ مخلص و پاک طینت اور اس سے زیادہ شر و کینہ سے دُور ہو۔ نہ میں نے کسی ایسے شخص کو دیکھا جو اس سے زیادہ آخرت سے محبت کرنے والا اور مسلم عوام کا خیرخواہ ہو۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر رحم فرمائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

اس وقت وہ ایک کم سن اور قریب البلوغ لڑکے تھے۔ وہ روزانہ مکہ کے ایک رئیس عقبہ ابن معیط کی بکریوں کو لے کر انھیں چرانے کے لیے انسانی آبادی سے دور مکے کی پہاڑیوں اور وادیوں کی طرف نکل جایا کرتے تھے ان کا نام عبداللہ اور ان کے والد کا نام مسعود تھا لیکن عام طور سے لوگ انھیں "ابن ام عبد" کہہ کر پکارتے تھے۔

کم سن عبداللہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں اکثر سنا کرتا تھا جو قریش میں اپنی نبوت کا اعلان کر چکے تھے، مگر ایک تو اپنی کم عمری اور دوسرے آبادی سے دور، انسانی سوسائٹی سے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں کر پاتا تھا۔ اس کا تو روز کا یہ معمول تھا کہ صبح منہ اندھیرے عقبہ ابن معیط کی بکریوں کے ساتھ نکل جاتا اور اس وقت واپس لوٹتا جب رات کی تاریکی پورے طور پر فضا کو اپنی سیاہ چادر میں چھپا لیتی تھی۔

ایک روز عبداللہ بن مسعود نے دور فاصلے پر ادھیڑ عمر کے دو آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا جو تکان سے چور اور تھکاوٹ سے نڈھال ہونے کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور شدت تشنگی کے مارے ان کے ہونٹ اور حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہے تھے۔ وہ دونوں اس کے قریب پہنچ کر رکے، اسے سلام کیا اور بولے:

"لڑکے! ہمارے لیے ان بکریوں کا دُودھ دوہو جس سے ہم اپنی پیاس بُجھا سکیں اور اپنی رگوں کو تر کر سکیں۔"

"میں ایسا کرنے سے معذور ہوں۔ میں ان بکریوں کا دُودھ آپ کو نہیں پیش کر سکتا کیونکہ یہ میری نہیں ہیں بلکہ میری امانت میں ہیں۔ میں ان کا مالک نہیں، امین ہوں۔"

لڑکے کا جواب سُن کر ان دونوں نے کسی قسم کی ناگواری یا ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انھوں نے اس جواب کو پسند کیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک آدمی نے کہا:

"اچھا کسی ایسی بکری کی نشاندہی کرو جس نے کبھی بچّہ نہ دیا ہو۔" لڑکے نے اپنے قریب ہی کھڑی ایک چھوٹی سی بکری کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ آدمی اس کے قریب گیا۔ اسے پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کے تھن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لڑکے نے حیرت کے ساتھ دیکھا اور اپنے دل میں کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسی بکریاں جو کبھی گابھن نہ ہوئی ہوں، دودھ دینے لگیں۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بکری کا تھن پھول کر بڑا ہو گیا اور اس میں تیزی کے ساتھ دُودھ بہنے لگا، دوسرے آدمی نے زمین پر پڑا ہوا ایک پیالہ نما گہرا سا پتھر اٹھا کر اُسے دُودھ سے بھر لیا پھر اس دُودھ کو ان دونوں نے پیا اور لڑکے کو بھی پلایا۔ عبداللہ بن مسعود نے بتایا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آنے والے اس واقعے پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب ہم سب لوگ اچھی طرح آسودہ ہو گئے تو اس بابرکت شخص نے بکری کے تھن سے کہا: "سکڑ جا" اور وہ سکڑتے سکڑتے اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اس وقت میں نے اس بابرکت شخص سے کہا:

" وہ کلمات جو آپ نے ابھی کہے تھے، ان میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دیجئے۔" تو اُس نے کہا:

" اَنْتَ غُلَامٌ مُعَلَّمٌ " تم ایک سکھائے پڑھائے لڑکے ہو۔"

یہ اسلام سے عبداللہ بن مسعود کی شناسائی کی کہانی کا آغاز تھا اور وہ مبارک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ دونوں حضرات قریش کی شدید ایذا رسانی اور ابتلاء و آزمائش سے بچنے کے لیے اس روز مکّہ کی گھاٹیوں کی طرف نکل آئے تھے۔ لڑکے نے جس انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھی حضرت ابوبکرؓ سے اپنی محبّت اور تعلق خاطر کا اظہار کیا اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ بہت خوش ہوئے۔ اس کی احتیاط اور امانت داری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کے اندر خیر و فلاح کی علامات کو محسوس کر لیا۔

اِس واقعہ کے کچھ ہی دنوں بعد عبداللہ بن مسعود نے اسلام قبول کر لیا اور خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کرتے ہوئے اپنے آپ کو بارگاہ نبوّت میں پیش کر دیا اور اسی روز سے وہ سعادت مند اور خوش بخت لڑکا بکریوں کی گلہ بانی سے نکل کر سرورِ کائنات کی خدمت میں منتقل ہو گیا، وہ ہر وقت سفر میں، حضر میں، گھر کے اندر اور گھر سے باہر سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ ساتھ رہتے۔ جب آپؐ سو جاتے تو وہ آپؐ کو بیدار کرتے، جب آپؐ غسل کرتے تو وہ پردے کا انتظام کرتے، جب آپؐ باہر جانے کا ارادہ کرتے تو وہ آپؐ کو جوتے پہناتے، جب آپؐ گھر میں داخل ہوتے تو وہ جوتوں کو پائے مبارک سے نکال لیتے، وہ آپؐ

کے عصا اور مسواک کی حفاظت کرتے اور جب آپؐ کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ فرماتے تو وہ اس سے پہلے اس میں داخل ہوتے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے قُرب وتعلق کا یہ حال تھا کہ آپؐ نے انھیں ہر وقت اپنے گھر آنے اور اپنے تمام رازوں سے واقف رہنے کی اجازت دے رکھی تھی، اسی وجہ سے وہ " رازدانِ رسولؐ " کہے جاتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آپؐ کے زیر تربیت پروان چڑھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کو آپؐ کے اخلاق وعادات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ خود کو آپؐ کی صفات سے متصف کرلیا اور ہر کام میں آپؐ کی پیروی کو اپنا وظیفۂ حیات بنالیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے اخلاق وعادات کے لحاظ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر تھے۔ انھوں نے مدرسۂ رسول سے علومِ قرآن کا درس لیا، وہ صحابۂ کرامؓ میں سب سے بڑے قاری، اس کے معانی کے سب سے بڑے رمز شناس اور شریعتِ الٰہی کے سب سے بڑے نکتہ داں تھے۔ ایک بار جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ میدانِ عرفات میں وقوف فرمائے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے ان کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:

" امیرالمومنین! میں کوفہ سے آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک شخص کو دیکھا جو قرآن میں دیکھے بغیر زبانی اس کا املاء کراتا ہے۔" یہ سُن کر انھوں نے خشمگیں لہجے میں پوچھا:

" تیرا بُرا ہو، کون ہے وہ شخص؟ "

" عبداللہ بن مسعود"! اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

یہ سُن کر بہ تدریج ان کے غصّے کا اثر زائل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ

وہ اپنی معمولی اور نارمل حالت پر آگئے۔ پھر انھوں نے فرمایا :
" بخدا میں نہیں جانتا کہ ان سے زیادہ کوئی دوسرا شخص بھی اس کا حقدار ہے۔ اس کے متعلق میں تم سے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں :
" ایک رات کا ذکر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے یہاں تشریف فرما تھے۔ وہ دونوں حضرات مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ اس مجلس میں مَیں بھی موجود تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے۔ ہم لوگ بھی آپؐ کے ساتھ چلے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ کوئی شخص مسجد میں کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ ہم اسے پہچان نہ سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر کھڑے ہو کر اس کی قرأت سنتے رہے پھر ہماری طرف مڑتے ہوئے بولے :

من سرّہ ان یقرأ القرآن رطبا کما نزل فلیقرأہ علی قرأۃ ابن ام عبد" جو شخص قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہے جیسا کہ وہ نازل ہوا ہے تو اسے چاہیے کہ ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق اسے پڑھے۔" پھر جب عبداللہ بن مسعودؓ بیٹھ کر دعا مانگنے لگے تو رسول اللہ کہتے جاتے " سل تعطہ، سل تعطہ" "مانگو دیا جائے گا، مانگو دیا جائے گا۔"

حضرت عمرؓ نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمایا : " پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ بخدا میں صبح سویرے ان کے پاس جاکر ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی دعا پر آمین کہنے کی خوش خبری سناؤں گا۔ اور جب سویرے ان کو خوش خبری دینے کے ارادے سے ان کے یہاں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ابوبکرؓ مجھ سے پہلے ان کو یہ خوش خبری دے چکے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے جب بھی کسی خیر میں ابوبکرؓ سے مسابقت کی، ابوبکر نے

ہمیشہ مجھے پیچھے چھوڑ دیا۔"

کتاب اللہ کے علم میں ابن مسعودؓ کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

"قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، قرآن کریم کی جو آیت بھی نازل ہوئی اس کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ کہاں اور کس کے متعلق نازل ہوئی۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ اس کے متعلق کوئی شخص مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے اور اس کے پاس پہنچنا ممکن ہو تو میں وہاں پہنچ کر اس کے علم سے ضرور استفادہ کروں گا۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے متعلق جو کچھ فرمایا۔ اس میں ذرہ برابر مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ ایک مرتبہ اپنے ایک سفر کے دوران ایک قافلے سے ملتے ہیں، رات اندھیری ہے، اس نے پورے قافلے کو تاریکی کے پردے میں چھپا رکھا ہے، اس قافلے میں ابن مسعودؓ بھی ہیں، حضرت عمرؓ ایک شخص سے کہتے ہیں کہ پوچھو۔

"آپ لوگ کہاں سے آرہے ہیں؟"

ابن مسعودؓ: "فج عمیق سے۔"

حضرت عمرؓ: "اور کہاں کا ارادہ ہے؟"

ابن مسعودؓ: "بیت عتیق کا۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قافلے میں کوئی صاحب علم ہے، اور انھوں نے اپنے آدمی سے کہا پوچھو۔

"قرآن کا کون سا حصہ سب سے عظیم ہے؟"

ابن مسعودؓ: اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم۔ لا تأخذہ سنۃ ولا نوم۔ اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی

خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے، نہ اسے اُونگھ لگتی ہے۔ (بقرہ : ۲۵۵)
حضرت عمرؓ: "قرآن کا کون سا حصّہ سب سے زیادہ محکم ہے؟"
ابن مسعودؓ: "انّ اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ"۔ اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔" (نحل : ۹۰)
حضرت عمرؓ: "قرآن کا کون سا ٹکڑا سب سے جامع ہے؟"
ابن مسعودؓ: "فمن یّعمل مثقال ذرّۃ خیرا یّرہ۔ ومن یّعمل مثقال ذرّۃ شراً یّرہ"۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ (زلزال : ۷-۸)
حضرت عمرؓ: "قرآن کا کون سا حصّہ سب سے زیادہ خوفناک ہے؟"
ابن مسعودؓ: "لیس بأمانیّکم ولا امانیّ اھل الکتاب۔ من یّعمل سوءً یجز بہ ولا یجد من دون اللہ ولیّ وّلا نصیرا"۔ انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے، نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی و مددگار نہ پا سکے گا۔" (نساء : ۱۲۳)

حضرت عمرؓ: "قرآن کا کون سا حصّہ سب سے زیادہ اُمید افزا ہے؟"
ابن مسعودؓ: قل یا عبادی الّذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رّحمۃ اللہ انّ اللہ یغفر الذّنوب جمیعا، ان اللہ ھو الغفور الرّحیم۔ (اے نبیؐ) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو غفور رّحیم ہے۔" (زمر : ۵۳)
حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان سے پوچھو کہ "کیا تم میں عبداللہ بن مسعود ہیں؟"

و حافلہ والوں نے جواب دیا کہ "ہاں"!

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ صرف عالم وقاری اور عابد وزاہد ہی نہیں تھے بلکہ وہ بڑے ہمّتی، نہایت دُوراندیش اور زبردست مجاہد اور میدانِ کارزار میں پیکرِ جرأت وشجاعت بھی تھے۔ وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے مشرکین کے مجمع میں باآواز بلند قرآن پڑھ کر سُنایا۔ ایک روز مسلمان (جب وہ قلیل التعداد اور کمزور تھے) مکّہ میں اکٹھا ہوئے اور آپس میں کہنے لگے۔ بخدا، ابھی تک قریش نے باآواز بلند کسی سے قرآن نہیں سُنا۔ کون ہے جو اُن کو سُنا دے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا " میں انہیں قرآن سُناؤں گا"۔ صحابہؓ نے کہا " آپ اس کے لیے مناسب نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ کام کوئی ایسا شخص انجام دے جس کی پشت پر اس کے قبیلے کی طاقت ہو کہ اگر قریش اس کے ساتھ بری نیّت سے پیش آئیں تو اس کا قبیلہ اس کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑا ہو"۔ لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ "نہیں یہ کام مجھے ہی کرنے دو۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھے گا اور ان کے مقابلے میں میری حمایت کرے گا"۔ پھر وہ چاشت کے وقت مسجد حرام میں داخل ہوئے اور مقام ابراہیم کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت سردارانِ قریش کعبہ کے اِرد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہؓ نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے قرآن کی تلاوت شروع کی: بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم ○ الرّحمٰن۔ علّم القراٰن خلق الانسان علّمه البیان (اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ نہایت مہربان، خدا نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا)۔ (الرحمٰن: ۱-۵)

وہ کتابِ الٰہی کی آیات پڑھتے چلے گئے۔ آواز سُن کر سردارانِ قریش اُن

کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے :

" یہ ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے ؟ ..... ارے اس کا ناس ہو۔ یہ تو اسی پیغام کا کوئی حصہ پڑھ رہا ہے جس کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے ہیں !" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے، تیزی سے ان کی طرف لپکے اور ان کے چہرے پر مارنے لگے لیکن انھوں نے تلاوت کا سلسلہ منقطع نہیں کیا وہ برابر پڑھتے رہے اور وہیں جا کر رُکے جہاں تک وہ پہنچنا چاہتے تھے پھر وہ لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں آئے۔ اس وقت ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ لوگوں نے ان کو اس حالت میں دیکھ کر کہا " آپ کے متعلق ہم کو اسی بات کا اندیشہ تھا۔" یہ سُن کر انھوں نے کہا۔

" بخدا یہ دشمنانِ خدا آج سے پہلے میری نظر میں اتنے ذلیل و بے وقعت نہ تھے اگر آپ لوگ چاہیں تو میں کل بھی ان کو اسی طرح قرآن سُنا سکتا ہوں۔" لیکن ساتھیوں نے کہا کہ " نہیں، بس اتنا کافی ہے، تم نے ان کو وہ چیز سُنا دی جس کا سُننا انھیں گوارا نہیں ہے۔" ابن مسعودؓ، حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو حضرت عثمانؓ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے دریافت کیا " آپ کو کس چیز کی شکایت ہے ؟"

بولے " اپنے گناہوں کی۔" پوچھا " کیا خواہش ہے ؟" بولے " اپنے رب کی رحمت کی۔"

پوچھا " کیوں نہ آپ کے وظیفے کی ادائیگی کا حکم جاری کردوں جس کو لینے سے آپ نے پچھلے کئی سالوں سے انکار کر دیا ہے ؟" بولے " مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

کہنے لگے " آپ کے بعد آپ کی بچیوں کے کام آئے گا"
بولے " کیا آپ کو میری بیٹیوں کے متعلق محتاجی کا اندیشہ ہے ؟ میں نے انھیں ہر رات سورہ واقعہ پڑھنے کی ہدایت کردی ہے ۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے : " من قرأ الواقعة کل لیلۃ لم تصبہ فاقۃ ۔ جو شخص ہر رات کو سورۂ واقعہ پڑھ لیا کرے گا وہ فقر و فاقہ سے دوچار نہ ہو گا ۔"
اور جب رات آئی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے ۔ اس وقت ان کی زبان مبارک اللہ کے ذکر اور اس کی آیات بیّنات سے تر تھی ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو ۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہٗ

یہ کہانی ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو عرصۂ دراز تک حقیقت کی تلاش و جستجو میں اس کے پیچھے بھاگتا اور طویل مدت تک خدا کی یافت کے لیے سرگرداں و پریشاں رہا۔ یہ قصہ حضرت سلمان فارسی کا قصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انھیں راضی کرے۔

یہ بات ہم انہی پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اپنے اس قصے کے واقعات و حوادث کو اپنی زبان سے بیان کریں کیوں کہ اس معاملے میں ان کا شعور نہایت گہرا اور ان کا بیان زیادہ مبنی بر صداقت ہے۔ حضرت سلمان اپنی کہانی کا آغاز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میں اصفہان کی ایک بستی "جیان" کا رہنے والا ایک ایرانی نوجوان تھا۔ میرے والد اس گاؤں کے زمیندار، اس کے باشندوں میں سب سے زیادہ مالدار اور سماجی لحاظ سے سب سے بلند مقام و مرتبہ کے مالک تھے۔ وہ میرے روزِ پیدائش ہی سے میرے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے تھے اور ان کی یہ محبت مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی اور اس میں شب و روز ارتقاء و اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے نقصان پہنچنے کے موہوم خطرات کے پیشِ نظر انھوں نے لڑکیوں کی طرح میرے گھر سے نکلنے پر سخت پابندی عائد کر دی۔ میں نے اپنے آبائی مذہب مجوسیت کا علم حاصل کرنے اور اس

کے احکام و فرائض پر عمل کرنے میں غیر معمولی محنت اور دلچسپی سے کام لیا اور ترقی کر کے آتش کدہ کا مرزبان ہو گیا اور شب و روز اس کو دہکانے اور روشن رکھنے کی ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی۔

میرے والد کے پاس کافی زمین تھی جس سے بڑی مقدار میں غلہ حاصل ہوتا تھا۔ زمین کا انتظام اور فصلوں کی دیکھ بھال وہ بذاتِ خود کرتے تھے۔ ایک بار کسی مصروفیت کی وجہ سے وہ گاؤں نہیں جا سکے اس لیے مجھ سے کہا کہ بیٹے تم دیکھ رہے ہو کہ اپنی مصروفیت کے سبب سے میں کھیت پر نہیں جا سکتا۔ آج میری جگہ تم وہاں چلے جاؤ اور اس کی نگرانی کرو۔ والد صاحب کی ہدایت کے مطابق کھیت پر جانے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ راستے میں میرا گزر عیسائیوں کے ایک گرجا کی طرف سے ہوا۔ اس وقت گرجا میں نماز ہو رہی تھی۔ ان کی آواز کانوں میں پڑی تو میری توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی۔ چونکہ میرے والد نے گھر سے نکلنے اور لوگوں کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے پر پابندی لگا دی تھی اس لیے میں نصاریٰ اور دیگر اہل مذاہب کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے ان کی آواز سنی تو یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، گرجا میں داخل ہو گیا۔ جب میں نے غور سے دیکھا تو ان کی عبادت اور نماز کا یہ انداز مجھے بہت پسند آیا اور میرے اندر ان کے مذہب سے رغبت پیدا ہو گئی۔ میں نے دل میں کہا بخدا ان کا مذہب ہمارے مذہب سے بہتر ہے۔ پھر میں غروبِ آفتاب تک ان کے ساتھ رہا۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اس دین کی اصل کہاں ہے؟ انھوں نے بتایا کہ اس کی اصل شام میں ہے۔ جب رات کو گھر واپس آیا تو میرے والد مجھ سے ملے اور انھوں نے میری کارگزاریوں کی روداد پوچھی۔ میں نے

کہا کہ ابّا جان ! میرا گزر کچھ لوگوں کی طرف ہوا جو کنیسہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ مجھے ان کا طریقۂ عبادت بہت پسند آیا اور میں غروبِ آفتاب تک ان کی صحبت میں رُکا رہا۔ میرے اس عمل سے والد صاحب بہت گھبرائے اور انھوں نے کہا کہ بیٹے! اس دین میں کوئی خیر نہیں ہے۔ تمہارا اور تمہارے آبا و اجداد کا دین اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خُدا کی قسم! ان کا دین ہمارے دین سے اچھا ہے۔ میری بات سن کر والد صاحب کو اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں میں اپنے دین سے پھر نہ جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے گھر میں قید کر کے میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

موقع پا کر میں نے نصارٰی کے یہاں پیغام بھیجا کہ اگر شام جانے والا کوئی قافلہ تمہارے پاس پہنچے تو مجھے آگاہ کرنا۔ خوش قسمتی سے چند ہی روز کے بعد شام جانے والا ایک قافلہ ان کے پاس پہنچ گیا اور انھوں نے مجھے اس کی اطلاع کر دی۔ میں نے کوشش کر کے اپنے آپ کو بیڑیوں سے آزاد کیا اور چپکے سے ان کے ساتھ شام پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دریافت کیا کہ دینِ مسیحیت کا سب سے افضل آدمی کون ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ پادری جو گرجا کا متولی و منتظم ہے، اس وقت کا سب سے افضل اور بہتر نصرانی ہے چنانچہ میں نے اس کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

" میں نصرانیت کی طرف مائل ہوں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس رہوں، آپ کی خدمت کروں۔ آپ سے اس کی تعلیم حاصل کروں اور آپ کے ساتھ نماز پڑھوں۔ اس نے میری درخواست قبول کر لی۔ اور مجھے اپنے ساتھ قیام کی اجازت دے دی۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ گرجا میں رہنے اور اس کی خدمت کرنے لگا لیکن چند ہی روز رہنے کے بعد مجھے معلوم

ہوگیا کہ اپنے اخلاق و عادات اور اپنی سیرت وکردار کے اعتبار سے وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنے متبعین کو صدقہ و خیرات کا حکم دیتا اور ثواب کی خوشخبری سُناتا۔ جب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے لوگ اسے مال دیتے تو وہ سب کچھ اپنے لیے جمع کرلیتا، فقراء و مساکین کو اس میں سے کچھ نہ دیتا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے اس کے پاس کافی دولت جمع ہوگئی اور اس کے یہاں سونے سے بھرے ہوئے سات گھڑے اکٹھا ہوگئے اس کا یہ رویہ دیکھ کر مجھے اس سے شدید نفرت ہوگئی۔ کچھ دنوں کے بعد جب اس کا انتقال ہوگیا اور نصرانی اس کی تجہیز و تکفین کے لیے جمع ہوئے تو میں نے ان کو بتایا کہ یہ بہت بُرا شخص تھا، تم لوگوں کو صدقہ و خیرات کا حکم دیتا مگر تمہاری دی ہوئی پوری کی پوری رقم اپنی ذات کے لیے جمع کرلیتا تھا اس میں سے محتاجوں اور ضرورت مندوں کو ایک حبہ نہیں دیتا تھا۔ انھوں نے کہا تم کو کیسے معلوم؟ میں نے کہا میں تم کو اس کا خزانہ دکھاتا ہوں اور میں نے وہ جگہ دکھادی۔ انھوں نے وہاں سے سات گھڑے نکالے جو سونے چاندی سے پُر تھے۔ یہ دیکھ کر انھوں نے کہا:

"بخدا ہم اس کو ہرگز دفن نہیں کریں گے"

پھر انھوں نے اس کی لاش کو صلیب پر لٹکا کر اس پر پتھروں کی بارش کردی۔

اس کے چند روز بعد انھوں نے اس جگہ ایک دوسرے شخص کو مقرر کردیا اور میں اس کی صحبت میں رہنے لگا۔ میں نے دنیا میں کسی ایسے

شخص کو نہیں دیکھا جو اس سے زیادہ دنیا سے بے نیاز، آخرت کا مشتاق اور عبادت کا پابند ہو۔ میں اس سے غیر معمولی محبت کرنے لگا اور ایک مدّت تک اس کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا۔ جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو میں نے اس سے عرض کیا۔

"محترم! میرے لیے آپ کی کیا وصیّت ہے؟ آپ مجھے اپنے بعد کس کی صحبت اختیار کرنے کی نصیحت فرما رہے ہیں؟"

"بیٹے! اپنے علم کی حد تک میں صرف ایک شخص کو جانتا ہوں جو اُس دین پر قائم ہے جس پر میں تھا۔ وہ فلاں شخص ہے جو مَوصِل میں رہتا ہے۔ اس نے صحیح دین میں کوئی تحریف نہیں کی ہے۔ حق اب صرف اسی کے پاس ہے۔" اس نے جواب دیا۔

جب میرے مرشد کا انتقال ہو گیا تو میں مَوصِل پہنچا اور اس شخص کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کو اپنی پوری سرگزشت سے آگاہ کر دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ فلاں بزرگ نے اپنی موت کے وقت مجھے آپ کی صحبت اختیار کرنے کی وصیّت کی تھی۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ اب صرف آپ ہی اس دین پر قائم ہیں جس پر وہ خود تھے۔ میری بات سُن کر انھوں نے مجھے اپنے پاس ٹھہرنے کی اجازت دے دی اور میں وہاں رہنے لگا۔ میں نے ان کو بہترین حالت پر پایا لیکن بدقسمتی سے میں زیادہ دنوں تک ان کی صحبت سے استفادہ نہ کر سکا۔ ان کی موت کا پروانہ بہت جلد آ گیا۔ جب ان کے انتقال کی گھڑی قریب آ گئی تو میں نے عرض کیا۔

"محترم! آپ کا وقتِ موعود آ گیا ہے اور آپ میرے مسئلے سے بخوبی واقف ہیں۔ اب آپ کی طرف سے میرے لیے کیا وصیّت ہے۔ مجھے کس کے

پاسؔ جانے کی ہدایت فرماتے ہیں؟" میری بات سُن کر انھوں نے فرمایا:
"بیٹے! بخدا مجھے نہیں معلوم کہ "نصیبین" کے فلاں شخص کے سوا کوئی دوسرا آدمی اس دین پر باقی ہے جسؔ پر ہم لوگ ہیں۔ بس تم وہیں جاؤ اور اسی کی صحبت اختیار کرو۔"

اس بزرگ کی تجہیز و تکفین کے بعد میں نصیبین والے بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں اپنے حالات اور اپنے مرشد کی ہدایت سے آگاہ کیا۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر رضامندی ظاہر کی اور میں ان کے پاس مقیم ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اسی حق پر قائم ہیں جس پر پہلے دونوں بزرگ تھے لیکن مجھے ان کی صحبت میں رہتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کا وقت بھی پورا ہوگیا جب ان کی موت کا وقت قریب آگیا تو میں نے ان سے کہا۔

"آپ کو میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا مقصد کیا ہے جس کے لیے میں در در کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔ اب اپنے بعد آپ مجھے کس کے پاس جانے کی ہدایت فرمارہے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا کہ:

"بیٹے! میری معلومات کی حد تک اب رُوئے زمین پر صرف ایک شخص رہ گیا ہے جو اس دین حق پر قائم ہے۔ وہ فلاں شخص ہے جو "عموریہ" میں رہتا ہے میرے بعد تم اسی کے پاس چلے جانا۔"

میں ان کی ہدایت کے مطابق "عموریہ" پہنچا۔ تمام حالات وواقعات سے انھیں باخبر کیا اور بزرگ کی وصیت کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خدمت میں قیام کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے اجازت دے دی

اور میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔ بخدا وہ مذکورہ بزرگوں کے طریقے پر قائم تھے۔ میں ان کی صحبت سے مستفیض ہونے لگا۔ ان کے یہاں رہتے ہوئے میں نے کچھ گائیں اور بکریاں پال لیں۔ جب ان کی موت کا وقت آپہنچا تو میں نے ان سے کہا:

"آپ میرے معاملے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میرے بارے میں کس کو وصیت کر رہے ہیں اور مجھے کیا حکم دے رہے ہیں؟"

اُنھوں نے جواب دیا کہ:

"بیٹے! بخدا میرے علم کی حد تک روئے زمین پر اب ایسا کوئی شخص نہیں بچا ہے جو اس دین پر قائم ہو جس پر ہم تھے۔ لیکن وہ وقت قریب آگیا ہے جب سرزمینِ عرب میں ایک نبی دینِ ابراہیمی کے ساتھ مبعوث ہوگا پھر وہ اپنے وطن سے کھجوروں والی زمین کی طرف ہجرت کرے گا جو حرّتین[1] کے درمیان واقع ہے۔ اس کی چند واضح نشانیاں ہیں۔ وہ ہدیہ قبول کرے گا، صدقہ نہیں کھائے گا اور اس کے دونوں کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت ہوگی۔ اگر ہو سکے تو تم اسی علاقے میں چلے جاؤ۔"

ان کے انتقال کے بعد کچھ دنوں تک میں عموریہ میں مقیم رہا، ایک دن اُدھر سے کچھ عرب تاجروں کا گزر ہوا جو قبیلۂ بنی کلب سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ عرب لیتے چلو تو میں تمہیں اپنی ساری گائیں اور بکریاں دے دوں گا۔ وہ تیار ہو گئے اور میں نے اپنے جانور ان کے حوالے کر دیے۔ جب قافلہ مدینہ اور شام

---

[1] سیاہ کنکریوں والی سرزمین

کے درمیان واقع ایک مقام "وادی القریٰ" پر پہنچا تو انھوں نے میرے ساتھ غدّاری کی اور مجھے غلام بنا کر ایک یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اب میں ایک غلام کی حیثیت سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد بنو قریظہ کا ایک یہودی اس کے یہاں آیا اور مجھے خرید کر اپنے ساتھ "یثرب" لے گیا۔ میں نے وہاں کھجوروں کے پیڑ دیکھے جن کا ذکر عموریہ والے بزرگ نے کیا تھا۔ اس کی بیان کردہ علامتوں کی مدد سے میں نے مدینہ کو پہچان لیا۔ اب میں اپنے نئے یہودی آقا کے ساتھ مدینہ میں رہنے لگا۔

اس وقت تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ ہی میں تھے اور اپنی قوم میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اس دوران اپنی غلامی کی مصروفیات اور عدیم الفرصتی کے سبب ان کے متعلق کچھ معلومات نہیں حاصل کر سکا۔ پھر آپؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے۔ ایک روز میں اپنے آقا کے باغ میں ایک کھجور پر چڑھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا۔ میرا آقا اسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا اتنے میں اس کے قبیلے کا کوئی شخص آیا اور کہنے لگا:

"اللہ تعالیٰ بنو قیلہ[1] کو ہلاک کرے۔ وہ سب قبا میں ایک شخص کے گرد جمع ہیں جو آج ہی مکہ سے ان کے یہاں پہنچا ہے اور خود کو نبی بتا رہا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرے اوپر بخار کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور میرا پورا جسم کانپنے لگا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے آقا کے اوپر گر پڑوں گا۔ میں جلدی جلدی درخت سے اترا اور اس آدمی سے پوچھنے لگا:

---

[1] اوس و خزرج کے قبیلے۔

"ابھی تم کیا کہہ رہے تھے ذرا وہ بات مجھے دوبارہ بتاؤ۔"
اس پر میرا آقا غضب ناک ہوگیا اور اس نے مجھے ایک گھونسہ مار کر کہا :
"تمہیں اس سے کیا مطلب۔ چلو، جاکر اپنا کام کرو۔"
شام کو کچھ کھجوریں ساتھ لے کر جو میں نے جمع کر رکھی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا اور ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا :
"مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں اور آپ کے کچھ غریب الوطن اور ضرورت مند ساتھی ہیں۔ یہ صدقے کی تھوڑی سی کھجوریں ہیں۔ میرے خیال میں آپ لوگ اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔"
آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کھاؤ، مگر خود اس میں سے کچھ نہیں کھایا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ پہلی علامت ہے۔"
اس کے بعد میں واپس چلا آیا اور پھر کھجوریں پس انداز کرتا رہا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبا سے مدینے آئے تو میں نے دوبارہ حاضر خدمت ہو کر عرض کیا :
"اس روز میں نے دیکھا کہ آپ نے صدقے کی کھجوریں نہیں کھائیں اس لیے آج یہ تھوڑی سی کھجوریں ہدیۃً خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔"
آپؐ نے ان کھجوروں میں سے خود بھی کھایا اور اپنے ساتھیوں کو بھی شریک کیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ دوسری نشانی ہے۔"
تیسری بار جب میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بقیع میں تشریف فرما تھے۔ وہاں آپ اپنے کسی صحابی کی تدفین میں شریک تھے۔ میں نے آپؐ کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس وقت آپ کے جسم پر دو چادریں تھیں۔ میں نے

قریب پہنچ کر سلام کیا اور گھوم کر پشت کی جانب آگیا کہ شاید میں وہ
خاتم نبوت دیکھ سکوں جس کو عموریہ میں میرے مرشد نے بتایا تھا۔ جب
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی پشتِ مبارک کی طرف نظر اُٹھائے
ہوئے دیکھا تو میرا مقصد سمجھ گئے اور پشت پر سے چادر سرکا دی۔ میں
نے خاتم نبوت کو دیکھا، اسے پہچانا اور جھک کر اسے بے ساختہ چومنے لگا۔
اس وقت میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو جاری تھے۔ یہ دیکھ کر رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

اور میں نے اپنی پوری سرگزشت بیان کر دی جس کو سن کر آپؐ
مسرور ہوئے اور اس بات سے خوش ہوئے کہ آپ کے اصحاب نے میری
زبان سے میری تلاشِ حق کی داستان سن لی۔ ان لوگوں نے بھی اس پر
انتہائی حیرت واستعجاب کا اظہار کیا اور بے حد مسرور ہوئے۔"

سلام ہو سلمانؓ فارسی پر جس روز وہ تلاشِ حق کی راہ میں دربدر کی
ٹھوکریں کھانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور سلام ہو ان پر جس روز
وہ حق سے آگاہ ہوئے، اور سلام ہو ان پر جس روز وہ مرے اور جس روز
زندہ کر کے دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔

———٭———

حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہٗ

اس وقت وہ اپنی عمر کی تیسری دہائی میں تھے جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے حق وہدایت کی دعوت کا برملا اظہار کیا تھا۔ وہ حسب ونسب کے اعتبار سے قریش کے معزز ترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ان میں سب سے فائق تھے اگر ان کا باپ آڑے نہ آتا تو وہ اس لائق تھے کہ اپنے ہم عمروں، سعد بن ابی وقاص اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما کی طرح بہت پہلے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہوتے۔

قارئین کرام کو معلوم ہے کہ ان کا باپ کون تھا؟ وہ مکہ کا سب سے سرکش اور جابر شخص، شرک وکفر کا قافلہ سالار اور مسلمانوں کی ابتلا وآزمائش کا سب سے بڑا ذمہ دار تھا جس کی مکاری اور چالبازی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان و یقین کو پرکھا اور وہ اس معیار پر کھرے اترے۔ اس کے متعلق بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ "ابوجہل" تھا۔

یہ تو ان کا باپ تھا اور وہ خود عکرمہ ابن ابی جہل مخزومی ہیں۔ عکرمہ کا شمار قریش کے معدودے چند سربرآوردہ رئیسوں اور اس کے نامور شہسواروں میں ہوتا تھا۔

عکرمہ ابن ابی جہل نے خود کو اس حال میں پایا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے مطابق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ اس نے ان

کے ساتھ سخت عداوت کا رویہ اختیار کیا۔ ان کے ساتھیوں کو دردناک سزائیں اور اہل اسلام پر ایسی زہرہ گداز عقوبتیں نازل کیں کہ اس کے باپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔

جب اس کے باپ نے معرکۂ بدر میں لشکرِ شرک کی قیادت کی اور لات و عزیٰ کی قسمیں کھا کھا کر اعلان کیا کہ محمدؐ کو شکست دیے بغیر وہ مکہ واپس نہیں لوٹے گا۔ اس نے بدر کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر وہاں تین دن قیام کیا۔ اس دوران وہ اونٹ ذبح کر کے ان کا گوشت کھاتا اور شراب پیتا رہا۔ اس کی دل بستگی کے لیے دف بجا بجا کر لونڈیاں اسے گانے سناتی رہیں۔ جس وقت ابوجہل اس معرکے کی قیادت کر رہا تھا اس کا بیٹا اس کا قابلِ اعتماد دست و بازو تھا لیکن لات و عزیٰ بہرے، نہ اس کی پکار سنی نہ اس کی مدد کو آئے کیونکہ وہ سننے سے معذور اور مدد کرنے سے عاجز تھے ___ تو وہ ذلت کی موت مارا گیا اور اس کے بیٹے نے دیکھا کہ مسلمانوں کے پیاسے نیزے اس کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس نے اپنے کانوں سے اس کے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ سُنی تھی۔

عکرمہ بدر کے میدان میں قریش کے اس عظیم سردار کی لاش چھوڑ کر مکہ لوٹ آیا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد اس کے لیے یہ ممکن ہی نہ رہا کہ وہ اپنے باپ کی لاش اُٹھا کر لاتا اور اسے مکّہ میں دفن کرتا۔ راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے وہ بادلِ نخواستہ اسے مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا اور مسلمانوں نے دوسرے مقتولین کے ساتھ اسے بھی بدر کے کنویں میں پھینک کر اس پر ریت ڈال دیا اور اسی روز سے اسلام کے ساتھ عکرمہ کے رویّے نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ پہلے تو وہ اپنے باپ

کی حمایت میں اسلام کا مخالف تھا مگر آج سے اس کے انتقام کے لیے اس سے برسرِ پیکار ہوگیا اور یہیں سے عکرمہ اور اس کے دوسرے ہم خیال مشرکین قریش جن کے آبا جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور وہ ان کے انتقام کی آگ میں جل رہے تھے، اہلِ مکہ کے سینوں میں محمدؐ کے خلاف عداوت کی آگ اور انتقام کے شعلے بھڑکانے میں لگ گئے جس کے نتیجے میں احد کا خونریز معرکہ پیش آیا۔

جنگ بدر میں اپنی شکست کا بدلہ اور اپنے مقتولین کا انتقام لینے کے لیے قریش کا جوشِ لشکرِ جرار مکہ سے روانہ ہوا، عکرمہ اس میں شریک ہوگیا۔ اس نے اپنی بیوی ام حکیم کو بھی ساتھ لیا تاکہ وہ ان عورتوں کے ساتھ شامل ہو کر صفوں کے پیچھے کھڑی ہو جائے اور جب جانبازانِ قریش میں شکست کے آثار نظر آئیں تو وہ دف بجا بجا کر انھیں قتال پر برانگیختہ کریں اور ان کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھنے کی کوشش کریں۔

قریش نے اپنی فوج کے گھڑسوار دستے کی قیادت کے لیے اس کے میمنہ پر خالد بن ولید اور میسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل کو متعین کیا۔ اس روز ان دونوں مشرک سالاروں نے جرأت و شجاعت اور مردانگی و جوانمردی کے ایسے جوہر دکھائے کہ قریش کا پلہ محمدؐ اور ان کے اصحاب پر بھاری ہوگیا اور اس کے نتیجے میں وہ فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے جس پر ابوسفیان فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا تھا "یہ جنگِ بدر کا بدلہ ہے۔"

غزوۂ خندق کے موقع پر مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ جب محاصرے نے کافی طول کھینچا تو عکرمہ کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ محاصرے کی طوالت سے بددل ہوگیا۔ آخر اس نے خندق کے ایک تنگ حصے کو تاکا اور اپنا گھوڑا کدا کر اس پار جا پہونچا۔ کچھ جری سواروں نے اس کی اقتدار کی اور وہ بھی

اس کے پیچھے خندق عبور کرکے دوسری جانب پہنچ گئے۔ ان میں سے عمرو بن عبدوُد عامری مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا لیکن عکرمہ نے راہِ فرار اختیار کی اور وہ اپنی جان بچا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

اور فتح مکّہ کے موقع پر جب قریش نے دیکھا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب کے سامنے ان کو تاب مقاومت نہیں ہے تو انھوں نے طے کیا کہ ان کے راستے سے ہٹ جائیں۔ یہ فیصلہ انھوں نے اس لیے کیا کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فوج کے سالاروں کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ مکّہ کے عام باشندوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ وہ صرف انہی لوگوں سے جنگ کریں جو اُن سے لڑیں۔ لیکن عکرمہ اور اس کے کچھ ہم خیال ساتھی قریش کے اس فیصلے کے علی الرغم جنگ کا ارادہ لیے مکّہ سے نکل پڑے اور مسلمانوں کے لشکرِ جرار کے سامنے جا ڈٹے۔ لیکن حضرت خالد بن ولید نے ایک معمولی جھڑپ کے بعد انھیں شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس جھڑپ میں ان کے چند آدمی مارے گئے اور باقی میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مفرورین میں عکرمہ ابن ابی جہل بھی تھا۔ اس وقت وہ سخت حیرانی و سراسیمگی سے دوچار تھا۔ اہلِ مکّہ کے مسلمانوں کے سامنے سرنگوں ہو جانے کے بعد اس کے لیے وہاں کوئی جائے پناہ نہیں رہ گئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ان تمام جرائم کو معاف کر دیا تھا جو انھوں نے آپؐ کے مقابلے میں کیے تھے۔ البتہ اس عام معافی سے چند مجرموں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا اور نام لے لے کر حکم دیا گیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے خواہ وہ غلافِ کعبہ میں چھپے ہوئے ہی کیوں نہ ملیں۔ ان لوگوں میں عکرمہ ابن ابی جہل کا نام سرفہرست تھا اس لیے اپنی جان کے خوف سے وہ چھپ کر مکّہ سے نکلا اور

یمن کی طرف چل پڑا کیونکہ اس کے علاوہ اسے کسی دوسری جگہ پناہ ملنے کی اُمید نہ تھی۔

عکرمہ کی بیوی امِّ حکیم اور ہند بنت عتبہ دس دوسری عورتوں کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے کے ارادے سے آپؐ کی قیام گاہ پر پہنچیں۔ اس وقت دو ازواج مطہرات، آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ اور خاندانِ عبدالمطلب کی چند خواتین آپ کے پاس موجود تھیں۔ اس موقع پر ہند نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"اے اللہ کے رسولؐ! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے پسندیدہ دین کو غالب کر دیا۔ میں آپ کے ساتھ اپنی نسبی اور خاندانی قرابت کا واسطہ دے کر آپ سے خیر اور حسنِ سلوک کی خواستگار ہوں۔ میں آپ کی تصدیق کرنے والی ایک مسلمان عورت ہوں۔" پھر اس نے اپنے چہرے سے نقاب سرکاتے ہوئے کہا: "اللہ کے رسول! میں عتبہ کی بیٹی ہند ہوں۔" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:

"میں تمہیں مرحبا کہتا ہوں اور تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں۔"

اس نے پھر کہا:

"بخدا اے اللہ کے رسولؐ! آج سے پہلے روئے زمین پر کوئی ایسا گھر نہ تھا جس کی ذلت و رسوائی مجھے آپؐ کے گھر کی ذلت و رسوائی سے زیادہ پسند ہو۔ مگر اب یہ حال ہے کہ دنیا کا کوئی گھر میرے نزدیک آپؐ کے گھر سے زیادہ معزز نہیں ہے۔"

اس کے بعد عکرمہ کی بیوی اُمِّ جمیل کھڑی ہوئی۔ اس نے پہلے تو اپنے ۔۔۔ کا اظہار کیا پھر یوں گویا ہوئی:

"اے اللہ کے رسولؐ! عکرمہ اس خوف سے بھاگ گئے ہیں کہ آپ انھیں قتل کر دیں گے۔ اللہ کے رسول! آپ انھیں امان بخش دیں اللہ آپ کو امان دے گا۔"

آپؐ نے اس کی درخواست سُن کر ارشاد فرمایا: "عکرمہ ابن ابی جہل کو امان دی جاتی ہے۔"

شوہر کی جاں بخشی کا اعلان سُن کر امّ حکیمؓ اسی وقت اپنے رومی غلام کو ساتھ لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑیں۔ جب وہ چلتے چلتے دُور نکل گئے تو دورانِ سفر غلام کی نیت خراب ہو گئی اور اس نے ان کے اُوپر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے۔ وہ اسے اُمید دلاتی اور ٹالتی ہوئی عرب کے ایک قبیلہ میں پہنچ گئیں۔ وہاں پہنچ کر اہلِ قبیلہ سے مدد کی طالب ہوئیں اور اہلِ قبیلہ نے غلام کو اپنے پاس قید کر دیا اور امّ حکیمؓ نے تن تنہا اپنا سفر جاری رکھا اور آخر کار تہامہ کے علاقے میں سمندر کے کنارے عکرمہ کو پا گئیں اس وقت وہ ایک مسلمان ملّاح سے گفتگو کر رہا تھا کہ وہ اسے اس پار پہنچا دے۔ مگر ملّاح اس بات پر مصر تھا کہ پہلے تم اخلاص کا اظہار کرو تب میں تم کو اس پار لے جاؤں گا۔ عکرمہ نے پوچھا کہ میں اخلاص کا اظہار کس طرح کروں؟ تو اس نے کہا کہو "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ۔"

عکرمہ نے جواب دیا کہ "اسی سے بھاگ کر تو میں یہاں آیا ہوں......"

ابھی ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ ام حکیم عکرمہ کے پاس پہنچ گئیں۔ اور اس سے بولیں:

"میرے ابن عم! میں تمہارے پاس سب سے افضل، سب سے نیک اور سب سے اچھے انسان کی طرف سے آئی ہوں۔ میں تمہارے پاس محمدؐ بن

عبداللہ کی طرف سے آئی ہوں میں نے ان سے تمہاری جاں بخشی کا وعدہ لے لیا ہے۔ تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

عکرمہ نے پوچھا کہ "کیا تم نے خود ان سے بات کی ہے ؟"

انھوں نے جواب دیا "ہاں ! میں نے خود بات کی ہے اور انھوں نے تم کو امان دی ہے۔" وہ برابر اسے اس کی جاں بخشی کا یقین دلاتی رہیں یہاں تک کہ وہ مطمئن اور ان کے ساتھ واپسی پر رضا مند ہوگیا۔ دورانِ راہ انھوں نے غلام کی اس خباثتِ نفس کا ذکر کیا جو اس نے سفر کے دوران کی تھی۔ اور عکرمہ نے مسلمان ہونے سے پہلے وہاں پہنچ کر اسے قتل کر دیا۔

اثنائے سفر میں جب وہ دونوں ایک منزل پر رُکے تو عکرمہ نے بیوی سے خلوت کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک مسلمان عورت ہوں اور تم ابھی مشرک ہو۔"

عکرمہ نے اس بات پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"وہ بات جو تمہیں میرے ساتھ خلوت سے روک دے، یقیناً کوئی نہایت ہی بڑی بات ہوگی۔"

جب عکرمہ مکّہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا:

"سیأتیکم عکرمة بن ابی جھل مؤمنا مھاجرا فلا تسبّوا اباه فانّ سبّ المیّت یؤذی الحیّ ولا یبلغ المیّت۔"

عکرمہ ابن ابی جہل بہت جلد ایک مومن و مہاجر کی حیثیت سے تمہارے پاس پہنچنے والا ہے اس کے باپ کو بُرا مت کہنا مُردے کو بُرا کہنے سے زندہ کو اذیت پہنچتی ہے اور میّت کو اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد عکرمہ اپنی بیوی ام حکیمؓ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پہنچ گیا۔ آپؐ اسے دیکھتے ہی فرطِ مسرت سے اچھل پڑے اور چادر کے بغیر ہی اس کے استقبال کے لیے لپکے۔ پھر جب آپؐ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے تو عکرمہ نے کھڑے کھڑے عرض کیا۔

" محمدؐ ! ام حکیم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے۔"

حضورؐ نے جواب دیا " اس نے صحیح کہا ہے۔ تم مامون ہو۔"

اس نے دوبارہ سوال کیا۔" اے محمدؐ ! آپ مجھے کس بات کی دعوت دیتے ہیں ؟"

" میں تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ تم گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا لائقِ عبادت و پرستش نہیں ہے اور اس بات کی کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں اور اس بات کی کہ تم زکوٰۃ دو۔" آپؐ نے ارکانِ اسلام گناتے ہوئے فرمایا۔

" بخدا آپ نے حق کی دعوت دی اور خیر کا حکم دیا۔ ..... بخدا آپ اس دعوت کے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور نیکوکار تھے۔" یہ کہہ کر اس نے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا۔

اسلام لانے کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی : " اللہ کے رسولؐ ! مجھے سب سے اچھی چیز بتا دیجئے تاکہ میں اسے برابر پڑھا کروں۔"

" اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ پڑھا کرو۔" آپؐ نے جواب دیا۔

بولے: "اس کے بعد کیا؟"

فرمایا: "یہ کہو کہ میں خدائے تعالیٰ اور حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں مسلم ہوں، مجاہد ہوں اور مہاجر ہوں۔" اور عکرمہؓ نے اس کو کہہ دیا۔ اُس وقت آپ نے ان سے فرمایا کہ "آج تم جو چیز بھی مجھ سے مانگو گے وہ تمہیں عطا کروں گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ جتنی عداوت کی، جہاں کہیں بھی آپ کے مدمقابل ہوا اور آپ کے خلاف جو بات بھی، خواہ آپ کے روبرو یا پس پشت کہی ہو ان سب سے میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیں۔" عکرمہؓ نے زبانِ سوال کھولی۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا کی:

"اللّٰھم اغفرلہ کل عداوۃ عادانیھا وکل مسیر سار فیہ الی موضع یرید بہ اطفاء نورك واغفرلہ ما نال من عرضی فی وجھی او انا غائب عنہ"

خدایا! ہر اس عداوت سے عکرمہ کی مغفرت فرما جو اس نے میرے ساتھ کی، اور معاف فرما دے اس کی ہر اُس سرگرمی کو جس کے ذریعہ اس نے تیرے نور کو بجھانے کی کوشش کی، اور درگزر فرما اس کی ہر اُس حرکت کو جو اس نے میری آبرو سے کھیلتے ہوئے میرے سامنے یا میری عدم موجودگی میں کی ہو۔

اس دعا کو سن کر حضرت عکرمہ کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا اور انھوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! خدا کی قسم آج سے پہلے اللہ کی راہ سے بندگانِ خدا کو باز رکھنے کے لیے جتنا مال میں خرچ کرتا رہا ہوں، اب آج کے بعد سے خدا کی راہ میں اس سے دوگنا خرچ کروں گا۔ اور آج سے پہلے خدا کے دین سے

روکنے کے لیے جتنی قوت سے لڑتا رہا، آج کے بعد سے اس سے دوگنی طاقت کے ساتھ راہِ خدا میں لڑوں گا۔"

اور اس روز سے مسلمانوں کی جماعت میں ایک ایسے شخص کا اضافہ ہوا جو میدانِ کارزار میں ایک شیر دل شہسوار اور مسجدوں میں ایک عابد شب زندہ دار اور قاریِ قرآن تھا۔ وہ قرآن کریم کو اپنے چہرے پر رکھ کر خدا کے خوف سے روتے ہوئے بڑے والہانہ انداز میں کہتے: کتابُ ربّی ... کلامُ ربّی ......

حضرت عکرمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے قبولِ اسلام کے بعد کفر و اسلام کے مابین جو بھی معرکہ پیش آیا اس میں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوئے اور مسلمان جب بھی کسی مہم میں نکلے اس میں آگے آگے رہے۔ معرکۂ یرموک میں تو حضرت عکرمہؓ میدانِ قتال کی طرف اس طرح لپکے تھے جیسے کوئی تشنہ لب شدید گرمی میں ٹھنڈے میٹھے پانی کی طرف لپکتا ہے۔ ایک موقع پر جب مسلمانوں پر دشمن کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑے، تلوار کی نیام توڑ کر پھینک دی اور ننگی تلوار لے کر رومیوں کی صفوں میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالدؓ بن ولید نے فوراً ان کے پاس پہنچ کر کہا:

"عکرمہ! ایسا نہ کیجیے۔ اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالیے۔ آپ کا قتل ہو جانا مسلمانوں کے لیے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تلافی سانحہ ہوگا۔"

لیکن حضرت عکرمہؓ نے ان سے کہا: خالد! ہٹ جاؤ۔ میرا راستہ نہ روکو۔ صحبتِ رسولؐ سے استفادہ اور خدمتِ اسلام میں تم کو میرے اوپر سبقت حاصل ہے۔ میں اور میرا باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹر مخالف تھے اور میں آخری دم تک اس مخالفت پر قائم رہا اس لیے صحبتِ رسول کا شرف میرے

حصے میں بڑی تاخیر سے آیا۔ مجھے چھوڑ دو۔ آج میں گزشتہ کوتاہیوں اور محرومیوں کی تلافی کرنا چاہتا ہوں ..... پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا :

" میں بہت سے مواقع پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جم کر لڑا۔ کیا آج ان رومیوں کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کروں ؟ ایسا کبھی نہیں ہوسکے گا۔" پھر انھوں نے مسلمانوں کو پکارا " موت پر کون بعیت کرتا ہے ؟"

ان کی پکار پر تقریباً چار سو مسلمانوں نے ان کے ہاتھ پر بعیت کی۔ ان بعیت کرنے والوں میں ان کے چچا حضرت حارث بن ہشام اور حضرت ضرار بن ازور بھی شامل تھے ان لوگوں نے حضرت خالد بن ولید (قائد لشکر) کے خیمے کے گرد و پیش سخت خونریز جنگ کی اور دشمن کے بڑھتے ہوئے حملوں کا بہترین انداز میں دفاع کیا۔ جب فضائے یرموک پر سے جنگ و قتال کے بادل چھٹے اور مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کا آفتاب طلوع ہوا تو یرموک کی زمین پر تین مجاہد زخموں سے چور پڑے ہوئے تھے اور وہ تھے حضرت حارث بن ہشام، حضرت عیاش بن ربیعہ، اور حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

شدتِ تشنگی سے بے تاب حضرت حارث نے پانی مانگا جب پانی ان کو پیش کیا جا رہا تھا، حضرت عکرمہؓ نے ان کی طرف دیکھا۔ حضرت حارثؓ نے پہلے ان کو پانی پلانے کا اشارہ کیا اور جب پانی ان کے پاس لے جایا گیا تو حضرت عیاشؓ نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ حضرت عکرمہؓ نے اشارہ کیا کہ پہلے ان کی پیاس بجھائی جائے اور جب پانی پلانے والے ان کے قریب گئے تو دیکھا کہ وہ اس سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ جب وہ پلٹ کر پہلے دونوں صحابیوں کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ لوگ بھی آبِ کوثر سے اپنی پیاس بجھا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں سے راضی ہو اور انھیں حوضِ کوثر سے اس طرح سیراب کرے کہ اس کے بعد انھیں تشنگی نہ محسوس ہو اور انھیں جنّت الفردوس کی سرسبزی و شادابی مرحمت فرمائے جس سے وہ ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں۔ آمین ؞

حضرت زیدالخیر رضی اللہ عنہ

(ایک صحابی رسُول جو ایمان لانے کے بعد کسی ادنیٰ ترین گناہ کے بھی مرتکب نہ ہوئے)

اِنسان فطری طور پر خیر و شر کا سرچشمہ ہے۔ جو لوگ اپنے دورِ جاہلیت میں بہتر ہوتے ہیں ان لوگوں میں اسلام لانے کے بعد بھی خیر و صلاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی کی دو تصویریں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک تصویر جاہلیت کے ہاتھوں نے بنائی ہے۔ اور دوسری اسلام کی انگلیوں کی مرہونِ منّت ہے۔

وہ صحابی حضرت زیدالخیل ہیں ــ زمانۂ جاہلیت میں لوگ انھیں اسی نام سے پکارتے تھے ــــ اور اسلام لانے کے بعد رسول کریمؐ نے انہیں زیدالخیر کے نام سے یاد فرمایا۔

عربی ادب کی کتابوں میں ان کی پہلی تصویر کے نقوش اُبھارے گئے ہیں۔ امام شیبانی نے قبیلۂ بنو عامر کے ایک بزرگ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"ایک سال ہمارے علاقے میں زبردست قحط اور خشک سالی نے ایسی قیامت برپا کی کہ کھیت اور باغ سوکھنے اور جانور ہلاک ہونے لگے۔ [illegible] تنگی سے تنگ آکر ہمارے قبیلے کا ایک شخص اپنے اہل و عیال

کو لے کر حیرہ[1] چلا گیا۔ اور انھیں وہاں چھوڑ کر ان سے رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

"جب تک میں تمہارے پاس لوٹ کر نہ آجاؤں تم لوگ یہیں میرا انتظار کرنا۔" پھر اس نے قسم کھائی کہ میں ان کے پاس آؤں گا تو مال و دولت کے ساتھ ورنہ اسی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا۔"

پھر اس نے کچھ زادِ راہ اپنے ساتھ لیا اور پیدل ہی چل پڑا۔ وہ دن بھر چلتا رہا۔ رات کے سائے گہرے ہونے لگے تو اس نے دیکھا کہ سامنے ایک خیمہ نصب ہے اور اس کے قریب ہی گھوڑے کا ایک بچھیرا بندھا ہوا ہے۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں کہا۔

"یہ پہلا مال غنیمت ہے جو میرے ہاتھ لگا ہے۔"

پھر وہ بچھیرے کے پاس پہنچا اور اس کی رسی کھول لی۔ اور ابھی اس پر سوار ہونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ "اسے چھوڑ دو اور جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

وہ بچھیرے کو چھوڑ کر آگے چل پڑا اور سات روز تک چلتا رہا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اونٹوں کا ایک باڑا تھا۔ باڑے کے قریب ہی بالوں کا ایک بہت بڑا خیمہ اور اس کے اندر چمڑے کا ایک چھوٹا سا گول خیمہ تھا۔ یہ چیزیں اپنے مالک کے صاحب ثروت اور خوش حال ہونے کا پتہ دے رہی تھیں۔ اس نے اپنے جی میں کہا۔ اس باڑے میں رہنے والے اونٹ بھی ہوں گے اور اس خیمے میں رہنے والے اس کے مکین بھی، پھر اس

---

[1] عراق کا ایک شہر جو نجف اور کوفہ کے درمیان واقع ہے۔

نے خیمہ کے اندرونی ماحول پر ایک نظر ڈالی ـــــ سُورج اب افق مغرب کے آخری سرے پر پہنچ کر غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا ـــــ تو اس نے خیمے کے وسط میں ایک نہایت ضعیف العمر شخص کو دیکھا۔ وہ اس کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ مگر بوڑھے کو اس کا بالکل علم نہیں ہوا۔ چند لمحوں کے بعد آفتاب غروب ہوگیا۔ اور اسے سامنے سے آتا ہوا ایک سوار نظر آیا جو بے مثل قدوقامت اور ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ ایک بلند و بالا گھوڑے پر سوار چلا آرہا تھا اور دو غلام اس کی دونوں جانب پیدل چل رہے تھے۔ باڑے میں پہنچ کر سب سے پہلے بڑا اونٹ بیٹھا۔ پھر باقی اونٹ بھی اس کے اردگرد بیٹھ گئے۔

"اس اونٹنی کو دوہو!" سوار نے ایک موٹی سی اونٹنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک غلام کو حکم دیا۔" اور شیخ کو پلاؤ!"

غلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اونٹنی کو دوہا اور دُودھ سے بھرا ہوا برتن بوڑھے کے آگے رکھ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ بوڑھے نے اس میں سے ایک دو گھونٹ دودھ پی کر برتن نیچے رکھ دیا۔ اس آدمی نے کہا کہ میں آہستہ سے اس کی طرف کھسک کر گیا، برتن اٹھایا اور اسے منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔ اور پھر واپس زمین پر رکھ دیا۔ غلام نے آ کر برتن اُٹھایا اور باہر چلا گیا۔ اور اپنے مالک سے بولا " آقا! "شیخ نے پورا دُودھ پی لیا۔"

سوار یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور دوسری اونٹنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا " اسے بھی دوہو اور شیخ کو پیش کرو۔"

غلام اس کا حکم بجالایا اور دُودھ سے بھرا ہوا برتن بوڑھے کے آگے رکھ دیا۔ بوڑھے نے اس میں سے صرف ایک گھونٹ پیا اور برتن نیچے رکھ دیا۔ میں نے اسے اُٹھا کر اس میں سے آدھا دُودھ پیا اور باقی دُودھ اس

خیال سے بچا دیا کہ کہیں سوار کے دل میں کوئی شُبہ نہ پیدا ہو جائے۔
پھر سوار نے دوسرے غلام کو ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس نے حسب حکم بکری کو ذبح کر دیا۔ تو سوار اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور بوڑھے کے لیے اس میں سے کچھ گوشت بھونا اور اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ جب وہ آسودہ ہو گیا تو باقی ماندہ گوشت اس نے اور اس کے دونوں غلاموں نے کھایا۔ پھر وہ سب اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد گہری نیند میں ڈوب کر خرّاٹے لینے لگے۔ اب میں چپکے سے اُٹھ کر بڑے اونٹ کے پاس پہنچا۔ اور اس کی رسی کھول کر اس پر سوار ہو گیا۔ اونٹ تیزی سے چل پڑا۔ دُوسرے اونٹ بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ میں رات بھر چلتا رہا۔ صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو میں نے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ مگر کوئی شخص میرا تعاقب کرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ میں نے اونٹ کی رفتار اور تیز کر دی اور برابر چلتا رہا حتیٰ کہ سورج کافی بلند ہو گیا۔ میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور فاصلے پر کوئی چیز نظر آئی جیسے کوئی گدھ یا کوئی دوسرا بہت بڑا پرندہ ہو۔ وہ چیز مجھ سے قریب ہوتی گئی۔ جب اس کی شکل صاف اور واضح طور پر نظر آنے لگی تو میں نے دیکھا کہ وہ کوئی آدمی ہے جو گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے۔ وہ برابر میرے نزدیک آتا گیا۔ یہاں تک کہ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی سوار تھا اور اونٹوں کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا تھا۔ اس وقت میں نے اُونٹ کو باندھ دیا اور ترکش سے ایک تیر نکال کر کمان پر چڑھا لیا۔ اور اونٹ کو اپنے پیچھے رکھا۔ یہ دیکھ کر سوار کچھ دُور فاصلے پر رک گیا۔ اور مجھ سے بولا۔

"اُونٹ کی رسّی کھول دو۔"

" ہرگز نہیں۔ میں اس کی رسی ہرگز نہیں کھولوں گا۔" میں نے کہا۔ " میں اپنے پیچھے حیرہ میں بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں اور فاقہ کی سختیاں جھیلتے ہوئے پریشان حال اہل وعیال کو چھوڑ کر آیا ہوں۔ اور یہ قسم کھائی ہے کہ میں ان کے پاس مال لے کر لوٹوں گا ورنہ اسی کوشش میں مرجاؤں گا۔" " تو سمجھ لو کہ تم مر چکے ہو۔ تمہارا بُرا ہو۔ اونٹ کی رسّی کھول دو۔" اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے گرج کر کہا " ہرگز نہیں کھولوں گا۔" میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

تب اس نے کچھ نرم ہوتے ہوئے کہا " تم بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اور دھوکا کھا رہے ہو۔" پھر بولا۔ " اچھا اونٹ کی نکیل لٹکاؤ۔" ـــ نکیل میں تین گرہیں تھیں ـــ " اور بتاؤ کون سی گرہ میں تیر ماروں۔"

میں نے بیچ والی گرہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے تیر چھوڑا اور وہ آکر اس کے بیچوں بیچ اٹک گیا۔ جیسے اپنے ہاتھ سے اس میں پھنسایا ہو۔ پھر اس نے یکے بعد دیگرے دونوں باقی گرہوں کو بھی اپنے تیروں کا نشانہ بنالیا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے تیر کو ترکش میں واپس رکھ دیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ میرے قریب آیا اور اس نے میری تلوار اور کمان کو اپنے قبضے میں کرتے ہوئے مجھ سے اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب میں چپ چاپ اس کے پیچھے سوار ہوگیا تو مجھ سے مخاطب ہوا۔ " تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیسا برتاؤ کروں گا۔"

" بہت برا" میں نے جواب دیا۔

" یہ کیوں؟" اس نے دریافت کیا۔

" اس لیے کہ میں نے تمہارے ساتھ غلط طریقہ اپنایا اور تمہیں سخت پریشانی میں مبتلا کیا۔ اور اب اللہ نے تمہیں میرے اوپر قابو دے دیا ہے۔"

میں نے احساس ندامت کے ساتھ کہا۔
اس نے کہا "تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک کروں گا جب کہ تم مہلہل کے ساتھ کھانے پینے میں شریک اور رات ان کے ہم نشین رہ چکے ہو؟"
مہلہل کا نام سنا تو میں نے اس سے کہا کہ "تم زید الخیل ہو؟"
"ہاں میں زید الخیل ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔
"تب تو میں ایک بہترین شخص کا قیدی ہوں۔ امید ہے کہ تم میرے ساتھ عمدہ اور شریفانہ برتاؤ کرو گے"۔
"تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی"۔ اُس نے کہا اور مجھے لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔
"خدا کی قسم اگر یہ اونٹ میرے ہوتے تو انہیں تمہارے حوالے کر دیتا لیکن یہ میری بہن کے ہیں۔ اب تم چند روز میرے پاس ٹھہرو۔ میں عنقریب ایک جگہ حملہ کرنے والا ہوں۔ اس میں مجھے کافی مال غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہے"۔ اس نے منزل پہ پہنچ کر مجھے اطمینان دلاتے ہوئے کہا اور تین دن کے بعد ہی اس نے بنی نمیر پہ حملہ کیا اس حملہ میں تقریباً سو اُونٹ اس کے ہاتھ آئے۔ اس نے وہ سارے اونٹ مجھے دے دیے اور میری حفاظت کے لیے اپنے کچھ غلاموں کو میرے ساتھ کر دیا۔ اور میں بخیر و عافیت حیرہ پہنچ گیا۔"
یہ زید الخیل کی ان کے دورِ جاہلیت کی تصویر تھی۔ ان کے زمانۂ اسلام کی تصویر کے نقوش کتب سیرت میں اس طرح نمایاں کیے گئے ہیں۔
جب نبی کریمؐ کی بعثت کی خبر زید الخیل کے کانوں میں پہنچی اور وہ ان

کی دعوت سے کسی قدر آگاہ ہوئے تو انھوں نے اپنی سواری کو سفر کے لیے تیار کیا اور اپنے قبیلے کے بڑے بڑے سرداروں کو یثرب چلنے اور نبیؐ سے ملاقات کرنے کے لیے بلایا۔ بنی طے کا جو وفد ان کے ساتھ روانہ ہوا اس میں زرابن سدوس، مالک بن جبیر اور عامر ابن جوین جیسے اکابر قبیلہ شامل تھے۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو سب سے پہلے مسجد نبوی کا رُخ کیا اور اس کے دروازے پر پہنچ کر اپنی اپنی سواریوں سے اُتر پڑے۔ اس وقت نبی کریمؐ منبر پر تشریف فرما تھے اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت فرما رہے تھے۔ حضورؐ کا خطاب سُن کر اور آپ کے ساتھ صحابۂ کرام کی گرویدگی اور ان کی توجہ و اثر پذیری کو دیکھ کر وفد کے لوگ سخت حیران و استعجاب سے دوچار ہوئے۔ رسُول اللہؐ نے ان لوگوں کو دیکھا تو مسلمانوں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔

"میں تمہارے لیے عزیٰ اور تمہارے دوسرے تمام معبودوں سے بہتر ہوں!" "میں تمہارے لیے بہتر ہوں اس سیاہ اونٹ سے جس کی خدا کو چھوڑ کر تم پرستش کرتے ہو۔"

رسُول اللہؐ کی یہ بات سُن کر زید الخیل اور ان کے ساتھیوں پر دو مختلف اور الگ الگ قسم کے اثرات مرتب ہوئے۔ کچھ لوگوں نے حق کی اس دعوت پر لبیک کہا اور آگے بڑھ کر اسے قبول کرلیا۔ اور کچھ لوگوں نے اس سے اعراض کیا اور ازراہِ تکبر اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔

زرابن سدوس نے مسلمانوں کی نگاہوں میں آپ کے لیے بے پناہ جذباتِ عقیدت و احترام کا عکس دیکھا تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا۔ اور اس کا دل خوف سے بھر گیا۔ اس نے اپنے ساتھ والوں سے کہا۔

"میری نگاہیں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہی ہیں جس کے آگے، تمام

عرب کی گردنیں جھک جائیں گی۔ خدا کی قسم میں ہرگز اس کے سامنے سرِتسلیم و اطاعت خم نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد وہ شام کی طرف نکل گیا اور وہاں اس نے راہبوں کی طرح اپنا سر منڈا کر نصرانیت اختیار کر لی۔ البتہ زید الخیل اور ان کے دوسرے ساتھیوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ حضورؐ نے جیسے ہی اپنا خطبہ ختم کیا۔ زید الخیل مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو گئے ـــــ وہ نہایت شکیل و وجیہہ، متناسب الاعضاء اور طویل القامت شخص تھے۔ جب گھوڑے پر سوار ہوتے تو ان کے دونوں پاؤں زمین تک پہنچ جاتے۔ ایسا لگتا کہ وہ گھوڑے پر نہیں کسی گدھے پر سوار ہیں ـــــ انھوں نے کھڑے ہو کر اونچی اور بلند آواز میں کہا۔

"یا محمد اشہد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وانك رسول اللّٰہ۔"

رسول اللہؐ نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا "تم کون ہو؟"

"میں زید الخیل ابن مہلہل ہوں"۔ انھوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

"تم زید الخیل نہیں۔ زید الخیرؓ ہو"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو یہاں تک پہنچایا اور تمہارے دل کو قبولِ اسلام کے لیے نرم کر دیا"۔ اس کے بعد وہ زید الخیرؓ کے نام سے معروف ہو گئے۔ پھر رسول اللہؐ ان کو اپنے مکان پر لے گئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ حضرت عمرؓ ابن خطاب اور صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی جب یہ لوگ گھر پہنچے تو رسول اکرمؐ نے زیدؓ کے بیٹھنے کے لیے ایک مسند زمین پر ڈال دیا۔ حضرت زیدؓ نے آپ کے سامنے اس پر بیٹھنے کو بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے اسے آپؐ کی طرف واپس کر دیا۔ یہ عمل دونوں جانب سے

تین بار دہرایا گیا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو رسول اللہؐ نے حضرت زید الخیرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

" زید الخیرؓ! تمہارے علاوہ اس سے پہلے جس کسی کے اوصاف میرے سامنے بیان کیے گئے اور بعد میں میں نے اس کو دیکھا تو اسے اس کے بیان کردہ اوصاف سے کمتر ہی پایا۔" پھر فرمایا:

" زید! تمہارے اندر دو ایسی خصلتیں ہیں جو خدا اور اس کے رسولؐ کے نزدیک نہایت پسندیدہ اور محبوب ہیں۔"

" اے اللہ کے رسولؐ وہ دونوں خصلتیں کون سی ہیں۔"؟ زیدؓ نے پرشوق لہجے میں سوال کیا۔

" وقار اور حلم" آپؐ نے جواب دیا۔

" خدا کا شکر ہے کہ اس نے میرے اندر ایسی خصلتیں پیدا کی ہیں جو اس کو اور اس کے رسولؐ کو پسند ہیں۔" زیدؓ نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ اور خوشی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔ پھر انھوں نے سر اُٹھا کر رسول اللہؐ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" اے اللہ کے رسولؐ! آپ مجھے صرف تین سو سواروں کا ایک دستہ دے دیں میں اس بات کی آپؐ کو ضمانت دیتا ہوں کہ میں ان کو ساتھ لے کر بلا د روم پر حملہ کروں گا اور زبردست فتح و کامرانی حاصل کروں گا۔"

آپؐ نے ان کی اس بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کو دیکھا تو فرمایا۔

" شاباش اے زید! تم کتنے باعزم اور حوصلہ مند ہو۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت زید الخیرؓ کے ساتھ آنے والے ان کی قوم کے تمام لوگوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

جب حضرت زید الخیرؓ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے وطن نجد کی طرف واپسی کا ارادہ کیا تو رسول اکرمؐ نے انھیں رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔
" یہ شخص کتنا عظیم ہے۔ اگر یہ مدینہ کی وبا سے محفوظ رہ گیا تو آئندہ زبردست کارنامے انجام دے گا۔"
(اس زمانے میں مدینہ منورہ میں وبائی بخار پھیلا ہوا تھا)
مدینہ منورہ سے روانگی کے قبل ہی حضرت زید الخیرؓ اس وبائی بخار سے متاثر ہو چکے تھے۔ انھوں نے اثناء سفر میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ قبیلہ بنی قیس کے علاقے سے کترا کے نکل چلو۔ جاہلیت میں ہمارے اور ان کے درمیان زبردست معرکہ آرائیاں اور گھمسان کی جنگیں ہو چکی ہیں۔ اور خدا کی قسم اب میں کسی مسلمان سے جنگ کرنا نہیں چاہتا۔
حضرت زید الخیرؓ شدید بخار کے باوجود مسلسل سفر کرتے رہے۔ ان کا بخار ہر آن بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنے قبیلہ میں پہنچ جائیں اور قبیلہ والے ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوں۔ راستے بھر ان کے اور موت کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ آخر کار موت نے اس جواں حوصلہ اور پر عزم انسان کو مغلوب کر لیا۔ انھوں نے راستے ہی میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور خدمت اسلام کی تمام حسین آرزوؤں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہٗ

ہجرت نبوی کے نویں سال شاہانِ عرب میں سے ایک شخص اپنی شدید نفرت و بیزاری، پیہم تکبرو اعراض اور مسلسل جحود و انکار کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہوا ۔ وہ بادشاہ تھا عدی بن حاتم طائیؒ جس کے باپ کی سخاوت و فیاضی آج تک ضرب المثل ہے ۔

ریاست وحکومت عدی کو اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی چنانچہ اس کے قبیلے قبیلۂ بنی طے نے اس کو اپنا بادشاہ بنا لیا ۔ مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ اس کے لیے مقرر کیا اور قبیلے کی قیادت و سربراہی کی باگ ڈور اس کے سپرد کر دی ۔

جب رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی الاعلان اسلام کی دعوت کا آغاز کیا اور عرب کے بہت سے قبائل ایک ایک کر کے ان کے حلقۂ اطاعت میں آتے چلے گئے تو عدی نے محسوس کیا کہ اس دعوت کے پس پردہ ایک ایسی قیادت اُبھر رہی ہے جو اس کی قیادت کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے اور اس کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس پیغام کے زیر سایہ ایک ایسی ریاست نشو و نما پا رہی ہے جو اس کی ریاست کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکے گی ۔ چنانچہ وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت اور ان کے ساتھ بغض و عداوت پر کمربستہ ہو گیا حالانکہ نہ تو وہ اس سے پہلے براہِ راست رسُول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف تھا نہ آپؐ کے دیدار سے مشرف ہوا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے تقریباً بیس قیمتی سال اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی نذر کر دیے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو قبولیتِ حق کے لیے کھول دیا۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کے مسلمان ہونے کی کہانی ایک دلچسپ اور ناقابلِ فراموش کہانی ہے۔ ہم یہ بات انھیں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کہانی کو اپنی زبان سے بیان کریں کیونکہ وہی اِس کے لیے زیادہ مناسب ہیں اور انہی کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ حضرت عدی اس کہانی کا آغاز کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"جس وقت میں نے محمدؐ کی نبوت اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا حال سُنا اس وقت عرب کے کسی شخص کو مجھ سے زیادہ ان کے ساتھ نفرت نہ تھی۔ میں اپنے قبیلے سے مالِ غنیمت کا چوتھائی وصول کیا کرتا تھا، جس طرح میرے علاوہ دوسرے سردار اپنے اپنے قبائل سے وصول کیا کرتے تھے۔ جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سُنا تو مجھے سخت ناگوار گزرا اور جب ان کی قوت و شوکت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا اور ان کے لشکر اور فوجی دستے عرب کے مشرق سے لے کر مغرب تک دھاوا مارنے لگے تو میں نے اپنے غلام کو، جو میرے اونٹ چرایا کرتا تھا، ہدایت کی:

"میرے سفر کے لیے چند تندرست و توانا اور سیدھی سادی اونٹنیاں ہر وقت تیار رکھو اور انھیں میرے قریب باندھ دو اور جب سُنو کہ محمدؐ کا لشکر یا ان کا کوئی فوجی دستہ اس علاقے میں داخل ہو گیا ہے تو مجھے اس کی خبر دو۔"

ایک دن صبح کے وقت غلام نے مجھ سے کہا :
"آقا! آپ اپنے علاقہ میں محمدؐ کے سواروں کی آمد پر جو کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اب اسے کر گزریے۔"
میں نے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا :
"میں نے کچھ جھنڈے اس علاقے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ان کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ محمدؐ کا لشکر ہے۔"
میں نے اس سے کہا :
"جن اونٹنیوں کو تیار رکھنے کا میں نے تم کو حکم دیا تھا انھیں فوراً میرے پاس لے آؤ۔"
پھر میں اسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے اہل و عیال کو اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر کوچ کرنے کا حکم دے دیا اور تیز رفتاری کے ساتھ سرزمین شام کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اپنے ہم مذہب نصاریٰ کے پاس پہنچ کر وہاں قیام کروں۔ میں عجلت میں اپنے گھر کے تمام افراد کو جمع نہ کر سکا۔ جب خطرے کی حدود سے نکل کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنی بہن کو قبیلۂ طے کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ اپنے وطن نجد ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔ اب میرے لیے اس کے پاس پلٹ کر جانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مجبوراً اسے چھوڑ کر اپنے ساتھ آئے اہل خانہ کو لیے شام چلا گیا اور وہاں اپنے ہم مذہبوں میں قیام پذیر ہو گیا اور میرے پیچھے میری بہن میری توقع کے مطابق ان حالات سے دوچار ہوئی جن کا پہلے ہی سے مجھے اندیشہ تھا۔
شام میں مجھ کو اطلاع ملی کہ محمدؐ کے سواروں نے ہمارے علاقے پر حملہ کیا۔ میری بہن کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ

یثرب لے جایا گیا اور مسجد کے دروازے کے قریب ایک احاطے میں بند کر دیا گیا۔ مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر میری بہن کی طرف سے ہوا تو اس نے اُٹھ کر ان سے عرض کیا :

"اے اللہ کے رسُول! میرے والد فوت ہو چکے ہیں، میرا سرپرست غائب ہے، آپ مجھ پر احسان کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان کرے گا۔"

تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پُوچھا :

"کون ہے تمہارا سرپرست ؟"

وہ بولی۔ "عدی بن حاتم۔"

"کون عدی بن حاتم ؟ اللہ اور اس کے رسُول سے بھاگنے والا ؟"

اتنا کہہ کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اس کے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ دُوسرے روز بھی جب آپؐ کا گزر اس کی طرف سے ہوا تو اس نے دوبارہ وہی باتیں کہیں جو کل کہہ چکی تھی اور آپؐ نے بھی وہی جواب دیا جو کل دے چکے تھے اور جب تیسرے دن آپؐ ادھر سے گزرے تو چونکہ وہ مایوس ہو چکی تھی اس لیے خاموش رہی، آپؐ سے کچھ نہیں کہا تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے ایک شخص نے اسے اشارہ کیا کہ اُٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرو۔ چنانچہ اس نے کہا :

"اے اللہ کے رسُول! میرا باپ فوت ہو چکا ہے اور میرا سرپرست لاپتہ ہے۔ آپؐ میرے اُوپر احسان فرمائیے، اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔" اور آپؐ نے اس پر احسان فرماتے ہوئے اس کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔ رہائی پاکر اس نے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کے پاس شام جانا چاہتی ہوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ جب تک تمہارے قبیلہ کا کوئی قابل اعتماد آدمی

نہیں مل جاتا روانگی میں جلدی نہ کرنا اور جب کوئی قابلِ اعتماد شخص مل جائے تو مجھے بتانا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد اس نے اس آدمی کے متعلق دریافت کیا جس نے اسے بات کرنے کا اشارہ کیا تھا، تو معلوم ہوا کہ وہ علیؓ ابن ابی طالب تھے۔

وہ مدینہ میں ٹھہری رہی۔ اسی دوران کچھ لوگوں کا وفد وہاں آیا جس میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے اوپر وہ اعتماد کر سکتی تھی۔ اس نے بارگاہِ نبوی میں عرض کیا کہ میرے قبیلے کے کچھ لوگ یہاں آئے ہیں، مجھے ان کے اُوپر مکمل اعتماد ہے، وہ مجھے میری منزل تک پہنچا دیں گے۔ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہننے کے کپڑے، سواری کی اونٹنی اور بقدر ضرورت زادِ راہ دے کر رخصت کیا اور وہ اُن کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

عدیؓ نے سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

ادھر شام میں ہم کو برابر اس کے حالات کی اطلاع ملتی رہتی تھی اور ہم اس کے شام پہنچنے کے منتظر تھے۔ حالانکہ میں نے محمدؐ کے مقابلے میں جو رویہ اپنایا تھا اس کے پیش نظر ہمارے دل ان اطلاعات کی تصدیق کرنے پر آمادہ نہیں تھے جو میری بہن کے ساتھ محمدؐ کے اس احسانِ عظیم کے سلسلے میں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔

انھیں حالات میں ایک روز میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو اپنے ہودج میں بیٹھی ہماری طرف چلی آرہی تھی۔ میرے دل نے کہا "یہ حاتم کی بیٹی ہے۔ یہ میری بہن ہے"! جب وہ کچھ اور قریب آئی تو ہم نے اسے صاف طور پر پہچان لیا۔ واقعی

وہ میری بہن ہی تھی۔ وہ ہمارے پاس پہنچ کر سواری سے اُترتے ہی خفگی کے لہجے میں بولی:

"بے مروّت..... ظالم..... تو نے اپنی بیوی اور بچّوں کو تو اپنے ساتھ لے لیا اور اپنے باپ کی اولاد اور اپنی عزّت کو پیچھے چھوڑ کر چلا آیا۔"

میں نے کہا "پیاری بہن! صرف اچھی باتیں کہو!" اور میں اسے راضی کرنے لگا۔ آخر کار وہ مجھ سے راضی ہوگئی اور پھر اس نے اپنے سارے حالات تفصیل سے بیان کیے جو بالکل وہی تھے جو ہم کو پہلے پہنچتے رہے تھے۔ پھر میں نے اس سے مشورہ کرتے ہوئے پوچھا ــــ وہ نہایت دُور اندیش، عقلمند اور سمجھ دار عورت تھی ــــ "اس شخص (محمدؐ) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا کہ "میری رائے یہ ہے کہ تم جلد از جلد ان کی خدمت میں پہنچ جاؤ۔ اگر واقعی وہ نبی ہیں تو تمہارے جیسے آدمی کا ان کی تصدیق و تائید میں پیچھے رہ جانا بڑی افسوسناک بات ہوگی اور اگر وہ بادشاہ ہیں تو ان کے یہاں تمہاری ناقدری نہیں ہوگی۔"

عدیؓ بن حاتم کہتے ہیں کہ پھر میں نے سفر کی تیاری کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ پہنچا۔ میں نے اس سے پہلے نہ تو ان کے پاس اپنے پہنچنے کی اطلاع بھیجی تھی نہ اُن سے اپنے لیے امان حاصل کی تھی البتہ مجھے اس بات کی اطلاع ہوگئی تھی کہ انھوں نے میرے متعلق اپنے اصحاب سے فرمایا ہے کہ "مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ عدی بن حاتم کا ہاتھ میرے ہاتھ دے دے گا۔"

جب میں مدینہ پہنچا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں نے حاضر خدمت ہو کر آپؐ کو سلام کیا تو پوچھا:

"کون ہو؟"

"عدی۔ حاتم طائی کا بیٹا"۔ میں نے جواب دیا۔

یہ سن کر آپؐ اپنی جگہ سے اُٹھے اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کی طرف لے چلے۔ آپؐ مجھے ساتھ لیے چلے جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں ایک نہایت بوڑھی عورت ملی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ وہ ان کو روک کر اپنی کسی ضرورت کے متعلق باتیں کرنے لگی۔ آپ ٹھہر کر پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں وہیں کھڑا رہا۔ کھڑا کھڑا میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ "بخدا یہ بادشاہ نہیں ہو سکتے"۔

بڑی بی سے فارغ ہو کر آپؐ نے پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور چلتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ گھر میں پہنچ کر آپؐ نے چمڑے کا ایک تکیہ اُٹھایا جس میں کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ آپؐ نے اس کو میری طرف ڈالتے ہوئے فرمایا کہ اس پر بیٹھ جاؤ۔ مگر آپؐ کے سامنے اس پر بیٹھتے ہوئے مجھے شرم آئی اور میں نے اسے بے ادبی پر محمول کرتے ہوئے عرض کیا، نہیں، اس پر آپ تشریف رکھیں لیکن آپؐ نے اصرار کر کے مجھے اس پر بٹھایا اور خود زمین ہی پر بیٹھ گئے کیونکہ گھر میں اس کے علاوہ دوسرا تکیہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا "بخدا یہ انداز کسی بادشاہ کا ہرگز نہیں ہو سکتا"۔ اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد آپؐ نے مجھے مخاطب کیا:

"عدی! بتاؤ کیا تم رکوسی نہ تھے؟ تم ایک ایسے دین کو اختیار کیے ہوئے نہ تھے جو نصرانیت اور صابئیت کے درمیان تھا؟"

"بے شک میں رکوسی تھا اے اللہ کے رسولؐ!" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم اپنی قوم سے مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ وصول نہیں کرتے

تھے، کیا تم ان سے وہ مال نہیں لیتے تھے جو تمہارے دین میں حلال نہ تھا؟" آپؐ نے دوبارہ فرمایا۔

"ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! میں ایسا کرتا تھا" اور اس وقت مجھے یقین ہوگیا کہ یہ نبی مرسل ہیں۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

"عدی! شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ آج مسلمان مفلس اور تنگ دست ہیں لیکن خدا کی قسم وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب ان کے یہاں مال و دولت کی اتنی فراوانی ہو جائے گی کہ اسے کوئی لینے والا نہیں ملے گا۔ یا شاید تم اس دین میں داخل ہونا اس لیے ناپسند کرتے ہو کہ آج مسلمانوں کی تعداد کم اور ان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے لیکن خدا کی قسم عنقریب تم سنو گے کہ ایک عورت تن تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر حج بیت اللہ کے لیے قادسیہ سے نکلتی ہے اور دورانِ سفر اسے خدا کے سوا کسی کا خوف نہیں محسوس ہوتا۔ یا شاید اس دین کو قبول کرنا تم کو اس لیے گوارا نہیں ہے کہ تم دیکھ رہے ہو کہ آج زمام حکومت دوسروں کے ہاتھوں میں ہے اور مسلمان اس سے محروم ہیں لیکن خدا کی قسم تم جلد ہی سن لوگے کہ بابل کے سفید محلات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوگئے اور کسریٰ کے خزانے ان کے قبضے میں آگئے۔"

"کیا؟ کسریٰ ابن ہرمز کے خزانے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں۔ کسریٰ ابن ہرمز کے خزانے۔" آپؐ نے پورے وثوق کے ساتھ فرمایا۔

"اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔"

حضرت عدی ابن حاتم رضی اللہ عنہ نے طویل عمر پائی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو پیشین گوئیاں تو حرف بہ حرف پوری ہوچکی ہیں صرف ایک باقی رہ گئی ہے اور خدا کی قسم وہ بھی یقیناً پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ وہ قادسیہ سے اونٹ پر سوار ہو کر نکلی اور بلا خوف و خطر مکہ پہنچ گئی۔ اور میں اس فوج کے اگلے دستے میں تھا جس نے کسریٰ کے خزانوں پر حملہ کر کے ان پر قبضہ کیا تھا، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیسری پیشین گوئی بھی ضرور پوری ہو گی۔"

اللہ کی مشیت کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات پوری ہوئی اور تیسری پیشین گوئی بھی خلیفہ زاہد و عابد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دورِ خلافت میں پوری ہو گئی۔ اس وقت مسلمان مالی اعتبار سے اس قدر خوش حال ہو گئے تھے کہ خلیفہ رح کا منادی فقراء و مساکین کو زکوٰۃ کا مال لینے کے لیے پکارتا مگر کوئی اس کو لینے والا نہ تھا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات صحیح اور حضرت عدی ابن حاتم رض کی قسم پوری ہوئی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

غفار کا قبیلہ ودّان کی وادی میں آباد تھا جو مکّہ کو باہر کی دنیا سے جوڑتی تھی۔ قبیلۂ غفار کی گزر بسر کا دار و مدار ان قلیل بخششوں اور عطیات پر تھا جو شام کی طرف آتے جاتے قریش کے تجارتی قافلوں سے انھیں حاصل ہوتی تھیں۔ بارہا ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر یہ قافلے ان کی مرضی کے مطابق انھیں مال نہ دیتے تو یہ انھیں بے دریغ لُوٹ لیا کرتے تھے۔

جُندُب بن جُنادہ جو عام طور سے اپنی کنیت ابوذر کے ساتھ مشہور ہیں، اسی قبیلے کے ایک فرد تھے مگر وہ اپنی شجاعت و دلیری، حلم و دانشمندی اور دُور اندیشی و بالغ نظری کی بنا پر ان میں سب سے ممتاز تھے۔ وہ اپنے ابنائے قبیلہ میں اس لحاظ سے بھی امتیازی خصوصیت کے مالک تھے کہ وہ ان بتوں سے سخت بیزار اور دل برداشتہ تھے جن کو ان کے قبیلے نے خُدا کے مقابلے میں اپنا معبُود بنا رکھا تھا۔ عرب میں پایا جانے والا دینی بگاڑ اور فرسودہ عقیدہ انھیں سخت ناگوار تھا۔ وہ کسی نئے نبی کے منتظر تھے جو لوگوں کی عقل و ذہن کو مطمئن کر دے اور انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔

ابوذر کے پاس، جبکہ وہ اپنی بستی میں تھے، مکّہ میں ظاہر ہونے والے نئے نبی کی خبریں پہنچیں تو انھوں نے اپنے بھائی اُنیس کو بلا کر کہا:

"پیارے بھائی! تم مکّہ چلے جاؤ اور اس شخص کے حالات معلوم کرو جو

اس بات کا دعویٰ کر رہا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور اس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اس سے اس کی باتیں سنو اور یہ ساری معلومات میرے پاس لاؤ۔"

اُنیس مکّہ پہنچے۔ وہاں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کر کے ان کی باتیں سُنیں اور اپنے قبیلے میں واپس آ گئے۔ ابوذرؓ جو بڑی بے چینی کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، ان سے ملے اور بڑے اشتیاق سے نئے نبی کے حالات دریافت کیے۔ اُنیس نے انھیں بتایا:

"بخدا میں ایک ایسے شخص سے ملا جو مکارمِ اخلاق کی دعوت دیتا ہے اور ایسا کلام سُناتا ہے جو شعر و شاعری سے بہت بلند چیز ہے۔

"لوگ اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟" ابوذر نے پوچھا:

"کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے، کاہن اور شاعر ہے!" اُنیس نے جواب دیا۔

"واللہ تمہاری باتوں سے میرا اطمینان نہیں ہوا، نہ میری وہ ضرورت پوری ہوئی جس کے لیے میں نے تم کو بھیجا تھا۔ میں خود وہاں جاکر براہِ راست اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری غیر موجودگی میں میرے اہل و عیال کی کفالت کی ذمّہ داری سنبھال سکتے ہو؟" ابوذر نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہ ذمّہ داری بخوشی ادا کروں گا۔ آپ جائیے۔ مکّہ والوں سے محتاط رہیے گا۔" اُنیس نے جواب دیا۔

ابوذر نے زادِ راہ کا انتظام کیا۔ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پانی کا برتن لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکّہ کی سمت چل پڑے۔ وہ مکّہ پہنچ گئے۔ مگر دل ہی دل میں ڈر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ قریش

اپنے معبودوں کی حمایت میں سخت غیظ و غضب میں بھرے ہوئے ہیں۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہر اس شخص کو سخت اور عبرت ناک سزائیں دیتے ہیں، جو محمدؐ کے اتباع کا خیال بھی اپنے دِل میں لاتا ہے۔ اس لیے انھوں نے کسی سے ان کے بارے میں پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ جس شخص سے وہ پوچھیں گے وہ ان کو ماننے والوں میں سے ہوگا یا مخالفین میں سے۔

رات کو وہ مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ اتفاقاً ادھر سے حضرت علیؓ کا گزر ہوا تو ایک غریب الوطن پردیسی سمجھ کر انھیں اپنے ساتھ لے گئے۔ رات انھوں نے ان کے گھر گزاری اور صبح کو اپنی چھاگل اور سامان کا تھیلا اُٹھا کر مسجد میں واپس آ گئے۔ اس دوران ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ابوذر نے دُوسرا دن بھی اسی طرح گزار لیا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکی۔ رات کو وہ پھر مسجد ہی میں لیٹ گئے۔ حضرت علیؓ کا ادھر سے گزر ہوا تو انھوں نے ان سے کہا: "کیا تمہیں ابھی تک اپنی منزل نہیں معلوم ہوئی؟" وہ پھر ان کو اپنے ساتھ لے گئے اور انھوں نے دوسری رات بھی ان کے یہاں بسر کی۔ آج بھی دونوں خاموش رہے لیکن تیسری رات حضرت علیؓ نے ان سے مکہ آنے کا سبب دریافت کیا تو ابوذر نے کہا:

"اگر وعدہ کرو کہ مجھے میرے مطلوب تک پہنچا دو گے تو میں اپنے آنے کی غرض بتا سکتا ہوں۔" حضرت علیؓ کے وعدہ کرنے پر انھوں نے کہا:

"میں دُور دراز سے قطع مسافت کر کے نئے نبی سے ملنے اور ان کا پیغام معلوم کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔" یہ سُن کر حضرت علیؓ کا چہرہ خوشی سے

چمک اٹھا اور بولے کہ "واقعی وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہ ..... اور وہ ...
دیکھو، صبح کو میں جدھر جاؤں میرے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ اگر میں تمہارے
لیے کوئی خطرہ محسوس کروں گا تو اس طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہوں
اور جب چلنے لگوں تو میرے پیچھے لگ جانا، اور جہاں جاؤں چلے آنا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شوقِ دیدار اور ان پر نازل شدہ وحی
کو سننے کی آرزو میں انھوں نے پوری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کو حضرت
علیؓ اپنے مہمان کو ساتھ لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف
مڑے بغیر چلتے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے
تو ابوذر نے کہا:

"السلام علیک یا رسول اللہ!"

"وعلیک السلام ورحمۃ وبرکاتہ۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
ان کے سلام کا جواب دیا۔

اس طرح ابوذر پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو اسلامی طریقے سے سلام کیا اور بعد میں سلام وتحیۃ کا یہی طریقہ مسلم
معاشرہ میں عام ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے
اسلام کی دعوت رکھی اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا اور انھوں نے
کسی پس وپیش کے بغیر کلمۂ حق کا اعلان کر دیا اور اپنی جگہ چھوڑنے
سے پہلے نئے دین میں داخل ہو گئے۔ وہ مسلمان ہونے والے چوتھے یا
پانچویں شخص تھے۔ قبولِ حق کی اس سنہری داستان کی بقیہ تفصیل انہی
سے سنیے:

"اس کے بعد کچھ دنوں تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھ مکّے میں مقیم رہا۔ اس دوران آپؐ نے مجھے اسلام کی تعلیم دی اور قرآن پڑھنا سکھایا پھر فرمایا: "مکّے میں کسی شخص کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر نہ ہونے دینا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تم کو قتل کر دیں گے۔" لیکن میں نے کہا کہ "جب تک مسجدِ حرام میں جا کر قریش کے سامنے دعوتِ حق کا برملا اظہار نہ کر لوں، مکّہ نہیں چھوڑ سکتا۔" اس کے بعد میں مسجد گیا۔ اُس وقت قریش کے لوگ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان کے درمیان کھڑے ہو کر باآوازِ بلند کہا:

"قریش کے لوگو! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسُول ہیں۔"

جوں ہی میری آواز ان کے پردۂ سماعت سے ٹکرائی وہ سب بُری طرح دہشت زدہ ہو گئے، تیزی سے اپنی جگہوں سے اٹھے اور یہ کہتے ہوئے میرے اوپر پل پڑے:

"مارو اس بے دین کو۔" اور مجھے بُری طرح زدوکوب کرنے لگے۔ اتنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم عباس بن عبدالمطلب کی نظر پڑی۔ انھوں نے مجھے پہچان لیا اور ان سے بچانے کے لیے میرے اُوپر جھک گئے۔ پھر ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا:

"تمہارا بُرا ہو۔ تم قبیلہ غفار کے ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو، جبکہ تمہارے تجارتی قافلے ان کی طرف سے ہو کر گزرتے ہیں؟" تب جا کر انھوں نے مجھے چھوڑا۔

جب میرے ہوش وحواس بجا ہوئے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپؐ نے میری یہ درگت دیکھ کر فرمایا:

"کیا میں نے تم کو اپنے اسلام کے اعلان سے منع نہیں کیا تھا؟"
"یہ میرے دل کی ایک خواہش تھی جو پوری ہو گئی"۔ میں نے عرض کیا۔

پھر آپؐ نے مجھے حکم دیتے ہوئے فرمایا:
"اپنے قبیلے میں جاؤ۔ جو کچھ یہاں دیکھا اور سُنا ہے انھیں بتاؤ اور ان کو اللہ کی طرف بلاؤ۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ان کو فائدہ پہنچائے اور تمہیں اس کا اجر عنایت فرمائے اور جب سُن لینا کہ میں غالب آگیا ہوں تو میرے پاس چلے آنا"

جب میں اپنے قبیلے میں واپس آیا تو میرا بھائی اُنیس مجھ سے ملا اور پوچھا کہ آپ نے کیا کیا؟ میں نے اس کو بتایا کہ میں محمدؐ کی تصدیق کر کے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اور اللہ تعالےٰ نے اس کے دل کو قبولِ اسلام کے لیے کھول دیا۔ اس نے کہا کہ مجھے آپ کے دین سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ میں بھی اس میں داخل ہوتا اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس کے بعد ہم اپنی ماں کے پاس گئے اور انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ تم لوگوں کے دین پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں بھی مسلمان ہوتی ہوں۔ اور اسی روز سے اس مسلمان گھرانے نے قبیلۂ غفار میں دعوت اِلی اللہ کا کام شروع کر دیا۔ ان کی دعوتی جدوجہد کے نتیجے میں بنو غفار کی ایک بڑی اکثریت دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئی اور ان کے اندر نماز قائم کی گئی۔ البتہ ان کے کچھ افراد نے کہا کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ آئیں گے تو اسلام قبول کریں گے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد وہ لوگ

بھی مسلمان ہو گئے۔ اس وقت آپؐ نے کہا :

"غفارٌ غفراللہ لھا واسلم سالمھا اللہ"۔ "اللہ تعالیٰ غفار کی مغفرت فرمائے اور اسلم کو سلامت رکھے"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے میں سکونت پذیر رہے یہاں تک کہ بدر، احد اور خندق کے معرکے گزر گئے۔ پھر وہ مدینہ منتقل ہو گئے اور ہر طرف سے کٹ کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہو رہے چنانچہ وہ آپؐ کی صحبت سے متمتع اور آپؐ کی خدمت کی سعادت سے بہرہ مند ہوتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا لحاظ کرتے اور انھیں دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی ان سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنی مسرت وشادمانی کا اظہار فرماتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب مدینۂ منورہ آپ کی پُرکشش شخصیت اور نورانی مجالس سے خالی ہو گیا تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے لیے وہاں ٹھہرنے کا یارا نہ رہا چنانچہ وہ شام کے ایک گاؤں میں چلے گئے اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانۂ خلافت تک وہیں مقیم رہے۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں وہاں سے منتقل ہو کر دمشق میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ مسلمان عام طور سے دنیا طلبی میں منہمک اور عیش وعشرت میں غرق اور آخرت سے غافل ہیں۔ اس بدلی ہوئی صورتِ حال کو انھوں نے بڑی شدّت سے محسُوس کیا۔ سختی سے اس کا نوٹس لیا اور بڑے تند و تیز لہجے میں اس پر اعتراضات کرنے لگے۔ لوگ ان کے اس رویّے سے تنگ آ گئے۔ بات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچی۔ انھوں نے حضرت ابوذرؓ

کو مدینہ طلب کرلیا۔ خلیفہ کی طلبی پر وہ مدینہ چلے گئے۔ لیکن وہاں بھی وہ ایسی صورت حال کا سامنا کررہے تھے جس سے دمشق میں ان کو سابقہ پیش آچکا تھا۔ وہاں بھی لوگوں کو دنیا کی طرف مائل دیکھ کر بہت جلد بد دل ہوگئے اور لوگ بھی ان کی سخت گیری اور تلخ وتند باتوں سے بے زار ہوگئے۔ آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں "ربذہ" چلے جانے کا حکم دیا۔ "ربذہ" مدینہ کی ایک مضافاتی بستی تھی۔ وہ وہاں منتقل ہوگئے اور لوگوں سے دُور، دنیاوی سازوسامان سے بے نیاز اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین کے اس طریقے پر چلتے ہوئے زندگی بسر کرنے لگے جو انھوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہوئے اختیار کیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ان کے گھر میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتا رہا جب اس کو وہاں کوئی سامان نظر نہیں آیا تو ان سے پوچھا: "ابوذر! آپ کا سامان کہاں ہے؟"

"وہاں، آخرت میں ہمارا ایک گھر ہے، ہم اپنے اچھے اور بیش قیمت سامان وہیں بھیج دیتے ہیں۔" حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا۔ اس آدمی نے ان کی بات سمجھتے ہوئے کہا: "پھر بھی، جب تک آپ اس دنیا میں رہیں زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ سامان تو ضروری ہے۔"

"لیکن گھر کا مالک ہم کو یہاں نہیں چھوڑے گا۔" حضرت ابوذرؓ نے کہا۔

ایک دفعہ شام کے گورنر نے اس ہدایت کے ساتھ ان کے پاس تین ہزار دینار بھیجے کہ "انھیں اپنی ضروریات پر خرچ کریں۔" لیکن انھوں نے یہ کہہ کر رقم واپس کردی کہ "کیا شام کے گورنر کو مجھ سے

زیادہ ذلیل کوئی شخص نہیں ملا تھا"۔

ہجرت نبوی کے بیسویں سال گردش زمانہ کے ہاتھوں نے اس عابد زاہد صحابی کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

مااقلّت الغبراء ولا اظلّت الخضراء من رجل اصدق من ابی ذرؓ۔

"زمین کی پشت پر اور آسمان کے زیر سایہ کوئی شخص ابوذر سے زیادہ سچا نہیں ہے"۔
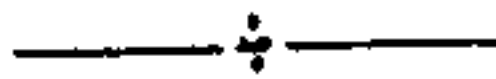
حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم رضی اللہ عنہٗ

وہ کون ہے جس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سات آسمانوں کی بلندی سے سخت ترین عتاب نازل کیا گیا؟ وہ کون ہے جس کی شان میں خدائے تعالیٰ کے یہاں سے وحی لے کر جبریل آتے تھے؟ وہ موذنِ رسول حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

ابن ام مکتوم مکہ کے باشندے اور خاندانِ قریش کے چشم وچراغ تھے۔ رحمی رشتے کے ذریعہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام قیس بن زائد اور والدہ کا اسم گرامی عاتکہ بنت عبداللہ تھا جو عام طور سے اپنی کنیت ام مکتوم کے ساتھ مشہور تھیں کیونکہ حضرت عبداللہ پیدائشی نابینا تھے۔

سرزمینِ عرب جس وقت نیرّ اسلام کی ضیا پاشیوں سے منور ہوئی، حضرت عبداللہ موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان کے لیے کھول دیا۔ وہ اہلِ اسلام کے اس گروہ میں شامل ہوگئے جس نے اولین مرحلے میں داعیٔ اسلام کی پکار پر لبیک کہا اور انھوں نے ان مصائب و آلام کا نہایت پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا جن سے مسلمان دوچار ہوئے۔ انھوں نے اس راہ میں کسی قسم کی قربانی اور فداکاری و

جاں ۔ سپاری سے دریغ نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ قریش کی اذیتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کی زیادتیوں کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا۔ اس راہ میں نہ تو ان کے پائے استقلال میں ذرہ برابر لغزش پیدا ہوئی نہ اُن کا حوصلہ پست ہوا نہ اُن کی قوتِ ایمانی میں کسی رُخ سے کمزوری کے آثار ظاہر ہوئے بلکہ ان مصائب نے ان کے اندر خدا کے دین سے ربطِ محکم، اس کی کتاب سے تعلق، اس کی شریعت سے اکتسابِ فیض اور بارگاہِ رسالت میں شوقِ حاضری کو مزید جلا بخشی۔

ان کے اندر بارگاہِ رسالت میں حاضری اور حفظِ قرآن کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ ہر فرصت کو غنیمت سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھاتے اور ہر موقع کو قیمتی جان کر اس کی طرف تیزی سے لپکتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس شوق میں وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسروں کے حصّے کا وقت بھی لے لیتے تھے۔ اس زمانے میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے بڑے بڑے سرداروں کی طرف بڑی شدّت کے ساتھ متوجہ تھے۔ آپؐ کے دل میں یہ نیک تمنّا ہر وقت سر اُٹھاتی رہتی تھی کہ رؤسائے قریش دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتے۔ انہی دنوں کی بات ہے ایک دن آپؐ عتبہ ابن ربیعہ، اس کے بھائی شیبہ ابن ربیعہ، عمرو بن ہشام (ابو جہل) امیہ ابن خلف اور خالد سیف اللہ کے والد ولید بن مغیرہ سے ملے۔ آپؐ ان کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کر کے ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے۔ آپؐ کی دلی خواہش تھی کہ وہ لوگ اسلام قبول کرلیں یا کم از کم آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمان کی اذیت رسانی سے باز آجائیں۔ ابھی آپؐ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ حضرت عبداللہ بن اُم مکتومؓ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے کتاب اللہ کی کوئی آیت پڑھنے کے لیے یہ کہتے ہوئے داخل ہوئے:

"اے اللہ کے رسولؐ! مجھے اس میں سے کچھ سکھا دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سکھایا ہے۔"

"لیکن آپؐ نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس کے برعکس آپ کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے اور اس امید میں کہ یہ اسلام قبول کرلیں گے اور ان کا اسلام خدا کے دین کی قوت اور اس کے رسُول کی دعوت کی تائید کا ذریعہ بنے گا، آپ بدستور ان قریشیوں کی طرف متوجہ رہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ملاقات سے فارغ ہوکر ابھی گھر جانے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ آپؐ کے اوپر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

عبس و تولّیٰ، ان جاءہ الاعمیٰ، وما یدریک لعلّہ یزّکّیٰ، اویذکّر فتنفعہ الذکریٰ، امّا من استغنیٰ، فانت لہ تصدّیٰ، وما علیک الّا یزّکّیٰ، وامّا من جاءک یسعیٰ، وھو یخشیٰ، فانت عنہ تلھّیٰ، کلّا انّھا تذکرۃ، فمن شاء ذکرہ، فی صحف مکرّمۃ، مرفوعۃ مطھّرۃ، بایدی سفرۃ، کرام بررۃ۔[1]

ترجمہ: "ترش رو ہوا اور بے رخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آگیا۔ تمہیں کیا خبر شاید وہ سُدھر جاتے اور نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟

---

[1] عبس ۱۰–۱۶

اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رُخی برتتے ہو، ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔ یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں، بلند مرتبہ ہیں، پاکیزہ ہیں، معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔"

یہ وہ سولہ آیتیں ہیں جنھیں حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضؓ کی شان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا۔ یہ آیات اپنے یوم نزول سے اب تک تلاوت کی جارہی ہیں اور قیامت تک برابر پڑھی جاتی رہیں گی۔

اس روز کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کا بہت لحاظ کرنے لگے۔ وہ جب بھی آپؐ کے یہاں قیام کرتے آپؐ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتے۔ وہ جب بھی آپ کی مجلس میں آتے آپ انھیں اپنے قریب بٹھاتے، ہمیشہ ان کی خیریت دریافت کرتے اور ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے یہ عبداللہ ابن ام مکتوم رضؓ ہی تو تھے جن کے بارے میں سات آسمانوں کی بلندی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت ترین عتاب نازل ہوا تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان پر قریش کا غیظ و غضب حد سے فزوں ہوگیا اور ان کے ظلم وستم کی کوئی انتہا نہ رہی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رضؓ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے ترکِ وطن کرنے میں بڑی پھرتی سے کام لیا۔ چنانچہ اصحابِ رسولِ میں سے وہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضؓ سب سے پہلے مدینہ پہنچے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے یثرب پہنچتے ہی اپنے رفیق حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ساتھ مل کر لوگوں سے ملاقات کرنے، انھیں پڑھانے اور دین کی دعوت دینے کا سلسلہ شروع کر دیا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہما کو موذن مقرر کیا تاکہ وہ دن میں پانچ مرتبہ کلمۂ توحید کا اعلان کریں، انھیں بہترین عمل (نماز) کے لیے بلائیں اور خیر و فلاح پر اُبھاریں۔ عام طور پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ نماز کے لیے اقامت کہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اذان حضرت ابن ام مکتومؓ دیتے اور اقامت بلالؓ کہتے تھے۔ رمضان المبارک کے مہینے میں تو ان دونوں کی شان ہی نرالی ہوتی تھی۔ مدینے کے مسلمان ایک کی اذان پر سحری کھاتے اور دوسرے کی اذان پر اس سے رُک جاتے تھے۔ حضرت بلالؓ رات کے پچھلے پہر اذان دے کر سوتے ہوئے لوگوں کو نیند سے بیدار کرتے اور حضرت ابن ام مکتومؓ طلوع فجر کا انتظار کرتے رہتے اور طلوع صبح صادق کے ساتھ ہی نماز کے لیے اذان دے دیتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ابن ام مکتومؓ کی عزت افزائی اور قدر دانی کا یہ حال تھا کہ آپؐ نے اپنی عدم موجودگی کے مختلف مواقع پر دسیوں بار ان کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر کیا۔ ان میں سے ایک موقع وہ بھی تھا جب آپؐ نے فتح مکّہ کے لیے مدینہ چھوڑا تھا۔

غزوۂ بدر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کی شان کو بڑھاتے، جہاد سے جی چرانے والوں پر ان کی فضیلت جتاتے، مجاہدین کو جہاد پر

اکساتے اور جہاد میں شرکت نہ کرنے والوں کے رویّے پر اظہارِ ناگواری کرتے ہوئے اپنے نبی پر قرآن کریم کی چند آیتیں نازل کیں تو حضرت ابن ام مکتومؓ کے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا اور اس شرف سے محرومی ان کو بہت شاق گزری اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا :

"اے اللہ کے رسولؐ! اگر میرے پاس استطاعت ہوتی تو میں جہاد میں ضرور شریک ہوتا۔" پھر انھوں نے نہایت سوزو گداز کے ساتھ اللہ سے دعا کی کہ وہ ان کے اور ان کے جیسے دوسرے معذور لوگوں کے بارے میں قرآن نازل فرمائے۔ جو اپنی جسمانی معذوریوں کے سبب شرکت جہاد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وہ بڑے خشوع وتضرع کے ساتھ دعا مانگتے :

اللّٰھمّ انزل عذری .... اللّٰھمّ انزل عذری .... خدایا! میرے عذر کے متعلق قرآن نازل فرما دے .... خدایا! ..... اور اللہ تعالیٰ نے جلد ہی ان کی اس دعا کو شرفِ قبولیت سے نواز دیا۔

کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ :

"ایک روز میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ یکایک آپؐ کے اوپر سکینت ووقار کی کیفیت طاری ہو گئی اور اسی حالت میں آپ کا زانوئے مبارک میرے زانو سے جا کر ٹک گیا، اس سے میرے زانو پر زبردست بوجھ پڑنے لگا، ایسا بوجھ کہ اس سے زیادہ وزن میں نے اب تک کسی چیز میں محسوس نہیں کیا تھا۔ جب آپؐ کے اوپر سے یہ کیفیت دور ہوئی تو مجھ سے فرمایا کہ "زید! لکھو، اور میں نے لکھا :

"لا یستوی القاعدون من المومنین والمجاھدون فی سبیل

اللہ باموالھم وانفسھم" (النساء-۹۵) "مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو گھر بیٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔"

تو ابن مکتوم نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسولؐ! جو لوگ جہاد میں شریک ہونے کی استطاعت سے محروم ہیں ان کا کیا ہوگا؟" ان کی اس بات کے ختم ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پھر وہی کیفیت طاری ہوئی۔ اس بار بھی آپؐ کا زانوئے مبارک میرے زانو پر پڑا اور میں نے وہی وزن محسوس کیا جو پہلی بار کیا تھا۔ پھر جب آپؐ کے اوپر سے نزول وحی کی وہ کیفیت دور ہوئی تو فرمایا:

"زید! جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھو" تو میں نے پڑھا لا یستوی القاعدون من المومنین" تو آپؐ نے فرمایا کہ لکھو: "غیر اولی الضرر" "کسی معذوری کے بغیر" اس طرح وہ استثناء نازل ہوا جس کی تمنا حضرت ابن ام مکتومؓ نے کی تھی۔

باوجودیکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عبداللہ ابن ام مکتومؓ اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو شرکت جہاد کی پابندی سے مستثنیٰ قرار دیا تھا، ان کا نفسِ بلند بیں معذوروں کے ساتھ بیٹھ رہنے پر رضامند نہ ہوا۔ انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہونے کا عزم بالجزم کر لیا۔ کیونکہ نفوسِ عالیہ مہماتِ امور کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے کاموں پر قانع نہیں ہوا کرتے چنانچہ اسی روز انھوں نے طے کر لیا کہ وہ کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنے لیے ڈیوٹی بھی متعین کر لی تھی وہ کہتے تھے کہ "مجھے دو صفوں کے درمیان کھڑا کر کے علَم میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں اسے بلند رکھوں گا اور اس کی حفاظت کروں گا کیونکہ نابینا ہونے کی وجہ سے میں بھاگ نہیں سکتا۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ۱۴ھ میں ایرانیوں کے ساتھ ایک ایسی فیصلہ کن جنگ کا عزم مصمم کیا جو ان کی حکومت کو زیروزبر کردے اور ان کی سلطنت کا خاتمہ کر کے عساکر اسلام کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کردے۔ اس لیے انھوں نے اپنے صوبائی گورنروں کو ہدایت بھیجی ۔

"ہر اس شخص کو جلد از جلد میرے پاس بھیج دو جس کے پاس اسلحہ یا گھوڑا یا قوت و شجاعت یا جنگی سوجھ بوجھ ہو"

اور مسلمانوں نے فاروقِ اعظم رض کی اس پکار پر لبیک کہا اور وہ جوق در جوق مرکزِ خلافت مدینہ کی جانب اُمڈ پڑے۔ ان لبیک کہنے والوں میں نابینا مجاہد حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رض بھی تھے۔ حضرت عمر رض نے اس لشکر کی قیادت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور انھیں ہدایات و نصائح کے ساتھ رخصت کیا۔ جب یہ لشکر قادسیہ کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوا اور جنگ کا دن آیا تو حضرت ابن ام مکتوم رض زرہ پہن کر پورے طور پر تیار ہو کر نکلے اور خود کو مسلمانوں کی علمبرداری اور اس کی حفاظت یا اس کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے دینے کے لیے پیش کیا۔

دونوں فوجوں میں تین دن تک سخت خونریز معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ دونوں فریق ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے کہ جنگوں کی تاریخ سے اس کی مثال بمشکل پیش کی جا سکتی ہے۔ آخر کار تیسرے روز مسلمانوں کی زبردست فتح کے ساتھ اس جنگ کا خاتمہ ہوا اور دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا اور کفر و بت پرستی کی سرزمین پر توحید کا جھنڈا لہرانے لگا۔

اس فتح مبین کی قیمت ہزاروں شہداء نے اپنے خون سے ادا کی تھی۔ ان شہیدوں میں حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم رض بھی تھے۔ وہ میدانِ جنگ میں اس حال میں پڑے ہوئے پائے گئے کہ اپنے خون میں لت پت، علمِ اسلام کو اپنے کندھے سے چمٹائے ہوئے تھے۔
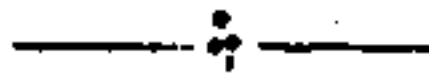
حضرت مجزاۃ بن ثور سدوسی رضی اللہ عنہٗ

یہ ہیں اللہ کے بہادر اور جیالے سپاہی۔ جو معرکۂ قادسیہ سے ظفریاب و فتح مند ہو کر واپس لوٹے ہیں، جنگ کے گرد و غبار کو اپنے اوپر سے جھاڑتے ہوئے اللہ کی نصرت و تائید پر اظہارِ مسرت کر رہے ہیں، اپنے شہید ہونے والے بھائیوں کو عطا ہونے والے زبردست اجر و ثواب پر مسرور ہیں اور اگلے کسی ایسے ہی معرکہ کے لیے سراپا شوق و انتظار ہیں جو اپنے حسن و جمال اور ہیبت و جلال میں معرکۂ قادسیہ کے مثل ہو۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ جہاد کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے امیرالمومنین کا حکم آجائے تاکہ وہ کسریٰ کی سلطنت اور ایرانی شہنشاہیت کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ اور ان مبارک و فرخندہ فال لوگوں کو زیادہ دیر تک انتظار کی زحمت نہیں اُٹھانی پڑی۔

وہ رہا امیرالمومنین حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا قاصد جو مدینے سے کوفہ کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ اس کے ساتھ کوفہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ کر بصرہ سے آنے والی اسلامی فوج کے ساتھ مل جائیں اور دونوں فوجیں ساتھ ساتھ مل کر "اہواز" کی طرف پیش قدمی کریں ہرمزان کا تعاقب کر کے اس پر فیصلہ کن ضرب لگائیں اور "تستر" پر قبضہ کرلیں، جو تاجِ کسریٰ کا ایک درخشندہ ہیرا اور

بلاد فارس کا تابندہ موتی ہے۔

امیر المومنین حضرت فاروقِ اعظمؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے نام جو حکم نامہ آیا ہے اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ وہ قبیلۂ بنو بکر کے سردار، عرب کے مشہور اور بہادر شہسوار حضرت مجزاۃ بن ثور سدوسی کو ضرور اپنے ساتھ لے لیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے فوج میں خلیفہ کے اس حکم کی تشہیر کرائی، اپنی فوج کی ترتیب درست کی اور اس کے میسرہ کی کمان حضرت مجزاۃ ابن ثور کے سپرد کر کے آگے بڑھے اور بصرہ سے آنے والے اسلامی لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے اور پھر دونوں فوجیں ایک ساتھ مل کر راہِ خدا میں جہاد کے لیے آگے روانہ ہو گئیں۔ یہ لوگ شہروں پر قبضہ کرتے اور قلعوں کو دشمنوں کے وجود سے پاک کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے رہے اور ہرمزان ان کے آگے بھاگتا ہوا تستر پہنچ کر قلعہ بند ہو گیا۔

تستر جس میں ہرمزان نے پناہ لی تھی —— ایران کا نہایت خوبصورت شہر تھا۔ اس کی آب و ہوا نہایت خوشگوار تھی اور اس کے حفاظتی انتظامات بہت سخت، قابلِ اعتماد اور ناقابلِ تسخیر تھے۔ اس وقت وہ نہایت ترقی یافتہ اور متمدن شہر تھا جس کے تذکرے تاریخ کے صفحات میں آج تک محفوظ ہیں۔ وہ ایک ایسی سطح مرتفع پر آباد تھا جس کی شکل گھوڑے سے مشابہ تھی۔ اس کو ایک بڑا دریا، دریائے دُجَیل سیراب کرتا تھا۔ اس کے اُوپر ایک فوّارہ تھا جسے ایران قدیم کے نامور اور عظیم حکمران شہنشاہ شاہ پور نے بنوایا تھا۔ دریائے دُجیل کا پانی زیر زمین سُرنگوں سے گزار کر اس فوارے تک پہنچایا جاتا تھا۔

تستر کا فوارہ اور اس کی سرنگیں دنیا کے تعمیری عجائبات میں شمار ہوتی تھیں۔ اسے بڑے بڑے مضبوط پتھروں سے اونچا کیا گیا تھا، اس کے ستون ٹھوس لوہے کے تھے اس کے فوارے اور اس کی سرنگوں کو سیسہ سے پلاسٹر کیا گیا تھا۔

شہر تستر کے اردگرد ایک عظیم الشان بلند و بالا فصیل تھی۔ جس نے پورے شہر کو اپنے احاطہ میں لے رکھا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی پہلی اور عظیم ترین فصیل ہے۔

پھر ہرمزان نے فصیل شہر کے اردگرد ایک گہری اور ناقابل عبور خندق کھدوا کر اس کے اندر ایران کی آزمودہ کار اور منتخب فوج جمع کر رکھی تھی۔ مجاہدین اسلام کے لشکر نے تستر پہنچ کر اس کے خندق کے چاروں طرف خیمہ زن ہو کر اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرے کو پورے اٹھارہ مہینے گزر گئے مگر مسلمان اس مدت میں اس خندق کو عبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس طویل مدت میں مسلمانوں، اور ایرانیوں کے درمیان اسی دفعہ معرکہ آرائی ہوئی، ہر معرکہ فریقین کے دو بہادروں کے درمیان مبارزت سے شروع ہوتا اور بعد میں گھمسان کی جنگ میں بدل جاتا۔

حضرت مجزاۃ بن ثور نے ان لڑائیوں میں ایسی غیر معمولی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا کہ اس کو دیکھ کر دوست اور دشمن بحر حیرت و استعجاب میں ڈوب گئے۔ انھوں نے انفرادی جنگ میں دشمن کے ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور دشمنوں کے دلوں میں ایسی ہیبت طاری کر دی کہ ایرانی سپاہی لرزہ براندام ہو جاتے اور ان کے ان کارناموں پر مسلمانوں کے سر فخر سے اونچے

ہو جاتے ۔ ان کے ان کارناموں کو دیکھ کر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ امیرالمومنین حضرت عمر بن خطابؓ لشکر مجاہدین میں ان کی شمولیت کے کیوں اتنا زیادہ خواہشمند تھے۔

آخری جنگ میں مسلمانوں نے ایرانیوں پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ایرانی اس کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور خندق کے اوپر بنے ہوتے پل کو مسلمانوں کے لیے خالی چھوڑ کر خود شہر کے اندر پناہ گزیں ہو گئے اور اپنے پیچھے شہر کے مضبوط قلعے کا پھاٹک بند کرلیا۔

اس صبر طویل کے بعد مسلمان اب جن حالات کا سامنا کر رہے تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ سخت صبر آزما تھے۔ ایرانی مسلمانوں کے اوپر برجوں سے پیہم تیروں کی بارش کر رہے تھے اور وہ فصیلوں کے اوپر سے لوہے کی زنجیریں لٹکاتے جن کے سروں پر انکس لگے ہوتے تھے جو آگ میں تپانے کی وجہ سے سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے ہوتے۔ جب کوئی مسلمان فصیل کے قریب پہنچنے یا اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو ایرانی اسے انھیں دہکتے ہوئے انکسوں میں پھنسا کر اوپر کھینچ لیتے اور اس کا جسم جل جاتا، بدن کا گوشت گر جاتا اور اس طرح اس کا کام تمام ہو جاتا۔

مسلمان سخت کرب والم میں مبتلا تھے وہ نہایت خشوع وخضوع اور انتہائی گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان پریشانیوں کو دور فرمائے اور دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کرے۔

اسی اثناء میں کہ حضرت موسیٰ اشعریؓ تستر کی اس عظیم الشان فصیل کو عبور کرنے کی تدابیر پر غور کر رہے تھے اور اس سے قریب قریب مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک تیر آکر گرا جو ان کی طرف

فصیل کے اُوپر سے پھینکا گیا تھا۔

حضرت ابو موسٰیؓ نے اسے دیکھا۔ اس میں کاغذ کا ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔ جس میں یہ پیغام تھا۔

"مسلمانو! میں تم لوگوں پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے اپنی جان، اپنے مال، اپنے اہل وعیال اور اپنے متبعین کے لیے امان طلب کر رہا ہوں اس کے بدلے میں تم لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشان دہی کر دوں گا جس سے گزر کر تم لوگ شہر میں داخل ہو سکتے ہو۔" جواب میں حضرت ابو موسٰیؓ نے ایک کاغذ پر امان کی تحریر لکھی اور اسے تیر کے ذریعے واپس اس کے پاس پھینک دیا اس شخص کو مسلمانوں کی طرف سے دیے ہوئے امان پر پورا اطمینان ہو گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمان اپنے وعدے کے کتنے سچے اور عہد کے کتنے پکے ہوتے ہیں۔ وہ تاریکی کے پردے میں خاموشی سے ان کے پاس آیا اور حضرت موسٰی اشعریؓ کو اپنی پوری حقیقت بتا دی۔

"ہم اس قوم کے سر برآوردہ لوگوں میں سے ہیں۔ ہرمزان نے میرے بڑے بھائی کو قتل کر کے اس کے مال و جائداد پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس کے اہل وعیال پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں۔ وہ میرے لیے بھی اپنے سینے میں بغض وعداوت کے جذبات چھپائے ہوئے ہے۔ میں خود کو اور اپنے بال بچوں کو اس کی دست درازی سے محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں نے آپ لوگوں کے عدل وانصاف کو اس کے جور وستم پر اور آپ لوگوں کے ایفائے عہد کو اس کی غدّاری پر ترجیح دی ہے۔ اور میں طے کر چکا ہوں کہ آپ لوگوں کو ایک ایسے خفیہ راستے کی نشان دہی کروں گا جس سے گزر کر آپ لوگ شہر تک پہنچ سکتے ہیں۔ آپ ایک ایسے آدمی کو میرے ساتھ

کر دیجئے جو شجاعت و جرأت اور عقل و فہم سے پورے طور پر آراستہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بہترین تیراک بھی ہو تاکہ میں اس کی نشان دہی کر دوں۔"

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت مجزاۃ ابن ثورؓ کو طلب فرمایا اور پوری بات ان کے گوش گزار کر کے فرمایا کہ "آپ اپنے قبیلے سے ایک ایسا آدمی مجھے دیجئے جو صاحب عقل و فہم ہونے کے علاوہ تیرنے کے فن میں بھی مہارت رکھتا ہو۔"

حضرت مجزاۃ نے کہا "اس کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔"

"اگر آپ اس کے لیے تیار ہیں تو پھر ٹھیک ہے خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔" حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا۔ اس کے بعد حضرت ابوموسیٰؓ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ وہ راستے کو اچھی طرح اپنے ذہن میں مستحضر کرلیں، دروازہ کی جگہ کو خوب پہچان لیں، ہرمزان کی قیام گاہ اور اس کی شخصیت کو ٹھیک سے ذہن نشین کرلیں اور اس کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی اور اقدام نہ کریں۔

حضرت مجزاۃ بن ثورؓ اپنے ایرانی رہبر کے ساتھ تاریکی میں روانہ ہوئے اور اس زیر زمین سرنگ میں داخل ہوئے جو دریا اور شہر کے درمیان بنائی گئی تھی۔ سرنگ کہیں کہیں اتنی کشادہ تھی کہ پانی میں کھڑے ہو کر چلنا ممکن ہوتا اور کہیں کہیں اتنی تنگ تھی کہ اس میں سے تیر کر گزرنا پڑتا، کہیں شاخ در شاخ، کہیں ٹیڑھی میڑھی اور کہیں بالکل سیدھی تھی۔ اس طرح چلتے ہوئے وہ اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سے شہر میں داخل ہونے کا راستہ نکلتا تھا۔ ایرانی رہبر نے انہیں اپنے بھائی کے قاتل ہرمزان کو دکھایا اور اس کی جگہ کی بھی نشان دہی کی جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ جب

حضرت مجزاۃ رضؓ نے ہرمزان کو دیکھا تو ان کے جی میں آیا کہ اس کے حلق میں ایک تیر مار کر اسے ہلاک کر دوں مگر فوراً ہی انھیں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ نصیحت یاد آگئی کہ وہاں کوئی اور اقدام نہ کرنا۔ انھوں نے فوراً اپنی اس خواہش پر لگام لگائی اور طلوع فجر سے پہلے اسلامی کیمپ میں واپس آگئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے تین تا سو ایسے جانبازوں کو تیار کیا جو شجاعت وثابت قدمی میں یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ تیراکی میں بھی ماہر تھے۔ حضرت مجزاۃ ابن ثورؓ کو ان کا قائد مقرر کیا۔ اور انہیں رخصت کرتے وقت کچھ نصیحتیں فرمائیں۔ اور شہر پر لشکر مجاہدین کے حملہ آور ہونے کے لیے ان کی تکبیر کو "شعار" قرار دیا۔

حضرت مجزاۃؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جہاں تک ممکن ہو وہ ہلکے پھلکے کپڑے پہن لیں کہ پانی میں بھیگنے سے ان کا وزن زیادہ نہ ہوجائے۔ اور انہیں تاکید کر دی کہ اپنے ساتھ تلوار کے علاوہ دُوسرا کوئی اسلحہ نہ رکھیں انہوں نے یہ بھی تاکید کر دی کہ سب لوگ اپنی اپنی تلواروں کو اپنے کپڑوں کے نیچے جسم کے ساتھ باندھ لیں۔ پھر ایک تہائی رات گزرنے کے بعد انہیں اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوگئے۔

حضرت مجزاۃ بن ثورؓ اور ان کے جانباز تقریباً دُو گھنٹے تک اسی خطرناک سرنگ کے دشوار گزار مراحل سے نبرد آزما رہے۔ کبھی وہ ان دشواریوں پر غالب آجاتے اور کبھی وہ انہیں زیر کر لیتیں۔ جب یہ لوگ سرنگ کے اس آخری سرے پر پہنچے جو شہر میں داخل ہونے والے راستے سے متصل تھا تو حضرت مجزاۃؓ نے دیکھا کہ سرنگ ان کے دو سو بیس جانبازوں کو نگل گئی ہے اور ان میں سے صرف اسیؓ آدمی بچے ہیں۔

حضرت مجزاۃؓ اور ان کے ساتھیوں نے شہر کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اپنی تلواریں بے نیام کرلیں اور قلعہ کے پہرہ داروں پر ٹوٹ پڑے اور چشم زدن میں انہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ پھر وہ لوگ دروازوں کی طرف جھپٹے اور انھیں کھولتے ہوئے زور سے تکبیر کی آواز بلند کی۔ دروازہ کے باہر سے مسلمانوں نے ان کی تکبیروں کا جواب دیا۔ اور صبح ہوتے ہوئے انہوں نے شہر پر ایک زوردار حملہ کردیا۔ پھر ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ایک ایسی ہلاکت خیز اور گھمسان کی جنگ چھڑ گئی جس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں بہت کم گزری ہوگی۔

دورانِ جنگ حضرت مجزاۃؓ کی نظر ہرمزان پر پڑی۔ وہ میدانِ جنگ میں ایک جگہ کھڑا ہوکر اپنی فوج کی کمان کر رہا تھا۔ حضرت مجزاۃؓ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور تلوار لے کر جھپٹ پڑے لیکن پھر لڑنے والوں کی بھیڑ میں وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نظر آیا۔ حضرت مجزاۃؓ تیزی سے اس کی طرف لپکے اور اس پر حملہ کردیا۔ حضرت مجزاۃؓ اور ہرمزان دونوں نے اپنی تلواروں سے ایک ساتھ ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ مگر بدقسمتی سے حضرت مجزاۃؓ کا وار چوک گیا اور ہرمزان کا وار ٹھیک اپنے نشانے پر پڑا۔ حضرت مجزاۃؓ زخمی ہوکر زمین پر گر پڑے اور دولتِ شہادت سے ہم کنار ہوگئے۔ ان کی شہادت کے بعد بھی مسلمانوں نے لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح و نصرت سے نوازا اور ہرمزان گرفتار کرلیا گیا۔

امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ کو اس فتح کی خوش خبری سُنانے کے لیے مسلمانوں کی ایک جماعت اس شان سے روانہ ہوئی کہ ان کے

آگے آگے ہرمزان تھا۔ اس کے سر پر اس کا ہیروں سے مرصع تاج تھا اور اس کے کندھے پر زردوزی سے مزین اس کی خوبصورت اور بیش قیمت چادر پڑی ہوئی تھی۔ اسی کے ساتھ فتح کی بشارت سنانے والے خلیفہ کے لیے ان کے جانباز اور بہادر شہ سوار حضرت مجزاۃ بن ثورؓ کی شہادت کی اندوہناک خبر بھی لیے جا رہے تھے۔
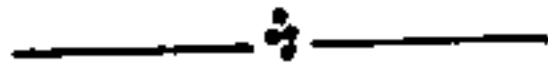
حضرت اُسَید بن حُضَیر رضی اللہ عنہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکّہ سے تاریخ اسلامی کی اوّلین دعوتی سفارت پر یثرب پہنچے اور قبیلہ خزرج کے ایک رئیس حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کے یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ انھوں نے ان کے مکان کو اپنی قیام گاہ، دعوتِ اسلامی کی نشرگاہ اور نبوت محمدیؐ کے اعلان و اظہار کا مرکز قرار دیا۔ باشندگانِ یثرب بڑے پیمانے پر اس نوجوان داعی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مجلسوں کی جانب متوجہ ہوئے ان کی شیریں گفتاری، ان کے پرزور استدلال، ان کی نرم طبعی اور ان کے چہرے سے پھوٹنے والے ملکوتی حُسن میں ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کی مجالس میں شریک ہونے کے لیے پروانہ وار کھنچے چلے آتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی تھی جو ان لوگوں کے لیے باعث کشش تھی، اور وہ تھی اللہ کی عظیم کتاب جس کی آیات کی تلاوت جب وہ اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی آواز اور دلکش و شیریں لہجے میں کرتے تھے تو سخت سے سخت دل موم ہو جاتے اور آنکھوں سے بے تحاشہ اشکوں کا سیلاب رواں ہو جاتا اور ان کی ہر مجلس میں کچھ نہ کچھ لوگ اسلام قبول کرکے مسلمانوں کی جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیتے تھے۔

ایک دن اسعد بن زرارہؓ اپنے مہمان، داعیٔ اسلام حضرت مصعب بن عمیرؓ

کے ساتھ قبیلۂ بنی عبدالاشہل کے کچھ لوگوں سے ملاقات کرنے اوران کو اسلام کی دعوت سے روشناس کرانے کے ارادے سے نکلے۔ وہ دونوں بنو عبدالاشہل کے ایک باغ میں گھس گئے اور کھجوروں کے سائے میں ایک کنویں کے پاس بیٹھ گئے اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کے گرد کچھ مسلمان اور بعض دوسرے لوگ جو اُن کی زبان سے قرآنِ کریم کی آیات اور اسلام کی دعوت سننا چاہتے تھے، جمع ہوگئے۔ وہ انھیں اسلام کی دعوت سمجھا رہے تھے اوراس کے اجر و ثواب کی خوشخبری سنا رہے تھے اور لوگ ان کی گفتگو کے حسن سے مسحور، خاموش و ہمہ تن گوش بیٹھے تھے۔ اسی دوران ایک شخص قبیلۂ اوس کے سرداروں، اُسید بن حضیر اور سعد بن معاذ کے پاس پہنچا اور ان کو بتایا کہ مکے سے آیا ہوا داعی ان کے مکان کے قریب ہی ٹھہرا ہوا ہے اور یہ جرأت اس کو اسعد بن زرارہ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ یہ اطلاع پاکر سعد بن معاذ نے اُسید بن حضیر سے کہا:

"اُسید! اس مکّی نوجوان کے پاس جاؤ جو یہاں آکر ہمارے کمزوروں کو بہکانے اور ہمارے معبودوں کو سفاہت و حماقت کی طرف منسوب کرنے میں مصروف ہے۔ اس سے ڈانٹ کر کہہ دو کہ خبردار آئندہ وہ ہمارے قبیلے میں قدم نہ رکھے ......" تھوڑی دیر رُک کر اس نے پھر کہا:

"اگر وہ میرے خالہ زاد بھائی اسعد بن زرارہ کا مہمان اور اس کی پناہ میں نہ ہوتا تو میں خود ہی اس سے نمٹ لیتا۔ تم کو زحمت نہ دیتا۔"

اُسید اپنا نیزہ اُٹھا کر باغ کی طرف روانہ ہوا۔ جب حضرت اسعد بن زرارہ نے اس کو آتے ہوئے دیکھا تو مصعبؓ بن عمیر سے بولے:

"مصعب! یہ اپنے قبیلے کا سردار، ان میں سب سے زیادہ حلیم و بردبار اور صاحبِ فضل و کمال شخص "اُسید بن حضیر" ہے۔ اگر یہ شخص اسلام

قبول کرلے تو اس کی اقتداء میں بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوجائیں گے۔ خدا کے دین کی دعوت اس کے سامنے پورے خلوص و دل سوزی اور سلیقے سے پیش کرنا۔"

اُسید بن حضیر اُن لوگوں کے پاس پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے حضرت مصعبؓ اور ان کے دوست کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا:

"تم دونوں کو ہمارے محلّے میں آنے اور ہمارے کمزور لوگوں کو گمراہ کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

حضرت مصعبؓ نے اُسید کی طرف چہرہ اُٹھایا جو ایمان کے نور سے جگمگا رہا تھا۔ اور بڑے پُرخلوص و دل کش لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے سردار! کیا آپ پسند کریں گے کہ میں آپ کے سامنے اس سے بھی اچھی بات پیش کروں؟"

"وہ کون سی بات ہے؟" اُسید نے پوچھا۔

"آپ اطمینان سے یہاں تشریف رکھیں اور غور سے ہماری باتیں سُنیں۔ اگر پسند آئیں تو انھیں قبول کرلیجیے گا اور ناپسند ہوں تو ہم یہاں سے واپس چلے جائیں گے اور پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کریں گے۔" حضرت مصعبؓ نے فرمایا۔

"تم نے انصاف کی بات کہی!" یہ کہتے ہوئے اُسید اپنا نیزہ زمین پر گاڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ پھر جب حضرت مصعبؓ نے اسے اسلام کی حقیقت سمجھائی اور قرآن کریم کی آیتیں پڑھ کر سُنائیں تو اس کی پیشانی پر پڑی ہوئی شکنیں دُور ہوگئیں، چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور وہ بولا:

"کتنی عمدہ ہیں یہ باتیں جو تم بتا رہے ہو اور کتنا قابلِ القدر ہے یہ کلام جس کی تم تلاوت کر رہے ہو... جب تم لوگ اسلام میں داخل ہونا چاہتے ہو تو کیا کرتے ہو؟"

"اس کے لیے آپ غسل کیجیے اور اپنے کپڑوں کو پاک کر کے اس بات کا اقرار اور اعلان کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود اور لائقِ پرستش نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، پھر دو رکعت نماز پڑھیے۔"

اُسیدؓ اٹھ کر کنویں پر گئے، انھوں نے اس کے پانی سے طہارت حاصل کی اور اس بات کی گواہی دی کہ خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور پھر انھوں نے دو رکعت نماز ادا کی اور اس طرح اس روز عرب کا ایک قابلِ رشک شہسوار اور قبیلۂ اوس کا ایک مشہور سردار لشکرِ اسلام میں شامل ہو گیا۔ عقل و دانائی میں ان کی برتری اور حسب و نسب میں ان کے فضل و شرف کی وجہ سے ان کے قبیلے نے ان کو "کامل" کے لقب سے نوازا تھا۔ وہ سیف و قلم دونوں کے دھنی تھے۔ وہ شہ سواری اور تیر اندازی میں کامل دست گاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے معاشرے میں قرأت و کتابت کے وصف سے متصف تھے جس میں ایسے افراد نہایت کمیاب تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے ہوں۔ ان کا قبولِ اسلام سعد بن معاذ کے قبولِ اسلام کا سبب بنا اور ان دونوں کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا قبیلۂ اوس کی ایک بڑی تعداد کے لیے مشرف بہ اسلام ہونے، مدینہ کے، رسول اللہؐ کے لیے دارِ ہجرت، اسلام کی پناہ گاہ اور اس کی عظیم سلطنت کا پایۂ تخت بننے کا ذریعہ بن گیا۔

حضرت اُسیدؓ نے جب سے حضرت مصعب بن عمیرؓ سے قرآن سُنا تھا، وہ

اس طرح اس کے گرویدہ ہو گئے تھے جیسے کوئی محب اپنے محبوب پر فریفتہ ہوتا ہے اور وہ اس کی طرف اس طرح متوجہ ہوتے تھے جیسے کوئی پیاسا سخت گرمی کے دن میں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے گھاٹ کی طرف لپکتا ہے۔ انھوں نے قرآن عظیم کی تلاوت کو اپنا شب و روز کا مشغلہ بنا لیا تھا۔ وہ یا تو خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے نظر آتے یا تنہائی میں کتاب الٰہی کی تلاوت میں مشغول دکھائی دیتے تھے۔

ان کی آواز بڑی پرسوز، ان کا لہجہ نہایت واضح اور ان کی ادائیگی بہت صاف تھی۔ عام طور سے قرآن کی تلاوت ان کو اس وقت بہت بھلی معلوم ہوتی تھی جب رات پرسکون ہوتی، ماحول پر مکمل اور گہرا سناٹا طاری ہوتا، لوگ سو چکے ہوتے اور دلوں میں تکدر نہ ہوتا اور صحابہ کرام کا یہ حال تھا کہ حضرت اُسیدؓ کی تلاوت کے اوقات کے منتظر رہتے اور ان کی تلاوت کو سننے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ شخص خود کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا جس کو ان سے قرآن سننے کا موقع مل جاتا، جیساکہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ ان کی تلاوتِ قرآن کی شیرینی و حلاوت سے آسمان والے بھی اسی طرح محظوظ ہوتے تھے جس طرح زمین والے اس سے لذت اندوز ہوتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت اُسیدؓ آدھی رات کو اپنے مکان کے پچھواڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے صاحبزادے یحییٰ ان کی بغل میں سورہے تھے اور ان کا گھوڑا، جس کو انھوں نے جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پال رکھا تھا، ان سے کچھ فاصلے پر بندھا ہوا تھا۔ رات خاموش اور تاریک تھی، آسمان صاف وشفاف اور خوبصورت تھا اور ستاروں کی بیدار نگاہیں پرسکون

زمین کو رقت و لطافت کے ساتھ تک رہی تھیں۔ حضرت اُسَید کے جی میں آیا کہ وہ اس نمناک فضا کو قرآن کی خوشبو سے معطر کردیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی دلکش آواز میں تلاوت شروع کی۔

الٓمٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَ مَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ، وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ۔

(البقرہ: ۱-۴)

الف، لام، م۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا گھوڑا اس طرح اچھل کود رہا ہے جیسے وہ اپنی رسّی توڑ لے گا۔ وہ خاموش ہوگئے۔ ان کے خاموش ہوتے ہی گھوڑا پُرسکون ہوگیا۔ پھر جب انھوں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا:

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

تو گھوڑا پہلے سے زیادہ اچھل کود کرنے لگا۔ وہ پھر خاموش ہوگئے۔ گھوڑا پھر پُرسکون ہوگیا۔ حضرت اُسیدؓ نے وقفے وقفے سے تلاوت کا عمل کئی بار دہرایا وہ جب بھی تلاوت شروع کرتے گھوڑا بھڑکنے اور بدکنے لگتا اور جب وہ رُک جاتے تو گھوڑا بھی پرسکون ہو جاتا۔ انھیں اپنے بیٹے یحییٰ کے متعلق یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں گھوڑا اسے کچل نہ دے۔ اس لیے وہ اس کو جگانے

کے لیے اس کے پاس گئے۔ یکایک ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ آسمان پر بادلوں کی چھتری سی تنی ہوئی ہے۔ وہ ایسا خوبصورت اور دل کش منظر تھا جو اس سے پہلے کبھی ان کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ ان بادلوں کے ساتھ چراغوں کی طرح کی کچھ روشنیاں معلق ہیں یہاں تک کہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر جب انھوں نے رات کا واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا:

"اُسید! وہ فرشتے تھے جو تمہاری تلاوت سننے کے لیے آئے تھے۔ اگر تم نے اپنی قرأت کا سلسلہ منقطع نہ کیا ہوتا تو لوگ انھیں کھلم کھلا دیکھ لیتے۔"

جس طرح حضرت اُسیدؓ کو کتاب الٰہی سے غیر معمولی عشق تھا اسی طرح انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ دو اوقات ایسے ہیں جن میں ان کے قلب کی صفائی اور ایمان کی جلا اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جب وہ قرآن پڑھ یا سن رہے ہوں اور جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے یا گفتگو کرتے دیکھ رہے ہوں۔

ان کے دل میں اکثر یہ تمنا کروٹیں لیتی رہتی تھی کہ ان کا جسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مس ہوجائے اور وہ جھک کر آپؐ کے جسد مبارک کا بوسہ لے لیں اور حسن اتفاق سے ایک بار ان کو یہ موقع نصیب ہوگیا۔ ایک دن حضرت اُسیدؓ لوگوں کو اپنی ظرافت اور بذلہ سنجی سے محظوظ کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خوش ہوکر اپنے ہاتھ کی انگلی ان کی کوکھ میں ہلکے سے چبھوئی تو انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ!

آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ تو آپؐ نے کہا کہ اسید! تم مجھ سے اس کا بدلہ لے لو۔ حضرت اسیدؓ نے کہا کہ آپ کے جسم پر اس وقت قمیض ہے اور جب آپؐ نے میرے جسم میں انگلی چبھوئی تھی تب میرے بدن پر کپڑا نہیں تھا۔ یہ سُن کر آپؐ نے جسم سے کپڑا اٹھا دیا اور حضرت اسیدؓ یہ کہتے ہوئے جسم مبارک سے چمٹ گئے اور آپ کی بغل اور کمر کے درمیانی حصۂ جسم کو چومنے لگے۔

"اے اللہ کے رسول! میرے والدین آپ پر قربان ہوں۔ یہ میری ایک آرزو تھی جسے میں اپنے دل میں اس وقت سے پال رہا تھا جب سے آپ سے متعارف ہوا تھا۔ آج میری وہ دیرینہ تمنا پوری ہو گئی۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت اسید کی محبت کا جواب محبت سے دیتے تھے اور ان کی سبقت اسلام کا بہت زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ نیز اس بات کا بھی آپ بہت خیال کرتے تھے کہ انھوں نے غزوۂ احد میں اپنی جان پر کھیل کر آپ کا دفاع کیا یہاں تک کہ اس روز ان کو نیزے کے سات جان لیوا زخم آئے تھے۔ حضرت اسید کو اپنے قبیلہ میں جو قدر و منزلت حاصل تھی اس کا بھی آپ کو پورا پورا احساس تھا اسی لیے جب وہ کسی کی سفارش کرتے تو آپ ان کی سفارش ضرور قبول فرماتے تھے۔ حضرت اسید کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں انصار کے ایک گھر کا ذکر کیا جو نہایت محتاج اور ضرورت مند تھا اور اس میں اکثریت خواتین کی تھی، تو رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا:

"اسید! تم میرے پاس اس وقت آئے ہو جب میں وہ سارا مال تقسیم کر چکا ہوں جو میرے ہاتھ میں تھا۔ اب جب تم سننا کہ میرے پاس مال آیا ہے تو ان لوگوں کا مجھ سے ذکر کرنا!"

اس کے کچھ دنوں کے بعد جب آپ کے پاس خیبر سے مال آیا تو آپ نے اسے مسلمانوں میں تقسیم فرمایا اور خاص طور سے انصار کو اور اس گھر والوں کو کافی مقدار میں مال دیا تو میں نے کہا:

"اے اللہ کے نبیؐ! اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی طرف سے بہترین جزا دے"! تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"انصار کے لوگو! اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو بہترین جزا دے جہاں تک میں جانتا ہوں تم لوگ صبر و قناعت اختیار کرنے والے لوگ ہو۔ میرے بعد تم لوگوں کے حقوق نظر انداز کیے جائیں گے اور دوسروں کو تمہارے اوپر ترجیح دی جائے گی۔ جب ایسا ہو تو تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے ملاقات ہو۔ ہماری ملاقات حوض پر ہوگی"۔

حضرت اسید کہتے ہیں کہ جب خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر بن خطابؓ کے حوالے ہوئی تو انھوں نے ایک دن مسلمانوں میں مال اور سامان تقسیم کیا اور میرے پاس ایک معمولی سا جوڑا بھیجا اور اس اثناء میں کہ میں مسجد میں تھا۔ میری طرف سے ایک قریشی جوان کا گزر ہوا جس کے جسم پر انہی جوڑوں میں سے ایک لمبا چوڑا جوڑا تھا جسے وہ زمین پر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے ایک ساتھی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا ذکر کیا اور اس آدمی نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر میری بات ان کو بتا دی۔ وہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں اس وقت نماز میں مشغول تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسید! نماز پڑھ لو۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ تم نے کیا کہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا اور دیکھا تھا ان کے گوش گزار کر دیا تو انھوں نے فرمایا:

" اللہ تعالیٰ تم کو معاف فرمائے ۔ وہ جوڑا میں نے فلاں کے پاس بھیجا تھا، وہ ایک انصاری ہیں جن کو بیعتِ عقبہ، غزوۂ بدر اور جنگِ اُحد میں شرکت کا شرف حاصل ہے ۔ ان سے وہ جوڑا اس قریشی نوجوان نے خرید کر پہنا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ جس بات کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو دی تھی وہ میرے زمانے میں پیش آئے گی ۔ ؟" تو حضرت اسیدؓ نے کہا :

"امیر المومنین! خدا کی قسم میرا خیال ہے کہ وہ بات آپ کے زمانے میں نہیں پیش آئے گی ۔"

حضرت اسید بن حضیرؓ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے ۔ حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت ہی میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا ۔ انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ ان کے ذمّے چار ہزار درہم قرض ہے ۔ ان کے ورثا نے چاہا کہ قرض کی ادائیگی کے لیے ان کی زمین کو فروخت کر دیں لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے کہا میں اپنے بھائی اسیدؓ کے اہل و عیال کو تہی دست اور لوگوں کے لیے بار نہیں بننے دوں گا ۔

پھر انھوں نے قرض خواہوں سے گفتگو کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ ان کی زمین کی پیداوار چار سال تک ایک ہزار درہم سالانہ کے حساب سے خرید لیا کریں اور اس طرح اپنا قرض وصول کر لیں ۔

——— ❊ ———

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

اس جلیل القدر صحابی رسول نے مجد و شرف کو ہر جہت سے سمیٹ رکھا تھا۔ صحبت و قرابت اور علم و تقوی کے فضائل ان کے وجود میں یکجا ہو گئے تھے۔ اگر ان کی ولادت میں تھوڑی سی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے شرف سے محروم رہ گئے ہوتے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادرِ عم زاد، امت محمدیہ کے زبردست عالم اور اس کے علم کے بحرِ زاخر تھے۔ وہ دن کو روزہ رکھتے، رات بارگاہِ خداوندی میں قیام و قعود اور رکوع و سجود میں گزارتے۔ سحر تک توبہ و استغفار میں مشغول رہتے اور خشیت الٰہی سے بکثرت گریہ وزاری کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ کثرتِ گریہ سے ان کے رخساروں پر اشکوں کے نشانات نمایاں تھے۔

یہ صحابی ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ امت کے ربانی، کتاب اللہ کے عالم، اس کے معانی سے آگاہ، اس کی تہہ میں اترنے والے اور اس کے رموز و اسرار اور حقائق و غوامض کو اچھی طرح سمجھنے والے۔ اس کے علاوہ انھوں نے عام مسلمانوں کے استفادہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ہزار[1] چھ سو ساٹھ حدیثیں بھی روایت کی ہیں، جن کو امام بخاریؒ

---

[1] یہ حضرت ابن عباسؓ کی کل مرویات کی تعداد ہے۔ م

اور امام مسلمؒ نے صحیحین میں ثبت کیا ہے۔

ولادت کے بعد ان کی والدہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئیں اور آپؐ نے اپنا لعاب مبارک ان کے حلق میں ڈالا۔ اس طرح سب سے پہلی چیز جو ان کے منھ میں رہ گئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی حکمت و پرہیز گاری بھی ان کے اندر داخل ہوئی۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ — اور جس کو حکمت عطا کی گئی، اس کو بہت زیادہ خیر مرحمت کیا گیا۔

خانوادۂ بنی ہاشم کے اس نونہال نے جب سن شعور کی سرحد میں قدم رکھا اور ہوش و خرد کی آنکھیں کھولیں تو خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں پایا اور اس نے اسے اس طرح لازم پکڑ لیا جیسے انسان کی دونوں آنکھیں ہمیشہ ایک دوسری کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو کا ارادہ کرتے تو یہ اُن کے لیے وضو کا پانی لاتا جب آپؐ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو یہ آپؐ کے پیچھے نماز پڑھتا اور جب آپؐ سفر پر روانہ ہوتے تو یہ سواری پر آپؐ کے پیچھے بیٹھتا۔ غرض سائے کی طرح ہر وقت آپؐ کے ساتھ لگا رہتا۔ اور اس کے ساتھ ہوتا اس کا قلب بیدار، اس کا ذہن صافی اور اس کا غیر معمولی حافظہ، جس کے سامنے عصر حاضر کے تمام آلات ضبط واندراج ہیچ ہیں۔

حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کا ارادہ فرمایا۔ میں نے جھٹ پٹ پانی کا انتظام کر دیا۔ آپؐ بہت خوش ہوئے۔ پھر جب آپؐ نے نماز کا قصد فرمایا تو مجھے اپنی بغل میں کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ لیکن میں آپؐ کی بغل میں کھڑا ہونے کے بجائے پیچھے کھڑا ہوا۔ نماز

ختم کرکے آپؐ نے میری طرف رُخ کرتے ہوئے فرمایا۔

"عبداللہ! تم میرے برابر میں کیوں نہیں کھڑے ہوئے؟"

"اے اللہ کے رسولؐ!" میں نے بڑے ادب سے جواب دیا۔"آپ کی شخصیت میری نظر میں اِس سے بہت بلند و برتر ہے کہ میں آپ کے برابر میں کھڑا ہوتا۔"

میرا یہ جواب سُن کر آپ نے اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے دُعا فرمائی۔

"اَللّٰھُمَّ اٰتِہِ الحِکْمَۃَ۔" "خدایا! اسے حکمت و بصیرت عطا فرما۔"

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس دعار کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ایسی حکمت و بصیرت عطا فرمائی جس کے ذریعہ وہ بڑے بڑے حکمار اور اربابِ فہم و بصیرت سے فائق و ممتاز ہوگئے۔

یقیناً آپ ان کی حکمت و دانائی کی ایک جھلک دیکھنا پسند کریں گے۔ اس کے لیے آپ میرے ساتھ اس جگہ کھڑے ہوجائیں۔ یہاں سے آپ اپنی پسندیدہ چیز دیکھ سکیں گے۔

جب حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے اختلاف کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کچھ حامیوں نے اُن سے علیحدگی اختیار کرلی اور اُن کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوگئے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔

"امیرالمومنینؓ! اگر آپ اجازت دیں تو میں اُن لوگوں کے پاس جاکر اس معاملے میں اُن سے گفتگو کروں۔"

"مجھے اندیشہ ہے، کہیں وہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچادیں۔" حضرت علیؓ

نے جواب دیا۔
"خدا نے چاہا تو اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوگی۔" انھوں نے اطمینان سے کہا۔
پھر وہ اُن کے پاس پہنچے۔ وہ لوگ بڑے عابد و زاہد اور نہایت عبادت گزار تھے۔ انھوں نے اس سے پہلے اُن سے زیادہ عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے والے لوگ نہیں دیکھے تھے۔ خوارج نے اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور تشریف آوری کا سبب دریافت کیا۔ اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں آپ لوگوں سے گفتگو کرنے آیا ہوں تو ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ ان سے گفتگو نہ کرو لیکن باقی لوگوں نے کہا کہ فرمائیے ہم آپ کی باتیں سُننے کے لیے تیار ہیں۔ تب حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔
"یہ بتائیے کہ آپ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابنِ عم، اُن کے داماد اور سب سے پہلے ایمان لانے والے شخص (حضرت علیؓ) سے کس بات پر ناراض ہیں؟"
"ہم کو ان کی تین باتیں ناپسند ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔
"وہ کون سی تین باتیں ہیں؟" حضرت عبداللہؓ نے دریافت کیا۔
"پہلی بات تو یہ ہے۔" اُنھوں نے گناتے ہوئے کہا۔ "کہ انھوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو حَکَم تسلیم کر لیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے عائشہؓ اور معاویہؓ سے جنگ کی لیکن نہ تو انھوں نے مالِ غنیمت پر قبضہ کیا نہ جنگی قیدیوں کو گرفتار کیا اور تیسری بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نام سے امیر المومنین کا لقب ہٹا دیا، حالانکہ مسلمانوں نے

اُن سے بیعت کی تھی اور انھیں امیر منتخب کیا تھا۔"

یہ سُن کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے دریافت کیا کہ "اگر میں آپ لوگوں کی ان باتوں کا جواب کتاب اللہ اور حدیث رسولؐ سے دے دوں تو کیا آپ لوگ اپنے موجودہ موقف کو ترک کر کے امیرالمومنینؓ کی مخالفت سے باز آجائیں گے؟"

انھوں نے کہا کہ " اگر ہم آپ کی باتوں سے مطمئن ہو گئے تو ان کی مخالفت ترک کر کے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔"

"آپ لوگوں کا پہلا اعتراض یہ ہے۔" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "کہ حضرت علیؓ نے اللہ کے دین کے معاملے میں انسانوں کو حَکَم مان لیا! تو سُنیئے اس سلسلہ میں اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ۔ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔	اے لوگو جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر کرنا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے۔
(مائدہ - ۹۵)	

مَیں آپ لوگوں سے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ انسانوں کے خون اور ان کی جانوں کی حفاظت اور ان کے درمیان صلح صفائی کرانے کے لیے انسانوں کو حَکَم مان لینا زیادہ بہتر ہے یا ایک خرگوش کے معاملے میں، جس کی قیمت بہ مشکل چوتھائی درہم ہوتی ہے؟" انھوں نے کہا کہ " مسلمانوں کو خون ریزی سے بچانے اور ان کے مابین صلح صفائی کرانے کے لیے حَکَم مان لینا زیادہ بہتر ہے۔"

"تو گویا یہ مسئلہ صاف ہوگیا؟" حضرت ابن عباسؓ نے ان سے دریافت کیا۔

"ہاں یہ مسئلہ صاف ہوگیا۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اب رہا آپ لوگوں کا یہ اعتراض" انھوں نے سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ "کہ حضرت علیؓ نے جنگ کی مگر انھوں نے جنگی قیدی نہیں پکڑے جیسے کہ رسول اللہؐ نے پکڑے تھے۔ تو کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ اپنی ماں عائشہؓ کو گرفتار کرکے جنگ میں گرفتار ہونے والی دوسری عورتوں کی طرح انھیں اپنے لیے حلال کرلو؟ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو تم کافر ہوگئے۔ اور اگر تم کہتے ہو کہ وہ ہماری ماں نہیں ہیں، تو اس صورت میں بھی تم کفر کے مرتکب ہوئے۔ کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ۔ (الاحزاب۔۶)

بلاشبہ نبی تو اہل ایمان کے لیے ان کی اپنی ذات پر مقدم ہے، اور نبی کی بیویاں ان کی مائیں ہیں۔

تو اپنے لیے ان دو صورتوں میں سے جو چاہو پسند کرلو۔

پھر انھوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ مسئلہ بھی صاف ہوگیا؟

انھوں نے آپ کے جواب سے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "ہاں، یہ مسئلہ بھی صاف ہوگیا۔"

آخری اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔

"رہا تمہارا یہ اعتراض کہ حضرت علیؓ نے اپنے نام سے" امیرالمومنین" کا لقب حذف کردیا تو ایسا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس وقت کیا تھا، جب آپؐ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلحنامہ مرتب کراتے ہوئے

فرمایا تھا کہ لکھو۔

"ھٰذا ما قاضیٰ علیہِ محمدٌ رَّسُولُ اللہِ" یہ وہ صلحنامہ ہے جسے محمد رسول اللہؐ نے طے کیا، تو قریش کے نمائندے نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا کہ "اگر ہم کو یہ تسلیم ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو نہ ہم آپ کو بیت اللہ سے روکتے نہ کبھی آپ سے قتال کرتے۔ آپ محمد رسول اللہ کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھوائیے"۔ تو آپؐ نے یہ کہتے ہوئے ان کا یہ ناجائز مطالبہ تسلیم کرلیا کہ

"وَاللہِ اِنّی لَرَسُولُ اللہِ وَ اِنْ کَذَّبْتُمُوْنِی"۔ "خدا کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں۔ بھلے ہی تم میری تکذیب کرو۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارے اس اعتراض کا بھی تشفی بخش جواب مل گیا ہے تو انھوں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا کہ ہاں، ہم کو پورے طور پر اطمینان حاصل ہوگیا۔"

اس ملاقات اور حضرت ابن عباسؓ کی پرزور، مدلل اور حکمت و بصیرت سے بھرپور اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں سے بیس ہزار افراد حضرت علیؓ کی طرف واپس آگئے۔ البتہ چار ہزار آدمیوں نے حضرت علیؓ سے عناد و دشمنی اور حق و انصاف سے اعراض کی بنا پر اپنے پچھلے موقف پر اڑے رہنا پسند کیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی کم سنی اور نو عمری کے باوجود حصولِ علم کے ہر طریقے کو اختیار کیا اور اس راہ میں انتہائی جان فشانی اور ان تھک محنت سے کام لیا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چشمۂ صافی سے آپؐ کی زندگی بھر سیراب ہوتے رہے۔ آپؐ کے وصال کے بعد وہ باقی ماندہ علماء صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے

بھرپور استفادہ کیا۔ وہ اپنے شوقِ علم کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔
" جب کسی صحابی کے متعلق مجھے معلوم ہوتا کہ ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث ہے تو میں قیلولہ کے وقت دوپہر میں ان کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ اور اپنی چادر کو سرہانے رکھ کر ان کے گھر کی چوکھٹ کے پاس لیٹ جاتا۔
اس وقت دوپہر کی تیز اور گرم ہوائیں بہت سا گردوغبار اُڑا کر میرے اُوپر ڈال دیتیں۔ حالانکہ اگر میں ان کے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت مانگتا تو مجھے اس کی اجازت مل جاتی۔ لیکن میں ایسا اس لیے کرتا تھا کہ ان کی طبیعت مجھ سے خوش ہو جائے۔ جب وہ صحابی گھر سے نکلتے اور مجھے اس حال میں دیکھتے تو کہتے۔
" ابنِ عم رسولؐ! آپ نے کیوں یہ زحمت گوارا کی۔ آپ نے میرے یہاں اطلاع بھجوادی ہوتی۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔"
لیکن میں ان کو جواب دیتا۔
" میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا زیادہ حقدار ہوں ۔ کیونکہ حصولِ علم کے لیے صاحبِ علم کے پاس جایا جاتا ہے۔ صاحبِ علم خود طالبِ علم کے پاس نہیں جایا کرتے۔"
پھر میں اُن سے حدیث پوچھتا۔"
وہ طلبِ علم میں جس طرح خاکساری و تواضع سے پیش آتے اسی طرح اہل علم وفضل کی قدر و عزت بھی کرتے تھے۔
یہ ہیں کاتبِ وحی اور قضاء، فقہ، قرأت اور فرائض میں اہل مدینہ کے سب سے بڑے عالم حضرتِ زید بن ثابت رضی اللہ عنہٗ۔ وہ اپنے گھوڑے پر

سوار ہونے کا ارادہ کرتے ہیں تو وہی ہاشمی نوجوان عبداللہ بن عباسؓ ان کے سامنے ان کی رکاب تھام کر اور ان کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر یوں کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ ان سے کہتے ہیں۔

"اے رسول اللہؐ کے ابن عم! رکاب اور لگام چھوڑ دیجیے۔"

مگر وہ جواب دیتے ہیں کہ "اسی طرح ہم کو اپنے علماء کا ادب و احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

حضرت زیدؓ ان سے کہتے ہیں کہ ذرا آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھائیے۔ اور جب حضرت ابن عباس اپنا ہاتھ ان کے سامنے کرتے ہیں تو وہ جھک کر اسے چومتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اور ہمیں اپنے نبیؐ کے اہل بیت کے ساتھ اسی طرح تکریم و تعظیم کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

وہ طلب علم کی راہ میں اپنی سعی پیہم کے نتیجے میں مسلسل آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ وہ علم کے بہت اونچے مقام پر پہنچ گئے جس نے بڑے بڑے اہل علم کو حیرت زدہ کر دیا۔ حضرت مسروق بن اجدع جن کا شمار کبار تابعین میں ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جب میں ابن عباسؓ کو دیکھتا تو کہتا یہ سب سے خوبصورت شخص ہیں۔ جب وہ بولتے تو کہتا یہ سب سے فصیح ہیں اور جب حدیث بیان کرتے تو کہتا یہ سب سے زبردست عالم ہیں۔"

حضرت ابن عباسؓ جب ان تمام مطلوبہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ ایک معلم بن گئے اور ان کا مکان مسلمانو

کے لیے ایک یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کرگیا۔ جی ہاں! ان کا مکان ہر اس معنی میں یونیورسٹی بن گیا جس معنی میں آج یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ البتہ جامعۂ ابن عباس اور ہماری ان جامعات میں یہ فرق ہے کہ آج کی یونیورسٹیوں میں دسیوں نہیں سیکڑوں اساتذہ ہوتے ہیں، جبکہ جامعۂ ابن عباس کی ساری ذمہ داریاں تنہا ایک استاد کے کندھوں پر تھیں اور وہ خود ابن عباس رض تھے۔

اُن کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباس رض کی ایک ایسی علمی مجلس دیکھی ہے کہ اگر اس پر قریش کے تمام لوگ فخر کریں تو ان کا فخر کرنا بجا ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ ابن عباس رض کے گھر کی طرف جانے والے سارے راستوں میں لوگوں کا اس قدر ازدحام ہے کہ وہ راستے دوسرے آنے جانے والوں کے لیے مسدود ہوگئے ہیں۔ میں نے اندر جاکر ان سے لوگوں کے ان کے دروازے پر جمع ہونے کا حال بتایا تو انھوں نے فرمایا کہ وضو کے لیے پانی رکھو۔ میں نے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ انھوں نے وضو کیا اور اپنی نشست گاہ پہ بیٹھتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ اور جاکر لوگوں سے کہو کہ جو شخص قرآن اور اس کے الفاظ کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہے وہ اندر آجائے۔ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کردیا۔ اور لوگ بڑی تعداد میں اندر آگئے یہاں تک کہ پورا مکان اور کمرہ اُن سے بھر گیا۔ اُن میں سے جس نے جو بھی سوال کیا، انھوں نے اس کے سوال کا اطمینان بخش جواب دیا۔ بلکہ اس کے سوال کے علاوہ انھوں نے مزید بہت سی باتیں بھی بتائیں۔ پھر ان سے کہا کہ اب اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے راستہ صاف کردو۔ یہ سن کر وہ لوگ باہر نکل گئے۔

پھر انھوں نے مجھے حکم دیا کہ باہر جاکر لوگوں سے کہو کہ جو شخص قرآن کی تفسیر اور اس کی تاویل سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہتا ہے، وہ اندر

آجائے۔ میں نے باہر نکل کر یہ اعلان کیا اور لوگ بڑی تعداد میں اندر آگئے اور پورا مکان اور کمرہ بھر گیا۔ پھر ان میں سے جس نے جو بھی سوال کیا انھوں نے اس کا تسلی بخش جواب عنایت فرمایا بلکہ ان کے سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں اپنی طرف سے بھی بتائیں اور پھر فرمایا کہ اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے جگہ خالی کردو۔ چنانچہ وہ لوگ باہر چلے گئے۔

انھوں نے پھر مجھ سے کہا کہ باہر جاکر لوگوں سے کہہ دو کہ جو شخص فرائض وغیرہ کے متعلق کچھ استفسار کرنا چاہے، وہ اندر آجائے۔ اعلان سن کر پھر لوگ بڑی تعداد میں اندر آگئے۔ اور انھوں نے جو سوالات کیے، ابن عباسؓ نے ان کے تشفی بخش جوابات دیے بلکہ ان کے سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں بھی بتائیں۔ پھر انھیں باہر جانے کا اشارہ کیا اور وہ سب چلے گئے۔

پھر انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ جاکر اعلان کردو کہ جسے عربی زبان، شعر و ادب اور کلام عرب کے غریب اور نامانوس حصّوں کے متعلق کچھ دریافت کرنا ہو، وہ اندر آجائے، چنانچہ بہت سے لوگ اندر داخل ہوتے اور اندر مزید گنجائش نہ رہی۔ ان لوگوں نے جو کچھ بھی پوچھا، ابن عباسؓ نے اس کا اطمینان بخش جواب دیا۔ اوران سوالات کے علاوہ مزید بہت سی باتیں اپنی طرف سے بھی بتائیں۔

راوی کہتا ہے کہ اگر اس پر تمام اہل قریش فخر کریں تو ان کا فخر کرنا برحق ہوگا۔

بعد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے مختلف علوم کے لیے الگ الگ دن مقرر کردیے تاکہ ان کے دروازے پر اتنا ہجوم نہ ہو۔ چنانچہ انھوں نے

ہفتے میں ایک دن تفسیر، ایک دن فقہ، ایک دن مغازی و سیرَ، ایک دن شعر و ادب اور ایک دن عرب کے گذشتہ حالات اور اس کی پچھلی جنگوں کے متعلق گفتگو اور سوال و جواب کے لیے مخصوص کر دیا۔ جو بھی اہل علم ان کی مجلس میں شریک ہوتا، ان کے علم کا معترف ہوتا اور ہر سوال کرنے والا اپنے سوال کا جواب ان کے پاس موجود پاتا تھا۔

علم و فقہ میں کامل ہونے کی وجہ سے خلفاء راشدین رضؓ کم عمری کے باوجود ابن عباس رضؓ سے مشکل معاملات اور پیچیدہ مسائل میں مشورہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ جب بھی ان کے سامنے کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا یا کوئی پیچیدہ معاملہ سر اٹھاتا تو وہ مشورہ کے لیے اکابر صحابہ رضؓ کو بلاتے اور ان کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کو بھی طلب فرماتے۔ جب وہ دربار خلافت میں حاضر ہوتے تو انھیں اونچی جگہ پر اپنے قریب بٹھاتے اور ان سے کہتے۔ میں اس وقت ایک پیچیدہ مسئلہ سے دوچار ہوں۔ اس کو اور اس جیسے دوسرے مسائل کو تم ہی حل کر سکتے ہو۔ ایک بار تو نوعمری کے باوجود ابن عباس رضؓ کو آگے بڑھانے اور ان کو اکابر صحابہ کے برابر کرنے کے معاملے میں اُن کے اوپر اعتراض بھی کیا گیا۔ مگر انھوں نے یہ جواب دے کر معترض کا منہ بند کر دیا۔

"اِنَّہٗ فَتَی الْکُھُوْلِ، لَہٗ لِسَانٌ سَئُوْلٌ وَّ قَلْبٌ عَقُوْلٌ۔" "اس نوجوان کے پاس بوڑھوں جیسا تجربہ ہے، اس کے پاس سوال کرنے والی زبان اور سمجھ دار دل ہے۔"

حضرت ابن عباس رضؓ خواص کی تعلیم میں مصروف ہونے کے باوجود عام مسلمانوں کے حق سے غافل نہیں تھے۔ وہ عوام الناس کے لیے وعظ و تذکیر

کی مجلسیں برابر منعقد کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنی ایک مجلسِ وعظ میں گناہ کا ارتکاب کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے! اپنے گناہوں کے انجام سے غافل نہ رہ۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ گناہ کا نتیجہ خود گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ارتکابِ گناہ کے وقت اپنے دائیں بائیں موجود فرشتوں سے تیرا حیا نہ کرنا گناہ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور گناہ کرتے وقت تیرا ہنسنا، گناہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ حالانکہ تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہے۔ بے شک ارتکابِ گناہ میں کامیابی پر تیرا خوش ہونا، گناہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اور ارتکابِ گناہ میں ناکام ہوجانے پر تیرا افسوس کرنا، گناہ سے زیادہ مہلک ہے۔ اور ارتکابِ گناہ کے وقت تیرا ہوا سے ڈر جانا، جب وہ تیرے پردے کو ہلادیتی ہے۔ اور اس تصور سے کہ خدائے تعالیٰ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ تیرے دل میں خوف و اضطراب کی ہلکی سی لہر کا پیدا نہ ہونا۔ گناہ سے بڑھ کر ہے۔

اے گناہ گار! کیا تجھے معلوم ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی کون سی لغزش تھی جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جسم اور مال کے سخت ترین امتحان میں مبتلا کردیا تھا۔ ان سے صرف اتنی سی کوتاہی ہوئی تھی ایک مسکین و مظلوم شخص نے دفعِ ظلم کے لیے ان سے مدد کی درخواست کی تھی اور انھوں نے اس کی مدد نہیں کی۔"

حضرت ابن عباسؓ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جن کے یہاں قول و عمل میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ان کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو معروف کا حکم دیں اور خود اس پر عمل نہ کریں۔ دوسروں کو منکرات سے باز رہنے کی

تلقین کریں اور خود ان کا ارتکاب کریں۔ وہ دن کو بکثرت روزے رکھتے اور راتوں کو قیام کرتے تھے۔

مشہور تابعی عبداللہ بن ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ

"ایک دفعہ میں نے ابن عباس کے ساتھ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔ دوران سفر جب ہم کسی منزل پر قیام کرتے تو اور لوگ تو تکان کی وجہ سے سو جاتے مگر ابن عباسؓ رات کا بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک رات کو وہ آیہ کریمہ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَالِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔ کی تلاوت کر رہے ہیں۔ وہ مسلسل اسی آیت کو پڑھتے اور روتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں صبح ہو گئی۔"

اس سب کے بعد ہمارے لیے اتنا جان لینا کافی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نہایت خوب صورت اور خوش رو شخص تھے۔ وہ راتوں کو ہمیشہ خدا کے خوف سے روتے رہتے تھے، یہاں تک کہ اشکوں کی مسلسل روانی سے ان کے نرم و نازک رخساروں پر دو پتلی پتلی نالیاں سی بن گئی تھیں جن کو بعض لوگ جوتے کے تسموں سے تشبیہ دیتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ علم و فضل کے انتہائی بلند مقام پر فائز تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال خلیفۃ المسلمین حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما حج کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ اسی سال حضرت ابن عباسؓ بھی حج کے لیے عازم سفر تھے۔ اس زمانے میں ان کے پاس کوئی حکومتی عہدہ نہیں تھا۔ اس وقت حضرت معاویہؓ کے

ل موت کی جان کنی حق لے کر آپہنچی، یہ وہی چیز ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔ (ق - ۱۹)

جلو میں اربابِ حکومت پر مشتمل ایک ہجوم چل رہا تھا اور ایک مجمع حضرت ابن عباسؓ کے ساتھ چل رہا تھا جو طالبانِ علم پر مشتمل تھا اور حضرت ابن عباسؓ کا جلوس حضرت معاویہؓ کے جلوس سے بڑا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو اکہتر سال کی عمر عطا فرمائی۔ اس مدت میں انھوں نے دنیا کو علم وفہم اور حکمت وتقویٰ سے بھر دیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی نمازِ جنازہ حضرت محمد بن حنفیہ نے پڑھائی اور اس میں اس وقت موجود صحابۂ کرام اور اکابر تابعین نے شرکت کی۔ جس وقت لوگ ان کی قبر پر مٹی ڈال رہے تھے، انھوں نے کسی پڑھنے والے کو یہ آیت پڑھتے سُنا۔

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔

(الفجر ۲۷-۳۰)

اے نفسِ مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے خوش) اور اپنے رب کے نزدیک، پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

حضرت نُعمان بن مُقرّن رضی اللہ عنہٗ

قبیلہ بنو مُزینہ کی بستیاں یثرب کے قریب اس راستے پر واقع تھیں جو مدینہ اور مکہ کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لا چکے تھے۔ اور آنے جانے والوں کے ذریعے آپؐ کے حالات برابر مزینہ والوں تک پہنچتے رہتے تھے۔

ایک دفعہ رات کے وقت رئیسِ مزینہ نعمانؓ بن مقرن اپنی مجلس میں اپنے بھائیوں اور قبیلہ کے دوسرے سربرآوردہ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم اب تک محمدؐ کی شخصیت کے بارے میں صرف خیر اور بھلائی کی باتیں ہی ہمارے علم میں آئی ہیں اور ان کی دعوت کے متعلق ہم نے اب تک صرف رحمت و مرحمت اور احسان و عدل کی باتیں ہی سُنی ہیں۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم لوگ ان کی دعوت کو قبول کرنے میں دیر کر رہے ہیں جب کہ دوسرے لوگ تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپک رہے ہیں۔" انہوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں خود صبح تڑکے ان کے پاس جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم میں سے جو لوگ میرے ساتھ چلنا چاہیں وہ تیار ہو جائیں۔"

نعمان کی یہ باتیں حاضرین مجلس کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ انہوں نے صبح

کو دیکھا کہ ان کے دسوں بھائی اور بنو مزینہ کے چار سَو سوار ان کے ساتھ مدینہ جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے اور اللہ کے دین میں داخل ہونے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ مگر نعمان کو اتنے بڑے وفد کے ساتھ نبی کریمؐ اور مسلمانوں کے لیے کوئی ہدیہ ساتھ لیے بغیر خالی ہاتھ جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے میں شرم محسوس ہو رہی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ حالیہ خشک سالی نے جو ابھی جلد ہی بنو مزینہ پر گزری تھی ان کی تمام فصلوں اور مویشیوں کو تباہ کر ڈالا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اپنے اور اپنے بھائیوں کے گھروں کے چکر لگائے اور ان تمام بکریوں کو اکٹھا کیا جو قحط سے بچ گئی تھیں۔

وہ انہیں اپنے آگے ہانکتے ہوئے نبی کریمؐ کی خدمت میں لائے اور انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے رسول اللہ کے سامنے اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ نعمان بن مقرن اور ان کے ساتھ والوں کے مسلمان ہونے کی خبر سُن کر مدینے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس لیے کہ اب تک عرب کے کسی ایک گھر کے گیارہ سگے بھائی اور ان کے ساتھ چار سَو سوار بیک وقت دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت نعمان بن مقرن کے مسلمان ہونے کی وجہ سے بے حد خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی بکریوں کو قبول فرما لیا اور ان کے متعلق قرآن کی یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ

اور انہی بدویوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور

قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰہِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرْبَۃٌ لَّہُمْ ؕ سَیُدْخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیْ رَحْمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ؕ (توبہ - ۹۹)

جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے ہاں تقرب کا اور رسولؐ کی طرف سے رحمت کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ہاں! وہ ضرور ان کے لیے تقرب کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت نعمان ابن مقرنؓ پرچم رسول کے زیر سایہ آگئے اور وہ کسی تاخیر اور کوتاہی کے بغیر رسول اللہؐ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ اور جب خلافت کی ذمہ داریاں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اوپر آن پڑیں تو انہوں نے اور ان کے قبیلہ مزینہ نے خلوص و ایمان کے ساتھ ان کا ساتھ دیا اور فتنۂ ارتداد کے استیصال میں اہم اور مؤثر رول ادا کیا اور پھر جب حضرت عمر ابن خطابؓ نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو ان کے دور میں بھی انہوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جن کے ذکر میں تاریخ ہمیشہ رطب اللسان رہے گی۔

قادسیہ میں ایرانیوں کے ساتھ معرکہ آرائی سے چند روز قبل لشکر مجاہدین کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے حضرت نعمان ابن مقرنؓ کی قیادت میں ایک وفد کسریٰ یزدگرد کے پاس بھیجا جب یہ وفد ایران کے دارالسلطنت مدائن پہنچا تو اس نے دربار شاہی میں داخلے کی اجازت چاہی۔ کسریٰ نے انہیں اجازت دی پھر اپنے ترجمان کو بلا کر اس سے کہا۔

"ان سے دریافت کرو کہ تم ہمارے ملک میں کس غرض سے آئے ہو

اور کس چیز نے تمہیں ہمارے ساتھ جنگ کرنے پر اکسایا ہے۔ شاید تم لوگوں کے اندر ہمارے ملک پر حملہ کرنے کی جرأت اور اس پر قبضہ کرنے کی خواہش اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہم اپنی مصروفیات کے باعث تمہاری طرف سے غافل ہو گئے۔"

حضرت نعمان ابن مقرنؓ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہاری طرف سے جواب دوں، اور اگر تم میں سے کوئی بولنا چاہتا ہو تو میں اسے اپنے آپ پر ترجیح دوں گا۔"

"نہیں آپ ہی جواب دیں۔" سب نے ایک زبان ہو کر کہا اور پھر ان لوگوں نے کسریٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ ہم سب لوگوں کی طرف سے جواب دیں گے۔ تم ان کی باتیں بغور سنو۔"

حضرت نعمانؓ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور اس کے رسولؐ پر درود و سلام بھیجا پھر کہا۔

"اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر رحم فرمایا۔ ہمارے پاس ایک رسول بھیجا جس نے خیر کی طرف ہماری رہنمائی کی اور اس پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ ہمیں شر سے آگاہ کیا اور اس کے ارتکاب سے روکا۔ اور ہم سے اس بات کا وعدہ فرمایا کہ اگر ہم اس کی دعوت کو قبول کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ہم کو دنیا اور آخرت کی بھلائی عطا فرمائے گا۔ ہم نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور زیادہ مدت نہیں گزری کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری تنگی کو کشادگی سے، ہماری ذلت کو عزت سے اور ہماری باہمی دشمنی کو بھائی چارگی اور مرحمت میں تبدیل کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اس بات کا بھی حکم دیا کہ ہم دوسرے لوگوں کو بھی اس دین کی دعوت دیں جس میں ان کی بھلائی کا راز پوشیدہ ہے

انہوں نے ہم کو اس بات کا بھی حکم دیا کہ ہم اس کام کا آغاز اپنے پڑوس کے لوگوں سے کریں۔ اس لیے ہم تم لوگوں کو اس دین میں داخل ہونے کی دعوت دے رہے ہیں۔ یہ ایسا دین ہے جس نے ساری بھلائی کی باتوں کی تحسین کی ہے اور ان کی قبولیت پر اُبھارا ہے اور تمام برائیوں کو برائی قرار دیا ہے اور ان سے اجتناب کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہ اپنے قبول کرنے والوں کو کفر اور ظلم وجور کی تاریکی سے نکال کر نورِ ایمان اور عدل و انصاف کی روشنی میں داخل کرتا ہے۔ اگر تم ہماری دعوت کو قبول کر لوگے تو ہم تمہارے سامنے اللہ کی کتاب کو پیش کریں گے اور تم کو اس پر قائم کریں گے تاکہ تم اس کے مطابق حکومت کرو اور پھر ہم تم کو تمہارے حال پر چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ لیکن اگر تم نے خدا کے دین میں داخل ہونے سے انکار کیا تو ہم تم سے جزیہ وصول کریں گے اور اس کے بدلے میں تمہاری حفاظت اور حمایت کریں گے اور اگر تم نے جزیہ دینے سے انکار کیا تو پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔"

یزدگرد حضرت نعمان ابن مقرنؓ کی یہ تقریر سُن کر غیظ و غضب سے مشتعل ہوگیا اور بولا۔

"میں رُوئے زمین پر کسی ایسی قوم کو نہیں جانتا جو تم سے زیادہ بدبخت، تم سے زیادہ قلیل التعداد اور تم سے زیادہ غیر منظم و بدحال ہو۔ ہم تمہارے معاملے کو اپنے سرحدی حاکموں کے حوالے کر دیتے تھے جو ہمارے لیے تم سے طاعت کا عہد لیتے تھے۔" پھر اس نے اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اپنی تنگدستی اور مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر آئے ہو تو ہم تمہارے علاقے میں خوشحالی کے واپس آنے تک تمہاری ضروریات کا

بندوبست کردیں گے، تمہاری قوم کے سرداروں کو خلعت سے نوازیں گے اور تمہارے اُوپر اپنی طرف سے کسی ایسے شخص کو حاکم مقرر کردیں گے جو تمہارے ساتھ نرمی کرے گا۔"

ارکان وفد میں سے ایک شخص نے اس کی اس بات کا ایسا سخت اور دنداں شکن جواب دیا کہ جس کو سُن کر اس کے غیظ و غضب کی آگ از سر نو بھڑک اٹھی اس نے غصہ سے کانپتے ہوئے کہا۔

"اگر قاصدوں کا قتل غلط نہ ہوتا تو میں تم لوگوں کو قتل کرا دیتا۔ اٹھو اور چلے جاؤ یہاں سے۔ اب میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جاکر اپنے قائد سے بتا دینا کہ میں اس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے رستم کو بھیج رہا ہوں جو اسے اور تم سب کو ایک ساتھ قادسیہ کے خندق میں دفن کردے گا۔

پھر اس نے مٹی سے بھری ہوئی ایک ٹوکری لانے کا حکم دیا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ "یہ ٹوکری اس شخص کے سر پر رکھ دی جائے جو ان میں سب سے زیادہ معزز ہے۔ اور انھیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے شہر کے دروازوں کے باہر نکال دیا جائے۔"

انھوں نے وفد سے پوچھا کہ "تم میں سب سے زیادہ معزز کون شخص ہے؟"

حضرت عاصم ابن عمرؓ نے جلدی سے کہا۔ "میں!"

یزدگرد کے آدمیوں نے مٹی سے بھری ہوئی وہ ٹوکری ان کے سر پر رکھ دی اور وہ اسے لے کر مدائن سے نکل گئے۔ پھر اسے اپنی اونٹنی پر رکھ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی خدمت میں لائے اور ان کو اس بات کی خوشخبری دی کہ اللہ تعالیٰ عنقریب مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا اور ایران کی

زمین پر ان کو قبضہ دے گا۔

اس کے بعد قادسیہ کا وہ زبردست معرکہ پیش آیا جس نے اس کی خندق کو مقتولین کی لاشوں سے پاٹ دیا۔ لیکن وہ لاشیں مسلمان فوجیوں کی نہیں، کسریٰ کے لشکریوں کی تھیں۔

قادسیہ کی اس شرمناک ہزیمت اور عبرتناک شکست کے بعد بھی ایرانیوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ انھوں نے از سر نو اپنی منتشر جمعیت کو یکجا کیا اور نئے سرے سے ان کو ترتیب دیا یہاں تک کہ منتخب اور آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل ایک بہترین فوج تیار ہو گئی جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ جب حضرت عمر فاروق رضؓ کو ایرانیوں کی ان فوجی تیاریوں کا علم ہوا تو انھوں نے بہ نفسِ نفیس اس عظیم خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے محاذِ جنگ پر جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن ذی رائے اور سر برآوردہ صحابہ نے انھیں اس ارادے سے باز رکھا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ اس زبردست مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری کسی قابلِ اعتماد شخص کے سپرد کر دیں۔

"تو پھر مجھے کسی ایسے آدمی کے متعلق مشورہ دو جس کو پورے اعتماد کے ساتھ یہ زبردست ذمہ داری سونپی جا سکے۔" خلیفہ نے فرمایا۔

"امیر المومنین! آپ اپنی سپاہ کو ہم سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔" صحابہؓ نے جواب دیا۔

"خدا کی قسم میں لشکرِ مجاہدین کی قیادت ایک ایسے شخص کے سپرد کروں گا جو دو فوجوں میں مڈبھیڑ کے وقت — نیزے کی انی سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ لپکنے والا ہے۔ وہ نعمان ابن مقرن مزنی ہیں۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"یقیناً وہ اس مہم کے لیے آپ کا مناسب ترین انتخاب ہیں"! صحابہؓ نے جواب دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت نعمان بن مقرنؓ کو لکھا۔

"اللہ کے بندے عمر بن خطابؓ کی طرف سے نعمان بن مقرنؓ کے نام۔

امابعد! مجھے معلوم ہوا ہے کہ ایرانیوں کی ایک زبردست جمعیت تمہارے مقابلے کے لیے نہاوند میں مجتمع ہوئی ہے۔ جب میرا یہ خط تم کو ملے تو لشکر مجاہدین کو اپنے ساتھ لے کر اللہ کے حکم سے، اس کی نصرت و تائید پر اعتماد کرتے ہوئے ان کے مقابلے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ اور دیکھو! مسلمانوں کو لے کر کسی دشوار گزار اور تکلیف دہ راستے سے ہرگز سفر نہ کرنا جس سے وہ تکلیف و اذیت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کا ایک ایک فرد میرے نزدیک ہزاروں دینار سے بہتر ہے۔ والسلام علیک"۔

حضرت نعمان بن مقرنؓ کو امیر المومنینؓ کا یہ خط ملا تو وہ اپنے لشکر کو لے کر دشمن کے مقابلے کے لیے نکل پڑے۔ انھوں نے سواروں کا ایک دستہ ہراول کے طور پر آگے روانہ کر دیا تاکہ وہ راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرتا جائے۔ جب سواروں کا یہ دستہ نہاوند کے قریب پہنچا تو ایک جگہ پہنچ کر ان کے گھوڑے رک گئے۔ سواروں نے انھیں آگے بڑھانے کی بہتری کوشش کی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ معاملے کی تحقیق کے لیے نیچے اترے۔ دیکھا تو گھوڑوں کے سُموں میں لوہے کے گوکھرو چبھے ہوئے ہیں۔ جو کیلوں کے سروں سے مشابہ ہیں۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایرانیوں نے زمین پر نہاوند کی طرف جانے والے تمام راستوں میں لوہے کے یہ گوکھرو بکھیر رکھے ہیں۔ تاکہ سواروں اور پیدل چلنے والوں کو نہاوند تک پہنچنے سے باز رکھیں۔

سواروں نے اس صورت حال سے حضرت نعمان بن مقرنؓ کو آگاہ کیا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں انھیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔ حضرت نعمانؓ نے انھیں حکم بھیجا کہ وہ اپنی جگہ ٹھہرے رہیں۔ اور رات کے وقت آگ روشن کریں تاکہ دشمن انھیں دیکھ لیں اس کے بعد بظاہر دشمن سے خوف زدگی کا اظہار کرتے ہوئے پسپائی اختیار کریں تاکہ دشمن اُن پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھیں اور لوہے کے جو گوکھرو انھوں نے بکھیر رکھے ہیں ان سے راستوں کو صاف کرادیں۔

حضرت نعمانؓ کی یہ تدبیر کامیاب ثابت ہوئی۔ ایرانیوں نے جیسے ہی یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا یہ ہراول دستہ ان کے سامنے سے شکست کھا کر پسپا ہو رہا ہے تو انھوں نے اپنے آدمیوں کو ان راستوں کی صفائی کرنے کے لیے بھیج دیا۔ اور انھوں نے جھاڑو دے کر تمام راستوں کو ان گوکھرؤں سے صاف کر دیا۔ اس کے بعد مسلمان سوار تیزی سے مڑے اور تمام راستوں پر قابض ہو گئے۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن اپنی فوج کے ساتھ نہاوند کے بالائی حصّے کی طرف خیمہ زن ہو گئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ دشمن پر اس کی بے خبری کے عالم میں اچانک حملہ کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اپنے فوجیوں سے فرمایا کہ "میں تین تکبیریں کہوں گا۔ جب میں پہلی تکبیر کہوں تو جو شخص تیار نہ ہو وہ تیار ہو جائے۔ جب دوسری تکبیر کہوں تو تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی تلوار بے نیام کرلے۔ اور تیسری تکبیر کہتے ہی میں ان دشمنانِ خدا پر حملہ کر دوں گا۔ اسی وقت تم لوگ بھی میرے ساتھ حملہ کر دینا۔"

حضرت نعمان بن مقرنؓ نے پے در پے تین تکبیریں کہیں۔ اور

آخری تکبیر کے ساتھ ہی وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر جھپٹ پڑے۔ ان کے پیچھے ہی مسلمانوں کا لشکر بھی سیلاب کی سی تیزی کے ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ اور پھر دونوں فوجیں باہم ٹکرائیں، ان کے درمیان جنگ کی چکی تیزی کے ساتھ چلنے لگی اور فریقین کے مابین ایسا خون ریز اور ہلاکت آفریں معرکہ چھڑ گیا جس کی مثال جنگوں کی تاریخ میں بہت کم گزری ہوگی۔ آخر کار ایرانیوں کا لشکر بُری طرح سے منتشر اور پراگندہ ہوگیا۔ میدان نہاوند کے تمام نشیب و فراز اُن کے مقتولین کی لاشوں سے پٹ گئے اور ان کا خون تمام گزرگاہوں اور راستوں میں بہنے لگا۔ حضرت نعمان رض بن مقرن کا گھوڑا اس میں پھسل کر گر پڑا۔ حضرت نعمان رض بھی گھوڑے سے گرنے اور شدید طور پر زخمی ہوگئے۔ اور آخر کار زخموں کی تاب نہ لاکر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے بھائی نے علم اپنے ہاتھ میں سنبھالا اور ان کی لاش کو ایک چادر سے چھپا دیا۔ اور ان کی شہادت کو مسلمانوں سے پوشیدہ رکھا۔ جب یہ فتح عظیم اپنے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی جس کو مسلمانوں نے فتح الفتوح کا نام دیا تھا۔ تو مظفر و منصور سپاہ نے اپنے بہادر سپہ سالار حضرت نعمان بن مقرن رض کے متعلق دریافت کیا۔ تو ان کے بھائی نے ان کی لاش پر سے چادر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں تمہارے امیر۔ اللہ تعالیٰ نے فتح و کامرانی سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی ہے اور آخر کار انھیں دولتِ شہادت سے نوازا ہے۔

❀

حضرت صُہیب رومی رضی اللہ عنہٗ

ہم میں سے ہر مسلمان حضرت صہیب رومیؓ کے نام سے واقف اور ان کی زندگی کے حالات سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ ہے۔ البتہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کو شاید اس بات کا علم نہ ہو کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہٗ رومی نہیں، نسلاً عربی النسل تھے۔ ان کے والد کا تعلق قبیلۂ بنو نُمیر اور ان کی والدہ کا تعلق قبیلۂ بنو تمیم سے تھا۔ حضرت صہیبؓ روم کی طرف کیسے منسوب ہوئے، اس کے پس منظر میں ایک ناقابل فراموش کہانی ہے، جو تاریخ کے حافظے میں ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کے صفحات برابر اس کو بیان کرتے رہیں گے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے تقریباً دو دہائی پہلے کی بات ہے، کسریٰ شاہ ایران کی طرف سے سنان بن مالک "اُبلّہ" کا گورنر تھا۔ وہ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت اپنے بچے صہیب سے کرتا تھا جس کی عمر اس وقت پانچ سال سے متجاوز نہ تھی۔

صہیب کا چہرہ روشن و تابناک اور اس کے بالوں کا رنگ سُرخی مائل تھا۔ چہرے بشرے سے تازگی و شادمانی ٹپکتی تھی اور اس کی روشن آنکھیں ذہانت و نجابت کی آئینہ دار تھیں۔ اس کے علاوہ وہ نہایت چُست و چالاک اور پاک نفس و نیک سرشت بچہ تھا۔ اس کو دیکھتے ہی باپ کا دل باغ

باغ ہوجاتا اور دل سے حکمرانی کی ساری پریشانیاں دور ہوجاتی تھیں۔

ایک دفعہ صہیب کی ماں اپنے خوردسال بچے اور خُدام وملازمین کی ایک جماعت کے ساتھ آرام اور سیر وتفریح کے ارادے سے عراق کی ایک بستی "ثَنِیْنیٰ" کے لیے روانہ ہوئی۔ اس بستی پر رومی فوج کے ایک دستے نے اچانک حملہ کردیا۔ اس کے محافظوں کو قتل کرکے مال واسباب لوٹ لیا اور بال بچوں کو گرفتار کرلے گئے۔ ان گرفتارشدگان میں صہیب بھی تھا۔

صہیب کو بلادِ روم میں غلاموں کی ایک منڈی میں لے جاکر فروخت کردیا گیا۔ وہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک آقا کی خدمت سے دُوسرے آقا کی خدمت میں منتقل ہوتا رہا۔ اس معاملہ میں اس کی حالت اُن ہزاروں لونڈی غلاموں سے مختلف نہ تھی جن سے سرزمینِ روم کے حکمرانوں اور اس کے رئیسوں کے محلات بھرے ہوئے تھے۔ اس سے صہیب کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ رومی معاشرہ کے اندر گھس کر اور اس کی تہ میں اُتر کر اس کے اندرونی حالات سے واقف ہوسکے اور اس کے اندر پائے جانے والے گھناؤنے عیوب سے براہ راست آگاہی حاصل کرسکے۔ چنانچہ اس نے ان تمام فواحش ومنکرات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا جنھوں نے ان محلات میں آشیانے بنا رکھے تھے۔ اور اس نے اپنے کانوں سے ظلم وستم کی وہ ساری داستانیں سنیں جو وہاں دہرائی جاتی تھیں۔ چنانچہ یہ سب کچھ دیکھنے اور سُننے کے بعد صہیب کو اس معاشرہ سے سخت نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا کہ اس قسم کا گندہ معاشرہ کسی زبردست طوفان کے بغیر پاک نہیں ہوسکتا۔

اس کے باوجود کہ صہیب نے روم کے علاقے میں نشوونما پائی

اور اس کے باشندوں کے درمیان پل بڑھ کر جوان ہوا۔ اور اس کے باوجود کہ وہ عربی زبان کو بھول گیا تھا یا تقریباً بھول چکا تھا، یہ بات اس کے دل سے ایک لمحہ کے لیے فراموش نہیں ہوئی تھی کہ وہ عربی النسل اور ابناء صحرا میں سے ہے۔ وہ ہر آن اس مبارک دن کے شوق و انتظار میں رہتا تھا جس روز وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دے گا اور اپنے قبیلے سے جا ملے گا۔ اس نے ایک نصرانی کاہن کو اپنے ایک آقا سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ "وہ وقت اب قریب آگیا ہے جب جزیرۂ عرب کے شہر مکہ سے" وہ نبی" ظاہر ہو گا جو عیسیٰ ابن مریمؑ کی رسالت کی تصدیق کرے گا اور لوگوں کو گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت کے اجالوں سے روشناس کرائے گا"۔ اس بات نے اس کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا اور اس کے آتشِ انتظار کو مزید تیز کر دیا۔

پھر خوش قسمتی سے صہیب کو ایک سنہری موقع ہاتھ آگیا۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اپنے آقاؤں کی غلامی کے بندھن توڑ کر بھاگ نکلا اور اس نے سیدھے نبیٔ منتظر کی جائے بعثت، مرکزِ عرب، ام القریٰ مکۂ مکرمہ کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا۔ اس کی زبان میں پائی جانے والی لکنت اور اس کے سرخ بالوں کی وجہ سے لوگ اسے صہیب رومی کہنے لگے۔ اس نے مکے کے ایک رئیس عبداللہ بن جدعان کے ساتھ حلیفانہ روابط قائم کر لیے اور تجارت و کاروبار میں مصروف ہو گیا۔ اور اس میں اس نے کافی دولت کمائی ـــــ صہیب اپنی کاروباری مصروفیات اور تجارتی سرگرمیوں کے باوجود اس نصرانی کاہن کی بات بھولا نہیں تھا۔ جب بھی اسے اس کی بات کا خیال

آتا، وہ بڑی حسرت کے ساتھ اپنے دل سے یہ سوال کرتا۔
"وہ واقعہ کب پیش آئے گا؟"
اور پھر تھوڑی ہی مدّت کے بعد اس سوال کا مجسّم جواب اُس کے سامنے تھا۔

ایک روز صہیب اپنے ایک تجارتی سفر سے واپس مکّہ پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا ہے اور وہ لوگوں کو خدائے واحد پر ایمان لانے کی دعوت اور عدل واحسان کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اور فواحش ومنکرات سے منع کر رہے ہیں۔

"یہ وہی تو نہیں ہیں جنھیں لوگ "امین" کے لقب سے پکارتے ہیں؟" صہیب نے دریافت کیا۔

"ہاں، وہی ہیں" جواب دینے والے نے کہا۔

"اس وقت وہ کہاں ملیں گے؟" صہیب نے پُرشوق لہجے میں سوال کیا۔

ان کو بتایا گیا کہ "وہ اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے مکان میں ہوں گے جو کوہِ صفا کے قریب ہے ...... لیکن اگر تم کو ان سے ملنا ہے تو ذرا احتیاط سے کام لینا، کہیں قریش کے کسی آدمی کی نظر تمہارے اوپر نہ پڑ جائے۔ اگر انھوں نے تم کو ان سے ملتے ہوئے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے اور تم کو سخت اذیت پہنچائیں گے۔ یہاں مکّے میں تم ایک غریب الوطن ہو۔ یہاں نہ تو تمہارا کوئی حامی و ناصر ہے جو تمہاری حمایت کرے گا، نہ تمہارا قبیلہ وخاندان ہے جو تمہاری نصرت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوگا۔"

صہیب اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے احتیاط کے ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے دارارقم کی سمت چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو دروازے پر عمار بن یاسر کو پایا۔ وہ اُنھیں پہلے سے جانتے تھے۔ پہلے تو تھوڑی دیر تک تردد و تذبذب میں مبتلا رہے لیکن پھر ان کے قریب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"عمار! آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

"اور آپ کس مقصد سے آئے ہیں؟" عمار نے کوئی جواب دینے کے بجائے اُلٹا ان سے سوال کر دیا۔

"میں اس شخص (نبیؐ) کے پاس جانا چاہتا ہوں تاکہ اُس کی باتیں سُنوں،" صہیب نے جواب دیا۔

"میں بھی تو اسی خیال سے آیا ہوں،" عمار نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے،" صہیب نے کہا۔ "آؤ اللہ کا نام لے کر ایک ساتھ چلیں۔"

صہیب بن سنان رومی اور عمار بن یاسر دونوں ایک ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو بڑے غور اور توجہ سے سُنا۔ پیارے رسول کی وہ پیاری باتیں کانوں کے راستے سیدھے ان کے دلوں میں اُتر گئیں اور دونوں کے دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھے۔ انھوں نے فوراً اپنے ہاتھ رسولؐ اللہ کی طرف بڑھا دیئے اور کلمۂ شہادت پڑھ کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئے۔ اور دن بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہ کر آپ کے چشمۂ رحمت سے اچھی طرح سیراب اور آپ کے اخلاق و سیرت سے بھرپور استفادہ کرتے رہے۔ جب رات کی تاریکی ماحول پر مسلط ہوگئی اور زندگی کے ہنگامے

خاموشی میں تبدیل ہوگئے تو دونوں تاریکی کے پردے میں آپؐ کے پاس سے نکلے۔ اوراس وقت وہ دونوں اپنے سینوں میں وہ روشنی لیے ہوئے تھے جو ساری دنیا کو منوّر کرنے کے لیے کافی تھی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت سمیہ اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم وغیرہم دسیوں مسلمانوں کے ساتھ قریش کے ہاتھوں سخت اذیتیں برداشت کیں۔ انھوں نے اہلِ مکہ کی طرف سے ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں کہ اگر وہ پہاڑ پر نازل ہوجاتیں تو اسے بھی پاش پاش کردیتیں۔ لیکن انھوں نے راہِ خدا میں پیش آنے والے ان تمام آلام و مصائب کو نہایت خندہ پیشانی اور صبر و تحمّل کے ساتھ برداشت کیا۔ کیوں کہ انھیں معلوم تھا کہ جنّت کی راہیں مکارہ اور تکلیف دہ باتوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت صہیبؓ نے اسی وقت اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ ہجرت کا یہ سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیّت میں کریں گے۔ لیکن قریش کو کسی طرح ان کے اس ارادے کی بھنک مل گئی اور انھوں نے ان کو اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے زبردستی روک دیا۔ اوران کی نگرانی کا سخت انتظام کردیا تاکہ وہ تجارت میں کمائی ہوئی دولت اپنے ساتھ لے کر ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کی ہجرت کے بعد حضرت صہیبؓ کسی مناسب موقع کی تاک میں تھے جس سے فائدہ اٹھاکر ان لوگوں کا ساتھ پکڑ لیں مگر انھیں

اس میں کامیابی نہیں حاصل ہوسکی۔ کیونکہ ان کی نگرانی کرنے والے ہر وقت ان کی طرف سے ہوشیار اور چوکنّے رہتے تھے۔ اس لیے اب ان کے پاس سوائے اس کے دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اس کے لیے کسی حیلے کا سہارا لیں۔ چنانچہ ایک سرد رات میں انھوں نے پاخانے کے بہانہ بکثرت باہر آنا جانا شروع کردیا۔ وہ پاخانے سے آکر فوراً ہی اس کے لیے واپس لوٹ جاتے تھے۔ وہ نگرانی کرنے والوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ انھیں بار بار رفعِ حاجت کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ یہ حال دیکھ کر ان کی نگرانی کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"خوش ہوجاؤ۔ لات وعزّیٰ نے اس کو دست میں بتلا کردیا ہے۔"

پھر وہ مطمئن ہوکر اپنی خواب گاہوں میں چلے گئے اور اپنے آپ کو میٹھی نیند کی آغوش میں ڈال دیا۔

اس موقع کو غنیمت سمجھ کر حضرت صہیبؓ ان کے درمیان سے دھیرے سے نکلے اور مدینہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن ان کو روانہ ہوتے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ان کی نگرانی کرنے والوں کو ان کے نکل جانے کا پتہ چل گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھے، اچھل کر اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ان کے پیچھے انھیں سرپٹ چھوڑ دیا تاکہ جلد از جلد ان کو پکڑ لیں۔ جب حضرت صہیبؓ کو محسوس ہوا کہ ان کا تعاقب کیا جارہا ہے تو وہ ایک ٹیلے پر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے اپنے ترکش سے تیر نکال کر زمین پر پھیلا دیے اور کمان کی تانت چڑھاتے ہوئے بولے۔

"قریش کے لوگو! خدا کی قسم تم لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ میں ایک بہترین تیرانداز اور بے مثل نشانہ باز ہوں اور میرا نشانہ کبھی

خطا نہیں ہوتا۔ واللہ تم لوگ اس وقت تک میرے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے جب تک میں ہر تیر سے تم میں سے ایک آدمی کو قتل نہ کرلوں۔ پھر میں اُس وقت تک تلوار سے تمہارا مقابلہ کرتا رہوں گا جب تک اس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ہوگا۔"

یہ سُن کر ان میں سے ایک نے کہا۔

"خدا کی قسم ہم تم کو اپنی جان اور مال دونوں چیزیں بچا کر نہیں لے جانے دیں گے۔ تم مکہ میں ایک مفلس کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور یہاں رہ کر تم نے کافی دولت جمع کرلی ہے۔"

"اگر میں اپنا مال تمہارے لیے چھوڑ دوں تو کیا تم میرا راستہ چھوڑ دو گے؟"

حضرت صہیبؓ نے پوچھا۔

"ہاں"، انھوں نے کہا۔

تب حضرت صہیبؓ نے ان کو اپنے گھر میں اس جگہ کی نشان دہی فرمادی جہاں انھوں نے مال رکھا تھا۔ اور انھوں نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور جاکر بتائی ہوئی جگہ سے مال لے لیا۔

اس کے بعد حضرت صہیبؓ تیز رفتاری کے ساتھ مدینہ کی سمت چل پڑے۔ وہ اپنے دین کو کافروں سے بچا کر اللہ کی طرف بھاگے چلے جارہے تھے۔ انھیں اپنے اس مال کے جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا جس کے کمانے میں انھوں نے اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کی تھیں۔ دورانِ سفر جب بھی ان کو تکان محسوس ہوتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا شوق ان کے لیے مہمیز کا کام دیتا اور ان کی چستی و توانائی عود کر آتی اور وہ لگاتار چلتے رہتے۔ چلتے چلتے جب وہ قبا، پہنچے تو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو آتے ہوئے دیکھ لیا۔ آپؐ نے ان کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"رَبِحَ الْبَیْعُ یَا اَبَا یَحْیٰی، رَبِحَ الْبَیْعُ۔	"ابویحییٰ! یہ بیع تمہارے لیے بہت نفع بخش رہی۔"

آپؐ نے اس فقرے کو تین بار دُہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ملنے والی اس خوش خبری کو سن کر ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے جگمگا اُٹھا اور انھوں نے عرض کیا۔

" اللہ کے رسولؐ! مجھ سے پہلے آپ کی خدمت میں کسی کی رسائی نہیں ہوئی ہے جو آپ کو اس بات کی خبر دیتا۔ خدا کی قسم آپ کو یہ بات جبریلؑ کے سوا کسی نے نہیں بتائی ہے۔"

یقیناً حضرت صہیبؓ کی بیع کامیاب رہی اور وحیٔ آسمانی نے اس کی تصدیق کر دی۔ اور حضرت جبریلؑ نے اس کی شہادت دی۔ جیساکہ حضرت صہیبؓ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ (البقرہ ــ ۲۰۷)	انسانوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو رضاءِ الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔ اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔

⁂

حضرت ابو درداء انصاری رضی اللہ عنہٗ

عویمر بن مالک خزرجی جو عموماً اپنی کنیت ابو درداء سے جانے جاتے تھے، صبح بہت تڑکے نیند سے بیدار ہوئے اور اپنے بُت کے پاس پہنچے جس کو انھوں نے اپنے گھر کے اندر سب سے بلند جگہ پر نصب کر رکھا تھا۔ انھوں نے پہلے اس کے سامنے اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اور اسے اپنی دکان میں موجود سب سے اعلیٰ درجے کی خوشبو سے معطر کیا پھر ایک نہایت بیش قیمت اور نئے ریشمی کپڑے سے اس کو آراستہ کیا جو یمن کے ایک تاجر نے اُن کو ہدیۃً دیا تھا۔

سورج آسمان میں بلند ہو گیا اور دن کی گہما گہمی شروع ہو گئی تو ابو درداء گھر سے دکان کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یثرب کی سڑکیں اور گلیاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لیے تنگ ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہ لوگ بدر سے واپس لوٹ رہے تھے اور ان کے آگے آگے قریش کے قیدیوں کی وہ جماعت تھی جو جنگ میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی تھی۔ ابو درداء راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ایک خزرجی نوجوان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے اس سے عبداللہ بن رواحہؓ کی خیریت دریافت کی۔ نوجوان نے جواب دیتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے میدانِ کارزار میں خوب

خوب دادِ شجاعت دی ہے اور جرأت و مردانگی کے جوہر دکھا کر صحیح سالم واپس آگئے ہیں۔

ابو درداء کے عبداللہ بن رواحہؓ کی خیریت دریافت کرنے پر اس نوجوان کو کوئی تعجب نہیں ہوا کیوں کہ اخوت و رفاقت کے جو تعلقات ان دونوں کے درمیان تھے، ان سے سب لوگ اچھی طرح واقف تھے۔ ابو درداء اور عبداللہ بن رواحہؓ کے مابین زمانۂ جاہلیت میں رشتۂ مواخاۃ قائم ہوا تھا۔ اسلام آیا تو ابن رواحہؓ نے بڑھ کر اسے قبول کر لیا جبکہ ابو درداء نے اس سے اعراض کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں کے درمیان پائے جانے والے مضبوط رشتۂ اخوت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں واقع ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ برابر ان سے ربط رکھتے، ان سے ملاقات کرتے، ان کو اسلام کی دعوت دیتے اور برابر انھیں اس کا شوق دلاتے رہتے۔ اور شرک کی حالت میں گزرنے والے ان کی زندگی کے ایک ایک دن پر افسوس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

ابو درداء دکان پر پہنچے اور اپنی اونچی نشست گاہ پر بیٹھ کر خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے۔ وہ ان حالات سے بالکل بے خبر تھے جو اس وقت ان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر میں پیش آرہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اپنے دوست ابو درداء کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ اپنے دل میں ایک بات ٹھانے ہوئے تھے۔ جب ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ انھوں نے ام درداء کو صحن میں دیکھ کر کہا۔

"اللہ کی بندی! تیرے اوپر رحمت و سلامتی ہو"

"اور تم پر بھی، اے ابودرداء کے بھائی!" ام درداءؓ نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ابودرداء کہاں ہیں؟" ابن رواحہؓ نے پوچھا۔

"دکان پر گئے ہیں۔ اور اب لوٹنے والے ہیں۔" ام درداء نے جواب دیا۔

"اندر آجاؤں؟" ابن رواحہؓ نے اجازت مانگی۔

"بسرو چشم۔" ام درداء نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور ان کے لیے راستہ چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور گھر کے کاموں اور بچوں کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئیں۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سیدھے اس کمرے میں پہنچ گئے جس میں ابودرداء نے اپنا بت نصب کر رکھا تھا۔ انھوں نے ایک بنسولا نکالا (جس کو وہ اپنے ساتھ لائے تھے) اور بت پر پل پڑے اور یہ کہتے ہوئے اس کے ٹکڑے کرنے لگے۔

"اَلَا کُلُّ مَا یُدْعٰی مَعَ اللّٰہِ بَاطِلٌ... اَلَا کُلُّ مَا یُدْعٰی مَعَ اللّٰہِ بَاطِلٌ"۔

"سنو! وہ سارے معبود جو عبادت میں خدا کے ساتھ شریک کیے جا رہے، جھوٹے ہیں۔" اور بت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل گئے۔

ادھر جب ام درداء بت والے کمرے میں گئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہ ٹوٹا پڑا ہے اور اس کے ٹکڑے زمین پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔ بت کی یہ درگت دیکھ کر ان کے حواس باختہ ہو گئے اور یہ کہتے ہوئے

اپنا مُنہ پیٹنے لگیں۔

" اَهْلَكْتَنِيْ يَا ابْنَ رَوَاحَةَ .... اَهْلَكْتَنِيْ يَا ابْنَ رَوَاحَةَ۔"

"ابن رواحہ! تم نے تو مجھے تباہ کردیا .... آہ! تم نے مجھے، کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

اِس حادثے کو وقوع پذیر ہوئے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ابودرداء واپس آگئے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی بت والے کمرے کے دروازے پر بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے آثار نمایاں ہیں۔ بیوی کو اس حال میں دیکھ کر ابودرداء نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"آپ کے بھائی عبداللہ بن رواحہ آپ کی غیر موجودگی میں یہاں آئے اور انھوں نے ہی آپ کے بت کی وہ گت بنائی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔" بیوی نے بدستور روتے ہوئے کہا۔

جب انھوں نے بُت کی طرف نظر اُٹھائی اور دیکھا کہ اس کے ٹکڑے چاروں طرف زمین پر بکھرے ہوئے ہیں تو پہلے تو مارے غصّے کے بھڑک اُٹھے اور اس کا انتقام لینے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن کچھ دیر بعد جب ان کے غصّے کی آگ ٹھنڈی ہوگئی تو انھوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا! انھوں نے اپنے دل میں کہا کہ "اگر اس بُت میں ذرا بھی قوت و طاقت ہوتی تو یہ ضرور اپنا دفاع کرتا۔" اور اسی وقت وہ عبداللہ بن رواحہؓ کی طرف روانہ ہوگئے اور ان کو ساتھ لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنے دخولِ اسلام کا اعلان کردیا۔ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے

والے اپنے قبیلے کے آخری فرد تھے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ اس طرح ایمان لائے کہ ایمان لاتے ہی وہ ان کے رگ وپے میں سرایت کر گیا اور ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ وہ اس خیر سے محرومی پر سخت پشیمان تھے جو ان سے فوت ہوگیا تھا۔ ان کو اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ ان کے دوست احباب فہم دین اور حفظِ کتابِ الٰہی میں اُن سے سبقت لے گئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے لیے عبادت و تقویٰ کا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ان تھک جد وجہد اور مسلسل کوشش کے ذریعے تلافیٔ مافات کا عزم مصمم کر لیا۔ انھوں نے دل میں اس بات کا اٹل فیصلہ کر لیا کہ رات دن ایک کر کے وہ اپنے پیش رؤں کو جالیں گے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ وہ عبادت کی طرف مائل ہوئے تو اس طرح کہ دُنیا سے قطع تعلق کر کے پورے طور پر خدا کے ہو رہے۔ وہ حصولِ علمِ دین کی جانب متوجہ ہوئے تو یوں جیسے کوئی پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ وہ کتاب اللہ کو یاد کرنے اور اس کی آیات پر غور و تدبر کرنے میں منہمک ہو گئے۔ اور جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کاروباری مصروفیتیں ان کی لذتِ عبادت کو مکدر کیے دے رہی ہیں اور ان کی وجہ سے وہ علمی مجلسوں میں شرکت سے محروم رہ جاتے ہیں تو انھوں نے بلاتذبذب ان مصروفیات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس فیصلے پر نہ تو انھیں کوئی صدمہ ہوا نہ انھوں نے اس پر کسی افسوس کا اظہار کیا۔

ایک بار کسی نے اس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو انھوں نے سائل کو جواب دیتے ہوئے فرمایا۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے پہلے سے میں تجارت کر رہا تھا۔ اسلام لانے کے بعد میں نے چاہا کہ عبادت کے ساتھ ساتھ تجارت کا سلسلہ بھی جاری رکھوں، لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور آخرکار میں نے تجارت ترک کر دی اور پوری یک سوئی کے ساتھ عبادت میں لگ گیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں ابودرداء کی جان ہے، مجھے تو یہ بات بھی پسند نہیں ہے کہ آج میری کوئی دکان مسجد نبوی کے دروازے کے سامنے ہو اور میری نماز با جماعت فوت نہ ہو اور پھر خرید و فروخت کرکے میں روزانہ تین سَو[۳] دینار نفع کماؤں۔"

پھر انھوں نے سائل کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے کاروبار اور خرید و فروخت کو حرام قرار دیا ہے۔ البتہ میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ میں ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤں جن کو تجارت اور کاروباری مصروفیتیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتیں۔"

بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے تجارت چھوڑ دی بلکہ انھوں نے دُنیا کو ترک کر دیا، وہ اس کی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں سے کنارہ کش ہو کر روکھی سوکھی غذا اور موٹے جھوٹے لباس پر قانع ہو گئے، جس سے وہ اپنی کمر سیدھی رکھ سکیں اور ستر پوشی کر سکیں۔ ایک دفعہ ان کے یہاں کچھ مہمان آئے۔ وہ موسم سرما کی ایک نہایت سرد رات تھی۔ انھوں نے مہمانوں کے لیے گرم گرم کھانا تو بھیج دیا لیکن اوڑھنے کے لیے لحاف نہیں بھیجا۔ جب

انھوں نے سونے کا ارادہ کیا تو لحافوں کے متعلق باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ان سے اس سلسلے میں بات کرتا ہوں، دوسرے نے اسے منع کیا مگر وہ نہ مانا اور جاکر ان کے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ حضرت ابودرداءؓ لیٹے ہوئے ہیں اور ان کی اہلیہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ ان دونوں میاں بیوی کے بدن پر ایک ہلکا سا کپڑا ہے جو نہ تو دھوپ سے بچا سکتا ہے نہ ٹھنڈک سے حفاظت کر سکتا۔ مہمان نے ان سے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ بھی ہماری ہی طرح رات گزار رہے ہیں۔ آخر آپ کا سارا سامان کہاں ہے؟"

"وہاں (آخرت میں)، ہمارا ایک گھر ہے۔ جب بھی کوئی سامان ہمارے ہاتھ آتا ہے، ہم اسے لگاتار وہیں بھیجتے رہتے ہیں۔ اگر ہم نے اس گھر میں کچھ بچا کے رکھا ہوتا تو آپ لوگوں کے پاس ضرور بھیجا ہوتا۔ پھر جس راستے سے ہم کو اس گھر کی طرف جانا ہے، اس میں نہایت دشوار گزار گھاٹیاں ہیں جن کو سامان سے بوجھل شخص کے مقابلے میں ہلکا پھلکا آدمی زیادہ آسانی سے عبور کر سکے گا۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اپنے بوجھوں سے سبکدوش ہو جائیں تاکہ بآسانی اس گھاٹی سے گزر سکیں۔

پھر اس نے کہا۔

"غالباً آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے"

"ہاں، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے" اس نے کہا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو شام کی گورنری کا منصب عطا کرنا چاہا، مگر وہ اس کے لیے آمادہ نہیں

ہوئے ۔جب حضرت عمرؓ کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو انھوں نے کہا کہ اگر آپ اس بات پر راضی ہوں کہ میں وہاں جاکر لوگوں کو ان کے رب کی کتاب اور ان کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دوں اور انھیں نمازیں پڑھایا کروں تو میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں ۔حضرت عمرؓ اس پر راضی ہو گئے اور حضرت ابودرداءؓ دمشق روانہ ہو گئے ۔جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگ دنیا کی دولت و ثروت پر فریفتہ اور عیش و عشرت میں غرق ہیں ۔ لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر وہ گھبرا گئے ۔ ان کو مسجد میں اکٹھا ہونے کے لیے کہا ۔جب سب لوگ وہاں جمع ہو گئے تو حضرت ابودرداءؓ نے ان سے خطاب فرمایا۔

"دمشق کے لوگو! تم آپس میں دینی بھائی، ہمسائے اور دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کے انصار و معاون ہو ۔ لوگو! آخر وہ کون سی چیز ہے جو میرے ساتھ مودت و محبت کا تعلق قائم کرنے اور میری نصیحتوں کو قبول کرنے سے تم کو روک رہی ہے حالانکہ میں اس کے بدلے میں تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں ہوں ۔میری نصیحت و خیرخواہی تمہارے لیے ہے اور میرا خرچ دوسرے پر ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اہلِ علم ایک ایک کرکے اُٹھتے جا رہے ہیں مگر بے علم لوگ علم حاصل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں ۔ آخر ایسا کیوں ہے ؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنی ساری توجہ ان چیزوں کے حصول میں صرف کر رہے ہو جن کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے، اور جن باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے ان کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے ۔ کیا بات ہے کہ تم وہ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوئے ہو جسے تم کو کھانا نہیں ہے، وہ عمارتیں تعمیر کرنے میں مصروف ہو، جن میں تم کو رہنا نہیں ہے اور ان چیزوں کی خواہش کرتے ہو جو تمہیں حاصل

نہیں ہوسکتیں۔ تم سے پہلے کے لوگوں نے دولت کے انبار جمع کیے اور آرزوں کے محل تعمیر کیے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ان کا اکٹھا کیا ہوا سرمایہ تباہ و برباد ہوگیا، ان کی آرزوں کے عالی شان محل زمین بوس ہوگئے اور ان کے تعمیر کردہ مکانات قبروں میں تبدیل ہوگئے۔

اہل دمشق! یہ ہے قوم عاد، جس نے زمین کو مال اور اولاد سے بھر دیا تھا۔ میں قوم عاد کا ترکہ آج دو درہم میں بیچ رہا ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس کو لینا چاہتا ہے؟"

حضرت ابودرداء رضؓ کی یہ تقریر سن کر لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ اور ان کی آوازیں مسجد کے باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔

اور اس روز سے ان کا روزمرہ کا یہ معمول ہوگیا کہ وہ دمشق کی عوامی مجالس میں شریک ہوتے اور بازاروں میں گشت لگاتے۔ ان مواقع پر وہ پوچھنے والوں کو مسائل بتاتے، ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دیتے اور غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو غفلت سے ہوشیار کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ فرصت کے ہر ہر لمحے کو غنیمت جانتے اور ہر مناسب موقع سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دفعہ ان کا گزر ایک مجمع کی طرف سے ہوا جو ایک آدمی کے گرد اکٹھا تھا۔ لوگ اسے زدوکوب کر رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ انھوں نے حقیقت حال دریافت کی تو لوگوں نے بتایا کہ۔

"ایک آدمی ہے جس نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔"

"یہ بتاؤ اگر یہ شخص کسی کنویں میں گر جاتا تو کیا تم اسے وہاں سے نہ نکالتے؟" حضرت ابودرداء رضؓ نے ان سے پوچھا۔

"کیوں نہیں"، سب نے کہا۔

"تو پھر تم اس کو نہ گالی دو، نہ مارو پیٹو بلکہ صرف سمجھانے بجھانے اور وعظ و نصیحت پر اکتفا کرو اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو اس گناہ سے محفوظ رکھا" حضرت ابودرداءؓ نے ان لوگوں کو سمجھاتے ہوئے فرمایا۔

"تو کیا آپ اسے ناپسند نہیں کرتے؟" مجمع نے پوچھا۔

"میں صرف اس کے اس گھناؤنے کام کو ناپسند کرتا ہوں۔ اگر اس سے باز آجائے تو پھر یہ میرا بھائی ہے" انھوں نے جواب دیا۔

حضرت ابودرداءؓ کی یہ بات سُنی تو وہ شخص پھُوٹ پھُوٹ کر رونے اور اپنے گناہ سے توبہ کرنے لگا۔

ایک نوجوان ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور ان سے درخواست کرتا ہے۔

"رسول اللہ کے محترم ساتھی! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔"

"بیٹے! خوش حالی کے زمانے میں خدا کو یاد کرتے رہا کرو، وہ تم کو تنگدستی کے دنوں میں یاد رکھے گا۔"

"بیٹے! تم یا تو عالم بنو یا متعلّم بنو یا علم کے سننے والے بنو۔ چوتھے (جاہل) نہ بنو ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔"

"بیٹے! مسجد کو تمہارا گھر ہونا چاہیے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے۔

"اَلْمَسَاجِدُ بَیْتُ کُلِّ تَقِیٍّ ـــ مسجدیں ہر متقی آدمی کا گھر ہیں۔"

"اور خدائے عزّ و جلّ نے ان لوگوں کے لیے جو اپنے وقت کا بیشتر حصّہ

مسجدوں میں گزارتے ہیں ۔ راحت و رحمت اور پل صراط سے بآسانی گزر کر اللہ کی خوشنودی تک پہنچنے کی ضمانت لے رکھی ہے ۔" حضرت ابو درداء رض اسے نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

اور یہ چند نوجوان ہیں جو راستے پر بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور آتے جاتے لوگوں کو گھور رہے ہیں ۔ حضرت ابو درداء رض ان کے پاس جا کر نصیحت کرتے ہیں ۔

"بیٹو ! مسلمان کی نشست گاہ اس کا گھر ہے ۔ اسی میں رہ کر وہ اپنے نفس اور اپنی نگاہ کی حفاظت کرتا ہے ۔ بازاروں اور عام گزرگاہوں پر بیٹھنے سے پرہیز کرو ، کیونکہ یہ حرکت آدمی کو غافل کر کے فضول اور بے مقصد مشاغل میں مبتلا کر دیتی ہے ۔"

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے قیام دمشق کے زمانے میں ، وہاں کے گورنر حضرت معاویہ بن ابی سفیان رض نے ان کی بیٹی درداء سے اپنے لڑکے یزید کی شادی کا پیغام بھیجا ۔ لیکن انھوں نے یہ پیغام نامنظور کر دیا اور اس کا نکاح ایک عام مسلمان کے ساتھ کر دیا جس کی دینی و اخلاقی حالت سے وہ مطمئن اور راضی تھے ۔ اور جب یہ بات عوام میں پہنچی تو ایک شخص نے اس کے متعلق ان سے سوال کیا ۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا ۔

"میں نے یہ قدم اپنی بیٹی درداء کے فائدے کے پیش نظر اٹھایا ہے ۔"

"وہ کیسے ؟" اس نے وضاحت چاہی ۔

"تمہارا کیا خیال ہے درداء کے متعلق ؟ جب ہر وقت اس کی خدمت میں لونڈیوں اور غلاموں کی جماعت اس کا ہر حکم بجا لانے کے

لیے موجود ہوتی اور وہ خود کو ایسے شاندار محلوں میں پاتی جن کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی ہو، تو اس روز اس کا دین کہاں ہوتا؟" حضرت ابودرداؓ نے کہا۔

ان کے قیام شام کے زمانے میں ملکی حالات معلوم کرنے کے خیال سے خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وہاں کا دورہ فرمایا۔ اور ایک روز اپنے دوست حضرت ابودرداؓ سے ملنے کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ رات کا وقت تھا۔ انھوں نے دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کیوں کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔ حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہو گئے۔ اندر گہری تاریکی مسلّط تھی۔ حضرت ابودرداؓ نے آہٹ محسوس کی تو اُٹھ کر ان کا استقبال کیا اور ان کو بٹھایا۔ پھر دونوں آدمی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت دونوں میں سے کوئی بھی اندھیرے کی وجہ سے دوسرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کے تکیے کو ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ زین کے نیچے رکھا جانے والا کمبل ہے، بستر کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ وہاں کنکریاں بچھی ہوئی ہیں اور ان کے اوڑھنے کو ہاتھ لگایا تو محسوس ہوا کہ وہ ایک پتلا سا کمبل ہے جو دمشق کی شدید سردی سے بچانے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

"اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا میں نے آپ کے لیے کشادگی و فراخی کا انتظام نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے آپ کی ضروریات کے لیے رقم نہیں بھیجی تھی؟"

حضرت ابودرداؓ نے جواب دیا۔

"عمرؓ! آپ کو یاد ہے وہ حدیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہم لوگوں سے ارشاد فرمائی تھی ؟"

"کون سی حدیث ؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ تمہارے پاس دنیا کا ساز و سامان مسافر کے زادِ راہ کی طرح مختصر اور حسبِ ضرورت ہونا چاہیے۔" حضرت ابودرداءؓ نے یاد دلایا۔

"ہاں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی تھی۔" حضرت عمرؓ نے کہا۔

"تو اے عمرؓ! پھر ہم لوگوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا؟" انھوں نے کہا اور پھر دونوں رونے لگے اور صبح تک برابر روتے رہے۔

حضرت ابودرداءؓ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اہلِ دمشق کو وعظ و نصیحت فرماتے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے رہے۔ اور جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اُن کے دوست احباب ان کی عیادت کے لیے آئے اور ان سے پوچھا کہ

"آپ کو کس بات کی شکایت ہے ؟"

"اپنے گناہوں کی" انھوں نے جواب دیا۔

"کوئی خواہش ہے ؟" دوستوں نے دریافت کیا۔

"اپنے رب سے عفو و درگزر کا طالب ہوں۔" اُنھوں نے جواباً ارشاد فرمایا پھر اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ مجھے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی تلقین کرو۔ اس کے بعد وہ برابر کلمۂ طیبہ کو دہراتے رہے اور اسی حالت میں اپنے رب سے جا ملے۔

انتقال کے بعد حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ نے خواب دیکھا کہ

"ایک نہایت ہی ہری بھری اور لمبی چوڑی چراگاہ ہے۔ اس میں چمڑے کا ایک بہت بڑا خیمہ لگا ہوا ہے۔ اس خیمے کے اردگرد بکریاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ ایسا خوش نما اور دل کش منظر تھا کہ ویسا منظر کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ سب کس کا ہے؟ تو ان کو بتایا گیا کہ یہ سب کچھ عبدالرحمان ابن عوف کا ہے۔ پھر عبدالرحمانؓ بن عوف خیمے سے نکلے اور ان سے کہا کہ مالک کے بیٹے! یہ وہ کچھ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم کو قرآن کی بدولت عطا فرمایا ہے۔ اگر تم اُس گھاٹی پر چڑھ کر نظر دوڑاؤ گے تو تم وہ کچھ دیکھو گے جو تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا اور تم وہ کچھ سُنو گے جو تمہارے کانوں نے کبھی نہیں سُنا ہوگا۔ اور ایسی ایسی چیزیں وہاں پاؤ گے جن کا تمہارے دل میں کبھی خیال تک نہیں آیا ہوگا۔" حضرت عوفؓ بن مالک نے پوچھا کہ

"اے ابو محمدؓ! وہ سب کچھ کس کا ہے؟"

انھوں نے فرمایا کہ

"وہ سب اللہ عزوجل نے ابو درداءؓ کے لیے تیار کیا ہے۔ اس لیے کہ وہ دُنیا کو اپنے ہاتھوں اور سینے سے پیچھے دھکیلتے تھے۔"

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

سُعدیٰ بنت ثعلبہ اپنے بچّے زید بن حارثہ کعبی کو ساتھ لیے ہوئے اپنے قبیلے بنو معن سے ملاقات کے ارادے سے روانہ ہوئی۔ لیکن ابھی وہ اپنے قبیلے کے دیار میں پہنچی نہیں تھی کہ بنو قَین کے سواروں نے اچانک حملہ کرکے ان کے مال واسباب پر قبضہ کرلیا، ان کے اُونٹ ہانک لے گئے اور بال بچوں کو گرفتار کرلیا۔ جن بچوں کو وہ پکڑ کر لے گئے تھے ان میں اس کا بچّہ زید ابن حارثہ بھی تھا۔

زید ایک کمسن بچّہ تھا۔ اُس وقت وہ اپنی عُمر کی آٹھویں منزل میں تھا۔ ڈاکو اسے فروخت کرنے کی غرض سے "عُکاظ" کے بازار میں لے گئے، جہاں سے قریش کے ایک دولت مند سردار حکیم ابن حزام بن خُویلد نے چار سو درہم میں خرید لیا۔ حکیم بن حزام نے اس کے علاوہ بھی بہت سے غلام خریدے اور ان کو لے کر مکہ واپس آگیا۔ جب اس کی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد کو اس کی واپسی کی اطلاع ملی اور وہ اس سے ملنے اور اس کو خوش آمدید کہنے گئیں تو اس نے کہا۔

"یہ چند غلام میں سوقِ "عُکاظ" سے خرید کر لایا ہوں۔ آپ ان میں سے جس کو چاہیں پسند کریں، میں اسے آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں۔"

سیدہ خدیجہ نے ایک ایک کرکے سب غلاموں کے چہروں کو غور سے دیکھا۔ ان کی نگاہیں زید کے چہرے پر جاکر ٹک گئیں۔ وہ اُسے دیر تک دیکھتی رہیں اور اس پر ظاہر ہونے والی ذہانت وفطانت کی علامات کی وجہ سے اس کو پسند کرلیا اور لے کر گھر واپس آگئیں۔

کچھ دنوں بعد سیدہ خدیجہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ اس موقع پر وہ ان کی خدمت میں کوئی بیش قیمت تحفہ پیش کرنا چاہتی تھیں۔ اور اس کے لیے انھیں اپنے عزیز غلام زید بن حارثہ سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں ملی، چنانچہ اس کو ان کی خدمت میں پیش کردیا۔

اِدھر یہ خوش نصیب بچہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سرپرستی میں رہ کر ان کی زریں صحبت اور بہترین سیرت وکردار سے بہرہ ور ہوتے ہوئے خوشی اور آزادی کے دن گزار رہا تھا اور اُدھر اس کی ستم رسیدہ اور ماتا کی ماری ہوئی ماں اس کی گم شدگی کے صدمے سے نڈھال ہورہی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھم رہے تھے نہ اس کی سوزشِ غم میں کوئی کمی واقع ہورہی تھی اور نہ ہی اسے کسی پہلو سکون وقرار نصیب ہورہا تھا۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ آیا اس کا لختِ جگر زندہ ہے کہ اس کی بازیابی کی اُمید رکھے یا وہ مرچکا ہے کہ اس سے مایوس ہوکر صبر کی سِل اپنے سینے پر رکھ لے ــــ اور یہ بات اس کے غم کی شدت میں مزید اضافے کا سبب تھی۔ اس کا باپ ملک کے گوشے گوشے میں اسے ڈھونڈتا اور ہر قافلے سے اس کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ اور اس کے اضطراب وبے قراری کی کیفیت ان دردناک اشعار کے قالب میں ڈھل گئی تھی جو سننے والوں کے دلوں کے ٹکڑے کیے دیے رہے تھے ؎

بَكَيْتُ عَلَى زَيْدٍ وَلَمْ أَدْرِ مَا فَعَلْ ... أَحَيٌّ فَيُرْجَى أَمْ أَتَى دُونَهُ الْأَجَلْ

"میں زید کے غم میں گریہ وزاری کر رہا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں ہے۔ آیا وہ زندہ ہے کہ اس سے ملنے کی امید ہو یا اس کی موت اس کی راہ میں حائل ہو گئی ہے"

فَوَاللّٰهِ مَا أَدْرِي وَإِنِّي لَسَائِلٌ ... أَغَالَكَ بَعْدِي السَّهْلُ أَمْ غَالَكَ الْجَبَلْ

"خدا کی قسم مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم، اور میں حیران وسرگرداں پوچھتا پھر رہا ہوں کہ میرے پیچھے تجھے میدان نے چرا لیا یا پہاڑ نے اچک لیا؟"

تُذَكِّرُنِيهِ الشَّمْسُ عِنْدَ طُلُوعِهَا ... وَتَعْرِضُ ذِكْرَاهُ إِذَا غَرْبُهَا أَفَلْ

"سورج اپنے طلوع ہونے کے ساتھ مجھے اس کی یاد دلاتا ہے۔ اور ڈوبتے ہوئے بھی اس کی یاد تازہ کر جاتا ہے"

سَأُعْمِلُ نَصَّ الْعِيسِ فِي الْأَرْضِ جَاهِدًا ... وَلَا أَسْأَمُ التَّطْوَافَ أَوْ تَسْأَمَ الْإِبِلْ

"میں اپنے اونٹ کو تیزی سے دوڑا کر زمین میں اس کی جستجو سے باز نہیں آؤں گا۔ اِلّا یہ کہ میرا اونٹ تھک کر نڈھال ہو جائے"

حَيَاتِيَ أَوْ تَأْتِي عَلَيَّ مَنِيَّتِي ! ! ! ... فَكُلُّ امْرِئٍ فَانٍ وَإِنْ غَرَّهُ الْأَمَلْ

"یا مجھے موت آجائے کیوں کہ ہر شخص فانی ہے چاہے امید اسے بتلائے فریب رکھے"

ایک بار حج کے موسم میں زید کے قبیلے کے کچھ لوگ زیارتِ بیت اللہ کے ارادے سے مکہ آئے ہوئے تھے، طواف کے دوران اچانک زید سے ان کا سامنا ہو گیا۔ انھوں نے زید کو اور زید نے ان کو پہچان لیا۔ اور آپس میں بات چیت بھی ہوئی۔ جب وہ لوگ مناسکِ حج سے فارغ ہو کر اپنے قبیلے میں واپس پہنچے تو انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس کی مفصل روداد حارثہ کے سامنے رکھ دی۔

زید کا سُراغ ملتے ہی اس نے جھٹ پٹ اپنی سواری کو تیار کیا، اپنے لختِ جگر کا فدیہ ادا کرنے کے لیے وافر مقدار میں مال اونٹ پر لادا اور اپنے ہمراہ اپنے بھائی کعب کو بھی لے لیا۔ پھر تیز رفتاری کے ساتھ راستہ طے کرتے ہوتے دونوں مکہ کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر سیدھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر پہنچے اور ان سے کہا،

اے ابنِ عبدالمطلب! آپ لوگ اللہ کے ہمسائے ہیں، قیدیوں کو رہائی بخشتے، بھوکوں کو کھانا کھلاتے اور مظلوموں کی فریاد رسی کرتے ہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں اپنے بیٹے کے سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اتنا مال لائے ہیں جو اس کے فدیہ کے لیے کافی ہو گا۔ آپ ہمارے اوپر احسان فرمائیں اور فدیہ لے کر اُسے چھوڑ دیں۔

"کون ہے تمہارا وہ بیٹا؟" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا۔

"آپ کا غلام، زید بن حارثہؓ" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھوں جو فدیہ سے بہتر ہے؟" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے دریافت کیا۔

"وہ کون سی تجویز ہے" انھوں نے جاننا چاہا۔

"میں اُسے تمہارے سامنے بلائے دیتا ہوں۔ تم اُس کو یہ اختیار دے دو کہ وہ میرے اور تمھارے درمیان سے جس کو چاہے منتخب کرے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانے کو ترجیح دیتا ہے تو تم اُسے کسی مال اور فدیہ کے بغیر اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو، لیکن اگر وہ میرے پاس رہنے کو پسند کرتا ہے تو خدا کی قسم میں اس کی پسند کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تجویز کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"یقیناً آپ نے یہ بڑے انصاف کی بات کہی ہے" دونوں نے متفق ہوتے ہوئے کہا۔
اس کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زید کو بلا کر پوچھا۔
"ان دونوں کو پہچانتے ہو؟"
"ہاں، یہ میرے والد حارثہ ابن شراحیل اور یہ میرے چچا کعب ہیں۔"
زید نے دونوں کی طرف باری باری اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"زید! میں تم کو اس بات کا اختیار دیتا ہوں کہ اگر چاہو تو اپنے والد اور چچا کے ساتھ چلے جاؤ اور اگر چاہو تو میرے پاس رہ جاؤ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔
"میں آپ کے پاس رہوں گا" زید نے کسی تاخیر و تذبذب کے بغیر کہا۔
یہ سن کر اس کے باپ نے کہا۔
"ارے تیرا بیڑا غرق ہو، کیا تو غلامی کو اپنے والدین پر ترجیح دے رہا ہے؟"
"میں ان کی طرف سے ایک چیز دیکھ چکا ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں جو کبھی بھی ان سے جدا ہونا گوارا کرلے" زید نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب اپنے ساتھ زید کے اس غیر معمولی تعلق خاطر کو دیکھا تو اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑا، اسے لیے ہوئے بیت الحرام میں پہنچے اور حجر کے مقام پر قریش کے مجمع میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔
"قریش کے لوگو! گواہ رہنا آج سے یہ میرا بیٹا ہے، یہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔"
یہ دیکھ کر زید کے باپ اور چچا کا جی خوش ہو گیا اور وہ اسے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چھوڑ کر اپنے قبیلے کی طرف واپس لوٹ گئے۔ لوٹتے ہوئے وہ دونوں اس کی طرف سے پورے طور پر مطمئن تھے۔

اور پھر اس روز سے زید بن حارثہ، زید بن محمدؐ کے نام سے پکارے جانے لگے اور وہ برابر اسی نام سے پکارے جاتے رہے، یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ رسالت پر فائز کر دیے گئے اور اسلام نے اللہ کے فرمان اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ[1] کے نزول کے ساتھ منہ بولا بیٹا بنانے کی رسم کالعدم قرار دے دیا۔ اور وہ زید بن محمد سے پھر زید بن حارثہ ہو گئے۔

زید کو کیا معلوم تھا کہ جس وقت انھوں نے اپنے ماں باپ کے مقابلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنایا تھا۔ کیسی غنیمت اُن کے حصے میں آئی تھی، وہ یہ بھی کہاں جانتے تھے کہ جس آقا کی غلامی کو انھوں نے اپنے خاندان اور قبیلے پر ترجیح دی ہے، وہ اولین و آخرین کے سردار اور ساری مخلوق کی طرف اللہ کے رسول ہیں۔ ان کے دل میں تو یہ خیال بھی نہیں گزرا تھا کہ عنقریب رُوئے زمین پر آسمانی بادشاہت کے قیام کا اعلان ہونے والا ہے جو مشرق سے لے کر مغرب تک ساری زمین کو نیکی اور عدل و انصاف سے بھر دے گی اور خود اُن کی حیثیت اس عظیم الشان بادشاہت کی تعمیر میں "خشتِ اوّل" کی ہوگی۔ ان میں سے کوئی بات زید کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل تھا اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے۔ وہ تو فضلِ عظیم کا مالک ہے۔

اور وہ فضلِ عظیم یہ تھا کہ تخییر کے اس واقعہ کے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث فرمایا اور زید مردوں میں سب سے پہلے ان کے اوپر ایمان لائے۔ تو کیا

---

[1] منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ احزاب ۔ ۵

اس سے بڑھ کر بھی اولیت اور فضیلت کا کوئی مقام ہو سکتا ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مسابقت کی جائے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رازوں کے امین و محافظ تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو آپ سفارتی وفود اور فوجی دستوں کی قیادت پر متعین فرماتے اور اپنی عدم موجودگی میں مدینہ پر اپنا قائم مقام مقرر کرتے تھے۔

جس طرح زیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی غیر معمولی محبت اور تعلقِ خاطر کا اظہار کیا اور اپنے ماں باپ پر ان کو ترجیح دی اسی طرح آپؐ نے بھی ان سے اپنی محبت کا اظہار فرمایا اور ان کو اپنے اہل وعیال کے ساتھ شامل کر لیا۔ آپ کی محبت کا یہ حال تھا کہ جب وہ کسی مہم پر گئے ہوئے ہوتے تو آپؐ ہر وقت اُن کے لیے مشتاق و بے قرار رہتے اور جب واپس آتے تو بہت خوش ہوتے اور ان سے ملتے وقت جس بے پناہ مسرت و شادمانی کا اظہار فرماتے وہ صرف انھیں کا حصّہ تھا۔

یہ ہیں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا۔ وہ حضرت زیدؓ کے ساتھ ملاقات کے موقع پر رسول اللہؐ کی فرحت و مسرت کے ایک منظر کی تصویر کشی کرتی ہوئی فرماتی ہیں۔

"ایک دفعہ زیدؓ کسی مہم سے واپس لوٹے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے کمرے میں تھے۔ زید نے جب دروازے پر دستک دی تو آپ جلدی سے اُٹھ کر ننگے بدن ان کی طرف لپکے۔ اُس وقت آپ کے جسم اطہر پر صرف اتنا ہی کپڑا تھا جس نے آپ کے گھٹنے اور ناف کے درمیانی حصۂ جسم کو چھپا رکھا تھا۔ آپؐ اپنے کپڑے کو گھسیٹتے ہوئے

دروازے کی جانب بڑھے، ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کپڑے کے بغیر کبھی نہیں دیکھا، نہ اُس سے پہلے نہ اس کے بعد۔"

یہ بات تمام مسلمانوں میں شہرت کی حد تک عام تھی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زیدؓ کے ساتھ غیر معمولی محبت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو "زیدِ حِبّ" (چہیتے زید) کہہ کر بلاتے اور "حِبّ رسول اللہ" (رسول اللہ کے محبوب) کے لقب سے نوازتے تھے۔ اور بعد میں لوگوں نے ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ کا لقب "حب رسول اللہ" اور "ابن حبِّ رسول اللہ" رکھ دیا تھا۔

سنہ ۸ھ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت نے حبیب (رسول اللہؐ) کو ان کے محبوب (حضرت زیدؓ) کی جُدائی کے ذریعے آزمایا۔ ہوا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارث بن عمیر ازدی کو ایک خط — جس میں اُسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی — دے کر بصریٰ کے حکمران کے پاس بھیجا۔ جب حضرت حارثؓ مشرقی اُردن میں واقع "مُوتہ" کے مقام پر پہنچے تو ایک غسانی حاکم شرحبیل بن عمرو نے ان کا راستہ روک لیا اور ان کو گرفتار کر کے پابہ زنجیر کر لیا اور بعد میں ان کی گردن ماردی۔ رسول اللہؐ کو ان کے قتل کا بے حد صدمہ ہوا کیوں کہ اس سے پہلے آپ کے کسی ایلچی کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔

آپ نے جنگ مُوتہ کے لیے تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوج تیار کی جس کی قیادت اپنے محبوب حضرت زید بن حارثہؓ کے سپرد کی۔ اس کے ساتھ ہی آپؐ نے یہ بھی ہدایت فرمائی کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو فوج کی قیادت جعفرؓ بن ابی طالب کریں گے۔ اور اگر وہ بھی جام شہادت نوش کریں، لشکر کی کمان عبداللہ بن رواحہؓ کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیکن اگر وہ بھی

جنگ میں کام آجائیں تو پھر مسلمان اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کریں گے۔

مجاہدینِ اسلام کا یہ لشکر مدینہ سے چل کر مشرقی اردن کے ایک مقام "معان" پر خیمہ زن ہوگیا۔ اُدھر ہرقل شاہِ روم ایک لاکھ فوجیوں کے ساتھ غسانیوں کی مدد کے لیے چل پڑا۔ بعد میں عرب کے مشرک قبائل میں سے ایک لاکھ مزید سپاہی اس کے لشکر میں شامل ہو گئے اور یہ لشکرِ جرار آگے بڑھ کر مسلمانوں کے پڑاؤ کے قریب فروکش ہوگیا۔

مسلمان معان میں رک کر دو دن تک جنگی لائحۂ عمل تیار کرنے کے لیے غور و مشورہ کرتے رہے۔ ان میں سے کسی نے رائے دی کہ

"ہمیں موجودہ صورتِ حال سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع اور دشمن کی بھاری تعداد سے آگاہ کر کے آپ کے حکم کا انتظار کرنا چاہیے۔"

لیکن دوسرے نے کہا کہ

"لوگو! خدا کی قسم، ہم کثرتِ تعداد اور قوت واسلحہ کے بھروسے نہیں، دینِ اسلام کی صداقت وحقانیت کے بل پر لڑتے ہیں۔ چلو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آگے بڑھو جس کے لیے نکلے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو میں سے ایک کامیابی کی ضمانت دے رکھی ہے۔ یا تو وہ تمہیں فتح و کامرانی سے سرفراز فرمائے گا یا دولتِ شہادت سے مالا مال کرے گا۔"

آخر کار مُوتہ کے میدان میں دونوں فوجوں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ اور مسلمان اس بے جگری سے لڑے کہ رومی ان کی ہمت و شجاعت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان کے دلوں میں ان تین ہزار جاں بازوں کی ہیبت طاری ہوگئی جو دو لاکھ کا سامنا کرتے ہوئے چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ ڈٹ گئے تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ پرچم رسول کی مدافعت میں ایسی پامردی اور ثابت قدمی کے ساتھ لڑے جس کی نظیر بہادری کی داستانوں میں تلاش کرنے سے نہیں ملتی۔ وہ لڑتے رہے اور اس وقت تک لڑتے رہے جب تک سیکڑوں نیزوں نے ان کے جسم کو چھلنی نہیں کر دیا اور وہ خون میں لت پت ہو کر زمین پر نہیں گر گئے۔ ان کے گرتے ہی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے لپک کر جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دی اور غیر معمولی شجاعت و جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پیش روسے جا ملے۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈے کو اپنے قبضے میں کر لیا اور اس کی مدافعت میں دشمنوں سے لڑتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے بعد مسلمانوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو امیر بنا لیا ـــ ان کو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا ـــ وہ فوج کو لے کر پیچھے ہٹ آئے اور اسے مکمل تباہی سے بچا لیا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جنگ کے حالات اور اپنے تینوں سپہ سالاروں کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ کو بے حد صدمہ ہوا اور ان کے اہل و عیال کی تعزیت کے لیے تشریف لے گئے۔ جب حضرت زید بن حارثہؓ کے یہاں پہنچے تو ان کی چھوٹی بچی روتی ہوئی آپؐ کی گود میں آگئی۔ اُسے روتے دیکھ کر آپؐ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بولے۔ ”یہ کیا ہے؟ اے اللہ کے رسولؐ!“

”یہ حبیب کا اپنے حبیب پر رونا ہے!“ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہٗ

ہم اِس وقت مکۂ مکرمہ کی سرزمین میں ہیں۔ اور یہ ۷ق ھ کا زمانہ ہے۔
اس وقت رسولؐ اللہ ان غیر معمولی آلام و مصائب کا سامنا کر رہے ہیں جو
قریش کے ہاتھوں آپؐ اور آپؐ کے اصحاب پر نازل ہو رہی ہیں اور اپنے
کندھوں پر دعوتِ اسلامی کے افکار و ہموم کے اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے
ہیں جس نے آپؐ کی زندگی کو رنج دبلا کے لا متناہی سلسلے سے منسلک کر دیا ہے۔

انھیں صبر آزما اور زہرہ گداز لمحات میں سرور و انبساط کی ایک روشنی
اس مژدۂ جاں فزا کے ساتھ آپ کی زندگی میں نمودار ہوئی کہ اُمّ ایمن نے
ایک لڑکے کو جنم دیا ہے۔ یہ خبر سن کر آپؐ کا چہرۂ مبارک خوشی سے
چمک اُٹھا اور پیشانی کی لکیریں روشن ہو گئیں۔

کون تھا وہ نیک بخت بچہ، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
ایسی خوشی سے ہم کنار کیا تھا؟

وہ اسامہ ابن زیدؓ تھے۔

اس نومولود کی پیدائش پر رسول اللہ کا خوش ہونا آپؐ کے اصحابؓ
میں سے کسی کے لیے باعثِ حیرت نہ تھا، کیوں کہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اُس
کے والدین کا آپؐ کے نزدیک کیا مقام و مرتبہ ہے۔ بچے کی ماں "برکہ حبشیہ"
تھیں جو اپنی کنیت اُمِ ایمن کے ساتھ مشہور تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کی لونڈی تھیں۔ انھوں نے آپ کی
والدہ کی زندگی میں آپ کی پرورش کی اور ان کے انتقال کے بعد آپؐ نے
انھیں کی آغوشِ تربیت میں نشوونما پائی۔ چنانچہ آپؐ نے دنیا میں ہوش کی
آنکھیں اس حال میں کھولیں کہ اُن کے سوا کسی کو "ماں" نہیں جانتے تھے۔
اس وجہ سے آپؐ ان کے ساتھ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ آپؐ ان کے
متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"هِيَ اُمِّيْ بَعْدَ اُمِّيْ وَ بَقِيَّةُ اَهْلِ بَيْتِيْ۔" "یہ میری ماں ہیں، میری ماں کے بعد اور میرے گھر والوں میں سے باقی ماندہ ہیں"۔

تو یہ ہیں اس سعادت مند بچے کی ماں۔ رہے اُس کے والد، تو وہ ہیں
رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، اسلام سے پہلے آپؐ کے مُنہ بولے
بیٹے، آپؐ کے صحابی و راز دار، آپؐ کے خاندان کے ایک فرد اور اسلام
کے بعد لوگوں میں آپ کے نزدیک محبوب ترین شخص، حضرت زید ابن حارثہ
رضی اللہ عنہ۔

حضرت اسامہ ابن زیدؓ کی پیدائش کے موقع پر جیسی خوشی مسلمانوں
کو حاصل ہوئی ویسی ان کے علاوہ کسی دُوسرے بچّے کی پیدائش پر نہیں
ہوئی۔ اس لیے کہ ہر وہ چیز جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعثِ فرحت
و سرور ہوئی وہ مسلمانوں کے لیے بھی وجہِ مسرت و شادمانی ہوتی تھی! اس
لیے مسلمانوں نے اس خوش بخت بچے کا لقب "حِب"، اور "ابن الحِب"
رکھ دیا تھا۔ اور انھوں نے اس کا یہ لقب رکھتے وقت در اصل کسی قسم
کی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا۔ اس لیے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
واقعی اُس سے ایسی محبت رکھتے تھے کہ ساری دنیا اس پر رشک کرتی تھی۔

حضرت اسامہ ابن زیدؓ آپؐ کے نواسے حضرت حسن بن فاطمۃ زہراء رضی اللہ عنہا کے تقریباً ہم سن تھے۔ حضرت حسنؓ گورے، تابندہ رُو، نہایت خوب صورت اور اپنے نانا جان، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے۔ اور حضرت اسامہؓ کا رنگ سانولا اور ان کی ناک چپٹی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبت میں ان دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق و امتیاز رَوا نہیں رکھتے تھے۔ آپؐ حضرت اسامہؓ کو اپنے ایک زانو پر اور حضرت حسنؓ کو دوسرے زانو پر بٹھاتے، پھر اُن دونوں کو ایک ساتھ اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے فرماتے تھے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّھُمَا فَاَحِبَّھُمَا۔" "خدایا! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت کر۔"

حضرت اسامہؓ کے ساتھ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار جب وہ دروازے کی دہلیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑے، ان کی پیشانی زخمی ہوگئی اور زخم سے خون جاری ہوگیا تو آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اشارہ فرمایا کہ اُٹھ کر ان کا خون بند کریں۔ لیکن جب وہ نہیں اُٹھیں تو آپ خود ہی اُٹھے اور خون کو بند کرنے کے لیے ان کے زخم کو چوسنے لگے۔ آپ خون چوستے جاتے اور تھوکتے جاتے اور ایسے الفاظ میں ان کی دل داری فرماتے جارہے تھے جن سے شفقت و رحم دلی کے جذبات اُمڈے پڑ رہے تھے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح بچپن میں ان سے محبت کرتے تھے، جوانی میں بھی اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ قریش کے ایک رئیس حکیم بن حزام نے آپؐ کی خدمت میں ایک نہایت بیش قیمت جوڑا ہدیہ کیا جو

انھوں نے یمن سے پچاس دینار میں خریدا تھا۔ وہ جوڑا یمن کے مشہور بادشاہ "ذی یزن" کا تھا۔ چونکہ اُس وقت حکیم بن حزام مشرک تھے اس لیے آپ نے اُن کا ہدیہ قبول نہیں کیا بلکہ اُن کو اس کی قیمت ادا کردی۔ آپ نے اس کو صرف ایک دفعہ جمعہ کے دن پہنا اور پھر اُتار کر حضرت اُسامہؓ کو دیدیا، جسے پہن کر وہ صبح وشام اپنے ہم جولی مہاجر اور انصاری نوجوانوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلتے تھے۔

حضرت اسامہؓ جب سنِ بلوغ کو پہنچے تو ان کی شخصیت سے ان کریمانہ عادات واطوار اور اُن شریفانہ خصائل و اخلاق کا نمایاں طور پر اظہار ہونے لگا جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے شایانِ شان ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔

وہ نہایت ذہین اور غیر معمولی طور پر بہادر تھے۔ وہ دانش مند ایسے تھے کہ ہر معاملے کے موقع ومحل کو سمجھتے اور اسی کے مطابق اسے نمٹاتے تھے۔ وہ نہایت پاکباز تھے، سطحی قسم کے اعمال وحرکات سے کوسوں دُور رہتے، بے تکلف اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے، لوگ ان سے محبت کرتے، نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا تھا۔

غزوۂ اُحد کے موقع پر حضرت اسامہؓ چند نوعمر صحابہ کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت کے ارادے سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان میں سے جن کو لینا تھا، لے لیا۔ باقی لوگوں کو ان کی کم سِنی کی وجہ سے واپس فرمادیا۔ واپس کیے جانے والوں میں خود حضرت اُسامہؓ بھی تھے۔ جب ان کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے نیچے جہاد کرنے کا موقع نہیں ملا تو وہ اس سعادت سے محرومی پر بہت غمگین

ہوئے۔ واپس لوٹتے ہوئے ان کی ننھی ننھی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔

غزوہ خندق کے موقع پر بھی وہ اور متعدد نوجوان صحابہؓ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، حضرت اسامہؓ کے شوقِ جہاد کا یہ عالم تھا کہ پنجوں کے بل کھڑے ہوکر وہ اپنے قد کو اونچا کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت دے دیں۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترس کھاکر ان کو اجازت مرحمت فرمادی۔ چنانچہ جس وقت آنھوں نے پہلے پہل جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تلوار اٹھائی اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی۔

جنگِ حنین میں، جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے حضرت اُسامہ ابن زیدؓ، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمِ محترم حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ، آپؐ کے ابن عم حضرت ابوسفیان ابن حارثؓ اور چھ دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بات ممکن ہوئی کہ مسلمانوں کے اسی مختصر اور جانباز گروہ کے ذریعے اپنے اصحابؓ کی شکست کو فتح وکامرانی سے تبدیل کرسکیں اور بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو مشرکین کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا سکیں۔

غزوۂ موتہ میں وہ اپنے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ کے زیرِ قیادت اٹھارہ سال کی عمر میں شریک ہوئے۔ انھوں نے اپنے والد کو اپنی آنکھوں کے سامنے میدانِ جنگ میں شہید ہوکر گرتے دیکھا، لیکن نہ تو اس سے اُن کے حوصلے پست ہوئے نہ ان کے پائے استقلال میں کسی قسم کی کوئی لغزش پیدا ہوئی۔ بلکہ وہ لڑتے رہے ان کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی

قیادت میں حتیٰ کہ وہ شہید ہوگئے اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی ماتحتی میں یہاں تک کہ وہ بھی اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے اور پھر حضرت خالدبن ولیدؓ کی سرکردگی میں یہاں تک کہ انھوں نے اس مختصر لشکر کو رومیوں کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر وہ اپنے والد کی شہادت پر اللہ تعالیٰ سے بہترین اجروثواب کی اُمید لیے ہوئے اور ان کے جسدِ مقدس کو شام کی سرحد پر چھوڑکر مدینے واپس لوٹے۔ لوٹتے وقت وہ اسی گھوڑے پر سوار تھے جس پر ان کے والد نے شہادت پائی تھی۔

۱۱ھ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے لیے ایک فوج کی تیاری کا حکم دیا اور اس میں حضرت ابوبکر، عمر، سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ ابن جراح رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جلیل القدر صحابۂ کرام کو شامل کیا اور اس پوری فوج کی قیادت حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہما کے سپرد کی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال سے متجاوز نہ تھی۔ آپؐ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر حدود "بلقاء" اور قلعہ "داروم" تک ان سارے علاقوں کو روند ڈالیں جو روم کے شہر "غزہ" سے متصل واقع ہیں۔

یہ لشکر ابھی کوچ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ اور جب آپؐ کا مرض شدت اختیار کرگیا تو فوج نے اس وقت تک اپنی روانگی موقوف کردی جب تک آپ کے مرض کی کوئی واضح صورتِ حال سامنے نہیں آجاتی۔ حضرت اسامہؓ کا بیان ہے کہ

"جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری نے تشویش ناک صورت

اختیار کرلی تو میں اور میرے ساتھ دوسرے لوگ واپس آگئے۔ میں سرکار (فداہ ابی وامی) کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ کو اس حال میں پایا کہ آپ مرض کی شدت کے سبب بول نہیں پا رہے ہیں۔ آپؐ اپنے دستِ مبارک کو آسمان کی طرف اٹھاتے اور میرے اُوپر رکھتے رہے۔ اس سے میں نے یہ سمجھا کہ آپ میرے لیے دُعا فرما رہے ہیں۔"

پھر آپ کا انتقال ہوگیا اور اس کے بعد جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی بیعت مکمل ہوگئی تو انھوں نے جیش اسامہ کی روانگی کا حکم صادر فرمایا، لیکن انصار میں سے کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سردست اس مہم کو موخر کر دیا جائے۔ انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ سے اس بات کی خواہش کی کہ وہ اس معاملے میں حضرت ابوبکرؓ سے بات کریں۔ ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ نہ مانیں اور فوج کی روانگی پر اصرار کریں تو اُن کی خدمت میں ہماری طرف سے یہ درخواست پہنچا دیجیے کہ وہ فوج کی قیادت کسی ایسے شخص کے حوالے کر دیں جو اسامہ سے سن رسیدہ ہو۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمرؓ کی زبان سے انصار کا یہ پیغام سنتے ہی اچھل کر کھڑے ہوگئے ــــ اُس وقت وہ بیٹھے ہوئے تھے ــــ اور ان کی داڑھی پکڑ کر نہایت غضبناک لہجے میں بولے۔

"ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَابْنَ الْخَطَّابِ اسْتَعْمَلَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَأْمُرُنِيْ اَنْ اَنْزِعَهُ وَاللّٰهِ لَا يَكُوْنُ ذَالِكَ۔	"خطاب کے بیٹے! تمھاری ماں تمھیں گم کرے، رسول اللہؐ نے اس کو مقرر کیا اور تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے معزول کر دوں۔ خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا۔"

جب حضرت عمرؓ لوٹ کر ان کے پاس پہنچے اور انھوں نے دریافت

کیا کہ حضرت ابو بکرؓ نے کیا جواب دیا تو وہ خفا ہوتے ہوئے بولے۔

"اِمْضُوْا ثَكِلَتْكُمْ اُمَّهَاتُكُمْ۔ لَقَدْ لَقِيْتُ فِيْ سَبِيْلِكُمْ مِنْ خَلِيْفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتُ۔

ہٹو، تمہاری مائیں تمہیں گم کریں۔ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے خلیفۂ رسول سے سخت ڈانٹ سننی پڑی ہے۔"

مجاہدین کا یہ لشکر جب اپنے نوجوان قائد کی قیادت میں روانہ ہوا تو خلیفۂ رسول اس کو رخصت کرنے کے لیے پا پیادہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت اسامہؓ نے جو اپنے گھوڑے پر سوار تھے ان سے کہا۔

"خلیفۂ رسول! خدا کی قسم، یا تو آپ سوار ہو جائیں ورنہ میں بھی نیچے اُترتا ہوں۔"

لیکن حضرت ابو بکرؓ نے سوار ہونے کے بجائے ان سے کہا

"خدا کی قسم! نہ تم نیچے اُترو گے، نہ میں سوار ہوں گا۔ . . . . کیا حرج ہے اگر میرے پاؤں بھی تھوڑی دیر خدا کی راہ میں گرد آلود ہو لیں؟"

پھر ان کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں تمہارے دین و ایمان اور خاتمۂ اعمال کو خدا کے حوالے کرتا ہوں اور تم کو رسول اللہ صلعم کے حکم کی تعمیل کی نصیحت کرتا ہوں جو انھوں نے تم کو دیا تھا۔"

پھر ان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

اگر مناسب سمجھو تو عمرؓ کے ذریعہ میری مدد کرو اور انھیں میرے پاس رک جانے کی اجازت دے دو۔" اور انہوں نے حضرت عمرؓ کو اجازت دے دی۔ حضرت اسامہ ابن زیدؓ فوج لے کر روانہ ہوئے اور انھوں نے ہر اس حکم کی تعمیل کی جس کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیا تھا۔ انھوں نے مسلمان شہسواروں کو لے کر بلقاء کے سرحدی حدود اور سرزمین فلسطین کے قریب قلعۂ داروم تک تمام رومی علاقوں کو روند ڈالا۔ انھوں نے

رومیوں کی ہیبت مسلمانوں کے دلوں سے نکال پھینکی اور ان کے سامنے شام مصر اور شمالی افریقہ میں بحرِ ظلمات تک فتح کی راہیں ہموار کردیں۔ اور پھر وہ اسی گھوڑے پر سوار مدینہ واپس لوٹے جس پر ان کے والد شہید ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس قدر مالِ غنیمت لے کر لوٹے تھے جس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یہاں تک کہ کہا گیا،

"مَا رُئِیَ جَیْشٌ اَسْلَمَ وَاَغْنَمَ" آج تک ایسا کوئی لشکر دیکھنے میں نہیں آیا جو جیش اسامہ مِنْ جَیْشِ اُسَامَۃَ بْنِ زَیْدٍ سے زیادہ محفوظ ہو اور اس سے زیادہ مالِ غنیمت لے کر لوٹا ہو۔"

حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ — جب تک ان کی زندگی نے وفا کی — رسول اللہ ؐ کے پاسِ وفا اور آپؐ کی تعظیم کی علامت کے طور پر مسلمانوں کی محبت و تکریم کا مرکز بنے رہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے جو وظیفہ اُن کے لیے مقرر کیا وہ اُن کے فرزند حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ تھا۔ اِس پر انھوں نے اپنے والد سے کہا،

"ابا جان! آپ نے اُسامہ کے لیے چار ہزار اور میرے لیے صرف تین ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا ہے، حالانکہ نہ اُن کے والد آپ سے افضل تھے، نہ انھیں کو مجھ پر کوئی فضیلت حاصل ہے۔"

حضرت عمرؓ نے ان کو جواب دیا کہ

"تمہاری یہ بات حقیقت سے بہت دُور ہے ..... یقیناً اُسامہ کے باپ تمہارے باپ سے اور خود وہ تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب تھے۔" اور حضرت عبداللہؓ یہ سُن کر مطمئن ہوگئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے ملتے تو کہتے۔
"مَرْحَبًا بِاَمِیْرِیْ" "میرے امیر! خوش آمدید" اور جب کسی کو اس پر تعجب ہوتا تو فرماتے۔

"لَقَدْ اَمَّرَہٗ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔" "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو میرا امیر مقرر فرمایا تھا۔"

اللہ تعالیٰ ان عظیم ہستیوں پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پوری تاریخ افراد انسانی کے کسی ایسے گروہ سے ناآشنا ہے جو اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم سے زیادہ عظیم، کامل اور شریف ہو۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ

زید بن عمرو بن نُفَیل لوگوں کے ہجوم سے دُور کھڑے ہو کر قریش کو دیکھ رہے تھے جو ایک تہوار کے موقع پر جشن منانے اور مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے مردوں کو دیکھا جو بیش قیمت ریشمی عمامے اپنے سروں پر باندھے، قیمتی یمنی چادروں میں لپٹے بڑے فخر و غرور کے ساتھ اتراتے پھر رہے تھے۔ اُن کی نظریں اُن عورتوں اور بچوں پر پڑیں جو زرق برق لباس زیب تن کیے اور نادر قسم کے زیورات سے آراستہ میلے کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ان جانوروں کی طرف بھی گئیں جنھیں مکّے کے خوشحال لوگ قسم قسم کی زینتوں سے آراستہ کر کے بتوں کے سامنے ذبح کرنے کے لیے کھینچے لیے جا رہے تھے۔ وہ خانۂ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور قریش کو مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"قریش کے لوگو! بکری کو اللہ نے پیدا کیا، اُسی نے آسمان سے پانی برسایا جس کو پی کر وہ سیراب ہوئی۔ اُسی نے زمین سے گھاس اُگائی جس کو کھا کر وہ آسودہ ہوئی، اور تم ہو کہ اُسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کے لیے کھینچے لیے جا رہے ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑے نادان اور جاہل لوگ ہو۔"

یہ سُن کر اُن کے چچا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے والد خطّاب

غصّے میں بھرے ہوئے ان کے پاس پہنچے اور انھیں تھپّڑ مارتے ہوئے بولے۔

"تیرا ناس ہو، تیری یہ بکواس ہم مسلسل سُنتے اور اسے برداشت کرتے چلے آرہے ہیں مگر اب ہمارے صبر و ضبط کا پیمانہ لبریز ہوچکا ہے۔"

اور پھر اُنھوں نے اپنے قبیلے کے اوباشوں اور بچّوں، لفنگوں کو ان کے خلاف اُبھار دیا جو ان کے پیچھے پڑ گئے اور ان کو اتنا ستایا کہ انھیں مجبوراً مکّہ چھوڑ کر کوہِ حرا کی طرف نکل جانا پڑا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ صرف کبھی کبھی وہ بھی چھپ کر مکّے میں داخل ہو پاتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ قریش کی لاعلمی میں ورقہ ابن نوفل، عبداللہ بن جحش، عثمان بن حارث اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب سے جا ملے۔ اُن کی اُس مجلس میں وہ گمراہی زیرِ بحث تھی جس میں قریش کے لوگ سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے تھے۔ آخر زید نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"خدا کی قسم، تم لوگوں کو یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہاری قوم کے لوگ ہدایت پر نہیں ہیں۔ انھوں نے دینِ ابراہیمی کو فراموش کر دیا۔ اور اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اگر نجات چاہتے ہو تو اپنے لیے کوئی دین تلاش کرو اور اسی کے مطابق زندگی گزارو۔"

چنانچہ ان میں سے چاروں مرد، حنیفیت (دینِ ابراہیمی) کی تلاش میں یہودی اور نصرانی عالموں اور دیگر مذاہب کے اصحابِ علم کے پاس پہنچے۔ ان میں سے ورقہ ابن نوفل نے تو نصرانیت اختیار کر لی لیکن عبداللہ بن جحش اور عثمان بن حارث کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے۔ رہے زید بن عمرو ابن

نفیل توان کی تلاشِ حق کی ان سرگرمیوں کی روداد انھیں کی زبانی سُنیے وہ کہتے ہیں۔

"میں نے یہودیت اور نصرانیت پر غور کیا مگر مجھے اُن دونوں مذاہب میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے مجھے ان کے دینِ حق ہونے پر اطمینان حاصل ہوتا، چنانچہ میں نے ان دونوں سے صرفِ نظر کرلیا اور دینِ ابراہیمی کی تلاش میں مختلف علاقوں کی خاک چھانتا پھرا۔ اسی سلسلے میں جب میں شام پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ فلاں راہب کے پاس کتابُ اللہ کا علم ہے۔ میں اس کے پاس پہنچا اور اپنے مقصد سے اس کو باخبر کیا۔ میری باتیں سُن کر اس نے کہا۔

"مکی بھائی! میرا خیال ہے کہ تم دینِ ابراہیمی کی تلاش میں ہو۔"

"ہاں" میں نے کہا۔ "مجھے اُسی کی جستجو ہے۔"

تب اس نے مجھ کو بتایا کہ

"تم وہ دین ڈھونڈ رہے ہو جس کا آج کہیں وجود نہیں ہے۔ تم اپنے شہر واپس جاؤ اللہ تعالیٰ عنقریب وہاں سے ایک شخص کو منصبِ رسالت پر مامور کرنے والا ہے، جو دینِ ابراہیم کی تجدید کرے گا۔ اگر تم اس کو پا جانا تو اسے لازم پکڑ لینا۔"

زید نبیؐ موعود کی طلب میں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے وہاں سے مکہ کی طرف واپس لوٹے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر مبعوث فرمایا۔ لیکن زید آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے کیونکہ دورانِ سفر بدوؤں کی ایک ٹولی نے حملہ کرکے مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کو قتل کر ڈالا اور ان کی تشنہ کام آنکھیں رسول اللہؐ کے دیدار سے سیراب نہ ہو سکیں۔ جس وقت وہ اپنی زندگی کی آخری

سانسیں لے رہے تھے، انھوں نے اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اَللّٰھُمَّ اِنْ حَرَمْتَنِیْ مِنْ هٰذَا الْخَیْرِ فَلَا تَحْرِمْ مِنْهُ اِبْنِیْ سَعِیْدًا۔" "خدایا! اگرچہ تونے مجھے اس خیر سے محروم کردیا ہے مگر میرے بیٹے سعید کو اس سے محروم نہ کرنا۔"

اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت نے زید کی اس دعا کو شرف قبولیت سے نوازدیا۔ چنانچہ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو زید کے بیٹے سعید ان لوگوں میں تھے جو سب سے پہلے اللہ پر ایمان لائے اور جنھوں نے اس کے نبیؐ کی تصدیق کی۔ اور اس میں کسی حیرت واستعجاب کی بات اس لیے نہیں ہے کہ ان کی نشوونما ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جو ان گمراہیوں سے سخت متنفر تھا جس میں قریش کے لوگ مبتلا تھے اور ان کی پرورش ایک ایسے باپ کی آغوشِ تربیت میں ہوئی تھی جو زندگی بھر حق کی تلاش میں سرگرداں رہا اور اسے موت آئی تو اس حال میں کہ وہ حق کو پالینے کی آرزو دل میں لیے تیزی سے اس کا پیچھا کررہا تھا۔

سعید بن زید رضی اللہ عنہ تنہا مشرف بہ اسلام نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے ساتھ ان کی زوجۂ محترمہ، حضرت عمرؓ کی بہن حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا بھی دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہوئیں۔ اس قریشی نوجوان نے اپنی قوم کے ہاتھوں اپنے دین کی آزمائش کی راہ میں ایسی ایسی زہرہ گداز اور صبرآزما اذیتوں کا سامنا کیا جن کا وہ اپنے مقام بلند کی وجہ سے مستحق تھا۔ لیکن قریش اس کو دینِ اسلام سے پھیر لینے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بلکہ اس کے

برعکس وہ اور اس کی بیوی دونوں مل کر ایک نہایت وزنی اور کفر کی نہایت اہم شخصیت کو اسلام کی طرف کھینچ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی وہ لوگ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا سبب بنے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جس وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، اس وقت ان کی عمر بیس سال سے متجاوز نہ تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پوری جوانی اور اس کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں خدمت اسلام کی راہ میں کھپا دیں۔ وہ بدر کے سوا تمام غزوات میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔ غزوۂ بدر کی عدم شرکت بھی ان کی کسی غفلت یا بے اعتنائی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ایک دوسری اہم ذمہ داری ان کے سپرد کی تھی۔

انھوں نے کسریٰ، شاہِ ایران کو تخت و تاج سے محروم کرنے اور قیصر، شہنشاہِ روم کو اس کے ملک سے بے دخل کرنے میں مسلمانوں کے ساتھ بھرپور حصہ لیا اور مسلمانوں کو جب بھی کسی خطرناک معرکے کا سامنا کرنا پڑا، حضرت سعید بن زیدؓ نے اس میں بے مثال جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا اور نہایت تابناک اور قابلِ تعریف کارنامے انجام دیے۔ ان کی دلیری و جاں بازی کا حیرت ناک کارنامہ وہ ہے جو جنگ یرموک میں انھوں نے انجام دیا تھا اور جو اس کی تاریخ کا روشن ترین باب ہے۔ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ان کے اس بیان سے ہمارے سامنے آتی ہے جسے تاریخ نے اُن کے ان الفاظ میں ہمیشہ کے لیے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے۔

"غزوۂ یرموک کے موقع پر ہماری تعداد تقریباً چوبیس ہزار تھی اس کے مقابلے میں رومی فوج ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ وہ اس طرح بھاری قدموں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہے تھے جیسے پہاڑ ہوں جنھیں خفیہ ہاتھ حرکت دے رہے ہوں۔ ان کے راہب اور بزرگ مذہبی پیشوا اپنے ہاتھوں میں صلیبیں اٹھائے اُن کے آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ بلند آواز سے اپنی فوج کی فتح وکامرانی کی دعائیں مانگ رہے تھے اور ان کے پیچھے ان کی پوری فوج ان کے الفاظ کو اس طرح بلند آہنگی کے ساتھ دہرا رہی تھی جیسے بجلی گرج رہی ہو۔ جب مسلمانوں نے ان کو اس حال میں دیکھا تو ان کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے ان کے اوپر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور ان کے دلوں میں اُن کا خوف سرایت کرگیا۔ اس وقت ابوعبیدہ ابن جراحؓ جو فوج کے سپہ سالار تھے ــــ کھڑے ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کو جہاد و قتال اور جاں بازی و جاں سپاری پر ابھارتے ہوئے کہا۔

"اللہ کے بندو! اللہ کی مدد کرو، وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔ اللہ کے بندو! اللہ کی راہ میں ڈٹ جاؤ اور صبر سے کام لو۔ صبر، یقیناً کفر سے نجات کا، رضاءِ الٰہی کے حصول کا اور ذلت و عار کو دفع کرنے کا ذریعہ ہے۔ اپنے نیزے کو تان لو، اپنی ڈھالوں کو آڑ بنالو اور جب تک میں تمہیں حملہ کرنے کا اشارہ نہ کروں، خاموشی اختیار کیے رہو اور دلوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہو۔"

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے آگے فرماتے ہیں۔

"اسی وقت مسلمانوں کی صف میں سے ایک شخص باہر نکلا اور آگے بڑھ کر اُس نے ابو عبیدہؓ سے کہا۔

"میں اسی وقت خدا کی راہ میں اپنی جان نثار کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تو کیا آپ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں" انھوں نے کہا۔ "تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں میری اور تمام مسلمانوں کی طرف سے سلام پہنچانے کے بعد عرض کر دینا کہ اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے رب نے ہم سے جو وعدے کیے تھے وہ سب ایک ایک کر پورے ہو گئے"۔

حضرت سعیدؓ بن زید فرماتے ہیں،

"میں نے جیسے ہی اس کی باتیں سنیں اور اسے میان سے تلوار کھینچ کر دشمن کے مقابلے میں جاتے دیکھا، زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنا نیزہ سیدھا کر لیا اور لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور دشمن کی طرف سے سب سے پہلا سوار جو ہماری طرف بڑھا اُسے اپنے نیزے میں پرو لیا پھر دشمن پر جھپٹ پڑا۔ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ میرے دل سے ہر قسم کے خوف و ہراس کو دُور کر چکا تھا۔ اور پھر سارے مسلمان رومیوں پر یکبارگی ٹوٹ پڑے اور جب تک اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نصرت اور کامیابی سے نواز نہیں دیا، برابر ان سے مصروفِ جدال رہے"۔

اس کے بعد حضرت سعید ابن زید رضی اللہ عنہ دمشق کی فتح میں شریک ہوئے۔ جب اہلِ دمشق نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی تو حضرت ابو عبیدہ ابن جراح رضی اللہ عنہ نے ان کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس

طرح حضرت سعید بن زیدؓ دمشق کے سب سے پہلے مسلمان گورنر تھے۔

حضرت معاویہ ابن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے زمانے میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس کو مدینے کے لوگ بہت دنوں تک بیان کرتے رہے۔ ہوا یہ کہ اَروٰی بنتِ اُویس نامی ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ سعید بن زیدؓ نے اس کی زمین کا ایک حصہ غصب کر کے اپنی زمین میں شامل کر لیا ہے۔ پہلے تو وہ اس بات کو مسلمانوں میں اِدھر اُدھر بیان کر کے سعید بن زیدؓ کو بدنام کرتی رہی پھر اسے ایک مقدمے کی شکل میں مروان کی عدالت میں پیش کر دیا جو اس وقت مدینے کا گورنر تھا۔ جب مروان نے اس معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے چند آدمیوں کو اُن کے پاس بھیجا تو یہ بات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معزز صحابی کو بہت شاق گزری اور انھوں نے فرمایا۔

" لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس کی زمین دبالی ہے !! میں یہ ظالمانہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں ؟ جب کہ میں نے خود رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے۔

" مَنْ ظَلَمَ شِبْراً مِنَ الْاَرْضِ طُوِّقَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِيْنَ "

" جو شخص کسی کی ایک بالشت زمین غصب کرے گا، قیامت کے روز ساتوں زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔"

پھر انھوں نے اس کے حق میں بددُعا کرتے ہوئے فرمایا۔

" خدایا ! وہ کہتی ہے کہ میں نے اس کے اُوپر ظلم کیا ہے۔ اگر وہ جھوٹی ہے تو اُسے نابینا کر کے اسی کنویں میں گرا دے جس کے بارے میں وہ مجھ سے جھگڑ رہی ہے۔"

اس کے چند ہی دنوں کے بعد وادیِ عقیق میں ایسا زبردست سیلاب

آیا جس نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ اس سیلاب نے دونوں زمینوں کے درمیان واقع حدِ فاصل کو ظاہر کر دیا جس کے متعلق دونوں کے درمیان اختلاف واقع ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کھل کر سب کے سامنے آگئی کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اس معاملے میں حق پر تھے۔ اور ایک مہینہ گزرتے گزرتے وہ عورت اندھی ہو گئی، اور ایک دن جب وہ اپنی اسی زمین میں گھوم رہی تھی — کنویں میں گر پڑی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں۔

ہم لوگ اُس وقت، اپنے لڑکپن میں ایک شخص کو دُوسرے شخص سے یہ کہتے ہوئے سُنتے تھے۔

"أَعْمَاكَ اللهُ كَمَا أَعْمَى الْأَرْوَى" — "اللہ تعالیٰ تجھے اندھا کر دے جیسا کہ اروٰی کو کیا ہے۔"

اور اس میں کسی تعجب کا مقام نہیں ہے کیونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔

"إِتَّقُوْا دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ" — "مظلوم کی بددعا سے بچو، کیونکہ اس کے اور خدائے تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔"

خصوصًا اس وقت خُدا اور بندۂ مظلوم کے درمیان کیسے کوئی حجاب حائل ہوتا جب مظلوم حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے جو ان دس نفوس قدسیہ میں سے تھے جنھیں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی:

حضرت عُمیر بن سعد رضی اللہ عنہٗ

ننھے عمیر نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اس کے باپ سعد کا انتقال ہوگیا اور اس کی پیشانی پر یتیمی کا داغ لگ گیا۔ باپ نے مرتے وقت نہ مال و دولت چھوڑی تھی نہ کوئی سرپرست، جس کی وجہ سے عمیر بے یار و مدد گار اور بے سہارا رہ گیا۔ لیکن بیوہ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی ماں نے قبیلہ بنی اوس کے ایک مالدار شخص جُلاس ابن سُوید سے نکاح کر لیا جس نے عمیر کو اپنی سرپرستی میں لے کر اس کی کفالت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ جلاس نے عمیر کو اتنا پیار دیا، اس سے ایسی شفقت و محبت کا برتاؤ کیا اور اس کے ساتھ اس طرح حسن سلوک سے پیش آیا کہ اسے کبھی اپنی یتیمی کا احساس تک نہ ہوا۔

عمیر کو نشو و نما پاتے اور پروان چڑھتے دیکھ کر جلاس پھولے نہ سماتا کیونکہ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے تمام اعمال و افعال اور اس کی ساری حرکات و سکنات میں ذہانت و فطانت اور صداقت و دیانت کے آثار واضح طور پر محسوس ہو رہے تھے۔

عمیر ابن سعد کی عمر ابھی دس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی کہ وہ اسلام کے

ٹھنڈے اور نرم سائے میں آگیا ایمان اس کے سادہ، پاک اور معصوم دل میں اچھی طرح جاگزیں ہوگیا اور اسلام کا بیج اس کے زرخیز وجود کو موافق اور سازگار پاکر خوب برگ و بار لایا۔ عمیر ابن سعد اپنی کم عمری کے باوجود ہر نماز رسول کریمؐ کے پیچھے باجماعت ادا کرتا اور جب اس کی ماں کبھی اسے اکیلے اور کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مسجد جاتے یا مسجد سے واپس آتے دیکھتی تو اس کا دل خوشی سے باغ باغ ہوجاتا ہے عمیر ابن سعد کی زندگی کے شب و روز اسی طرح عیش و آرام اور مسرت و شادمانی کے ساتھ گزر رہے تھے کہ خدائے تعالیٰ نے اسے ایک سخت آزمائش میں بتلا کردیا، مشیتِ ایزدی نے اس کو ایک ایسے بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ شاید ہی اس عمر کا کوئی بچہ اس سے دوچار ہوا ہو۔

۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے جنگ کے لیے تبوک جانے کا اعلان فرمایا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے لیے تیاریاں مکمل کرلیں۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ جب آپؐ کسی غزوہ کا ارادہ کرتے تو اسے صاف صاف بیان نہیں فرماتے تھے۔ اور صحابۂ کرامؓ متعین طور پر یہ نہیں سمجھ پاتے کہ کدھر اور کس سے جنگ ہوگی۔ مگر خلاف معمول غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؐ نے صراحت کے ساتھ یہ بات بتادی تھی کہ رومیوں سے جنگ کے لیے تبوک چلنا ہے کیوں کہ تبوک کی یہ مہم بعدِ مسافت صعوبتِ سفر اور دشمن کی طاقت و قوت کے اعتبار سے بہت اہم تھی تاکہ مسلمان اس کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسبِ حال مناسب اور اطمینان بخش تیاری کرلیں۔ اس وقت موسم گرما شروع ہوچکا تھا، دھوپ میں کافی شدت آگئی تھی۔ باغوں میں پھل پک کر تیار تھے، سائے گھنے اور خوشگوار ہوگئے

تھے۔ اور اس وقت کسی جنگی مہم پر جانا اور ایسا طویل اور دشوار سفر کرنا آسان نہ تھا۔ مگر ان سب کے باوجود اسلام کے شیدائیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کا بہت خوش دلی کے ساتھ خیرمقدم کیا۔ اور جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ البتہ منافقین کی ایک ٹولی اس مہم کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ ایسی باتیں کرتے جن سے مخلص مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو جائیں۔ حوصلے ٹوٹ جائیں اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں۔ وہ حضورؐ پر آوازے کستے اور اپنی نجی مجلسوں میں بے محابا ایسی باتیں اپنی زبانوں پر لاتے۔ جو ان کے کفر کی واضح اور روشن دلیل ہوتیں۔

لشکر کی روانگی سے چند روز قبل کی بات ہے۔ ایک دن عُمیر بن سعد نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آیا۔ وہاں اس نے مسلمانوں کے ایثار و قربانی اور جذبۂ انفاق فی سبیل اللہ کے جو حسین و دلکش مناظر دیکھے اور ایمان و یقین اور عزم و حوصلہ سے بھرپور جو باتیں سُنیں، ان سے اس کا پیمانۂ دل جوش و مسرت سے لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے مہاجرین و انصار کی عورتوں کو دیکھا کہ وہ حضورؐ کے سامنے آتیں اور اپنے زیورات اُتار کر خدمت اقدس میں پیش کر دیتیں تاکہ آپؐ مجاہدین کے لیے سامانِ جہاد فراہم کر سکیں۔ اُس نے اپنے سر کی آنکھوں سے حضرت عثمانؓ بن عفان کو دیکھا۔ وہ چمڑے کی ایک تھیلی جس میں ایک ہزار دینار تھے، لائے اور اسے بارگاہِ نبوت میں پیش کر دیا۔ اس کی آنکھوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اپنے کندھے پر دو سو اوقیہ سونا لادے چلے آ رہے ہیں اور نبی کریمؐ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، یہی نہیں، اس نے تو

یہ بھی دیکھا کہ ایک شخص اپنا بستر فروخت کے لیے پیش کر رہا ہے تاکہ اس کی قیمت سے وہ اپنے لیے ایک تلوار خرید کر جہاد فی سبیل اللہ میں شریک ہو سکے۔

ایک طرف یہ دل کش اور حیرت انگیز مناظر یکے بعد دیگرے اس کے پردۂ ذہن پر مرتسم ہو رہے تھے اور دُوسری طرف وہ اس افسوس ناک اور حیرت انگیز صورت حال کا سامنا کر رہا تھا کہ جُلاس اپنی خوش حالی اور فراخی کے باوجود جنگ کی تیاریوں سے یکسر غافل ہے اور اس کے یہاں اس سلسلے میں کوئی حرکت نہیں پائی جاتی۔ اس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ وہ جُلاس کو اس کی طرف توجہ دلائے گا اور اس کی ہمت اور حمیت و مروت کو اُبھارے گا۔ اس نے جلاس کے سامنے وہ ساری حوصلہ افزا اور ایمان افروز باتیں بیان کرنی شروع کیں جنھیں وہ سُن کر آیا تھا اور ان تمام مناظر کی تصویر کشی کرنے لگا جنھیں اس کی آنکھیں دیکھ کر آئی تھیں۔

خاص کر اس نے اُن مفلس مسلمانوں کے شوقِ جہاد کی رُوداد اسے سُنائی جو حضورؐ کے پاس آئے اور بڑی لجاجت کے ساتھ یہ درخواست بارگاہِ رسالت میں پیش کی کہ انھیں بھی مجاہدین کی صف میں شامل کر لیا جائے۔ لیکن نبی کریمؐ نے اُن کی درخواست اس وجہ سے رد کر دی کہ آپؐ کے پاس ان کے لیے سواریوں کا انتظام نہ تھا اور وہ اپنی اس محرومی پر آنسو بہاتے ہوئے واپس چلے گئے کہ ان کو وہ سازوسامان میسّر نہیں جن کو لے کر وہ جہاد میں شریک ہوں۔ اور اپنی آرزو پُوری کریں۔ لیکن عمیر سے یہ باتیں سُنتے ہی جُلاس کے منھ سے ایک ایسی بات نکلی جس نے اس کم سِن مومن کے ہوش اُڑا دیے۔ اُس نے کہا۔

"اگر واقعی وہ سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (نبی کریمؐ) پیش کر رہا ہے تو ہم لوگ گدھوں سے بھی بدتر ہیں" جلاس کے مُنہ سے نکلے ہوتے یہ الفاظ سُن کر عمیر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔ یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ جلاس جیسے تجربہ کار جہاندیدہ اور صاحبِ فہم شعور شخص کے مُنہ سے ایسی بات نکلے گی جو اُسے یکایک دائرۂ ایمان سے نکال کر حلقۂ کفر میں داخل کر دے گی۔

نوعمر اور کم سِن عمیر اس صورتِ حال سے سخت سراسیمہ و پریشان تھا۔ وہ اس فکر میں سرگشتہ و حیران تھا کہ اس وقت وہ اپنی ذمہ داری کس طرح ادا کرے۔ اس نے سوچا کہ جُلاس کی طرف سے خاموشی اختیار کر کے اس کی پردہ پوشی کرنا خدا اور رسول سے خیانت کے مترادف اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے ہم معنی ہے۔ اور جو کچھ سُنا ہے اُسے ظاہر کر دینے میں ایک ایسے شخص کی احسان فراموشی ہے جس نے اُسے باپ کا پیار دیا اور یتیمی و تنگ دستی کی حالت میں پناہ دی۔ نوجوان عمیر اس دوراہے پر تھوڑی دیر کے لیے حیران و ششدر کھڑا رہا۔ مگر جلد ہی وہ ایک قطعی اور آخری فیصلے پر پہنچ گیا۔ وہ جُلاس کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے بولا۔

"خدا کی قسم اے جلاس! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رُوئے زمین پر کوئی دوسرا شخص مجھے آپ سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ مگر آپ نے ایک ایسی بات کہی ہے کہ اگر میں اس کا ذکر کروں تو آپ ذلیل و رسوا ہو جائیں گے۔ اور اگر خاموشی اختیار کر لوں تو جرم خیانت کا مجرم ٹھہروں اور اپنے دین و ایمان کو اپنے ہاتھوں تباہ و برباد کر لوں۔ میں اس بات کا عزم کر چکا ہوں کہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی کہی ہوئی اِس بات

سے نبی کریمؐ کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ اپنے لیے بچاؤ کا جو طریقہ چاہیں سوچ لیں۔"
اس کے بعد عمیر ابن سعدؓ نے مسجد پہونچ کر وہ سب کچھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کر دیا جو اس نے جلاس سے سُنا تھا۔ نبی کریمؐ نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا اور ایک صحابی کو بھیجا کہ وہ جلاس کو بُلا لائیں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ جلاس بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو گیا اور سلام کر کے آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔
"جلاس! یہ کیسی بات ہے جو عمیر نے تم سے سُنی ہے؟" پھر آپ نے وہ بات اسے بتائی۔
"اے اللہ کے رسُول! اِس نے سراسر کذب بیانی اور افترا پردازی سے کام لیا ہے میں نے یہ بات نہیں کہی ہے۔" جُلاس نے ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا۔
یہ سُن کر صحابہ کرامؓ کی نظریں باری باری جلاس اور عمیر کے چہروں کا جائزہ لینے لگیں تاکہ وہ ان کے چہروں سے ان کے دلوں میں پوشیدہ باتوں کا اندازہ لگا سکیں ـــ اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرنے لگے۔ ایک شخص جس کا دل نفاق کا مریض تھا بولا۔
"یہ لڑکا بڑا نافرمان اور احسان فراموش ہے۔ اپنے محسن کے ساتھ بدی کرنے پر تُلا ہوا ہے۔" دُوسرے نے کہا۔ "نہیں یہ ایک ہونہار اور سعادت مند بچہ ہے، اطاعتِ الٰہی کے زیر سایہ اس کی نشو و نما ہوئی ہے۔ اس کے چہرے کے آثار اس کی صداقت کی گواہی دے رہے ہیں۔"
رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر کی طرف رُخ کیا تو دیکھا کہ اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے اور آنکھوں سے آنسو کی دھاریں بہہ کر اس کے رخساروں اور سینے کو تر کر رہی ہیں اور وہ کہہ رہا ہے۔

"اے اللہ! اپنے نبیؐ پر میرے بیان کی تصدیق نازل فرما دے، اے اللہ! ......"

جلاس نے اپنے دفاع میں بولتے ہوئے کہا۔" اے اللہ کے رسولؐ! میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل درست اور حق ہے۔ آپ چاہیں تو ہم دونوں سے حلف لے لیں۔ اور میں خدا کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ میں نے وہ بات نہیں کہی جو عمیر نے آپ سے بیان کی ہے۔"

جیسے ہی وہ قسم سے فارغ ہوا اور لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف سے ہٹ کر عمیر کی طرف منتقل ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے آثار طاری ہو گئے۔ صحابہ کرامؓ سمجھ گئے کہ آپؐ پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر ساکت وصامت اور پرسکون ہو کر بیٹھ گئے۔ اور ان کی نگاہیں حضورؐ پر جم گئیں۔ اس وقت جلاس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیلتے جا رہے تھے اور عمیر کے اوپر اطمینان اور انتظار کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔ تھوڑی دیر میں آپؐ کے اوپر سے نزول وحی کے آثار زائل ہو گئے اور آپؐ نے فرمانِ الٰہی کی تلاوت فرمائی۔

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا ، وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ، وَكَفَرُوا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ج وَمَا نَقَمُوا اِلَّا اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ج فَاِنْ يَّتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ	یہ لوگ خدا کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم نے وہ بات نہیں کی ہے حالانکہ انھوں نے ضرور وہ کافرانہ بات کہی ہے۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر کے مرتکب ہوئے اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے کر نہ سکے ان کا یہ سارا غصہ اسی بات پر ہے نا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے

اللّٰہُ عَذَابًا اَلِیۡمًا فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ج وَمَا لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ۔

(توبہ-۷۴)

فضل سے ان کو غنی کردیا ہے۔اب اگر یہ اپنی روش سے باز آجائیں تو انہیں کے لیے بہتر ہے، اور اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آخرت میں کوئی نہیں جو اُن کا حمایتی اور مددگار ہو۔"

اس کو سُنتے ہی جُلاس خوف سے کانپنے لگا اور اس کی زبان اس کے تالو سے چپک گئی۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ ہوا اور بڑی مشکل سے بولا۔

بَلْ اَتُوْبُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ۔ بَلْ اَتُوْبُ . . . . . عمیر نے سچ کہا تھا اور میں جھوٹا تھا۔ یا رسول اللہ! میری جان آپ پر فدا ہو۔ آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ میری توبہ قبول فرمائے۔"

آپؐ نے عمیر بن سعد کی طرف توجہ فرمائی تو دیکھا کہ مسرت کے آنسو اس کے ایمان سے منور چہرے کو تر کر رہے ہیں۔ آپؐ نے دستِ مبارک بڑھا کر نرمی سے اس کا کان پکڑا اور فرمایا۔

"بچّے! تیرے کانوں نے جو کچھ سُنا، صحیح سُنا۔ تیرے رب نے تیری بات کی تصدیق کردی۔"

اس کے بعد جلاس مکمل طور پر دائرہ اسلام میں واپس آگئے اور زندگی بھر اس پر ثابت قدم رہے۔ اور صحابہؓ نے بھی ان کے بہترین طرز عمل کو دیکھا کیونکہ انھوں نے عمیر بن سعد کے ساتھ سابقہ برتاؤ میں کوئی کمی نہیں کی

بلکہ پہلے سے زیادہ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے رہے۔ جب بھی ان کے سامنے عمیر کا ذکر چھڑتا تو کہتے کہ اللہ تعالیٰ اسے جزاء خیر عطا فرمائے، اس نے مجھے کفر سے نجات دلائی اور میری گردن کو جہنم کے عذاب سے چھڑا لیا۔

یہ نوعمر صحابی، حضرت عمیر بن سعدؓ کی بچپن کی تصویر ہے جو انتہائی حسین اور بے حد دل نواز ہے مگر ان کی جوانی کی تصویر اس سے کم خوشنما اور دل افروز نہیں ہے۔

حمص کے باشندے اپنے گورنروں کو پریشان اور ان کے خلاف شکایت کرنے میں مشہور تھے۔ جب بھی ان کے یہاں کوئی گورنر آتا، اس کے اندر ضرور کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈ نکالتے، اس کی شکایت دربار خلافت میں پہنچاتے۔ اور خلیفہ سے مطالبہ کرتے کہ اس کی جگہ پر اس سے بہتر حاکم مقرر کیا جائے۔ یہ دیکھ کر امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ نے طے کر لیا تھا کہ ان کے اوپر کسی ایسے شخص کو والی بناؤں گا جس کی سیرت و کردار پر انھیں کسی طرح سے اعتراض اور نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام قابل اعتماد افسروں پر نظر ڈالی۔ آخر کار ان کی نگاہ انتخاب حضرت عمیر بن سعدؓ پر جا کر ٹک گئی۔ ان کی نظر میں اس کے لیے ان سے زیادہ مناسب کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔

اس کے باوجود کہ انھوں نے شام کے علاقہ الجزیرہ میں غازیانِ اسلام کے ایک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے بہت سے شہروں اور قلعوں پر فتح کے پرچم لہرا دیے تھے۔ اور متعدد قبائل کو مطیع فرمان کر لیا تھا۔ امیرالمومنین نے شام کے محاذ سے واپس بلا کر حمص کی گورنری کا عہدہ ان کے سپرد کیا

اور وہاں جانے کا حکم دیا۔ حضرت عمیر بن سعدؓ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے بالمقابل کوئی چیز قابل ترجیح نہ تھی مگر انھوں نے امیرالمومنین کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ جب وہ حمص پہنچے تو سب سے پہلے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے جمع کیا۔ نماز ختم ہوئی تو تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثنا اور رسول پر درود و سلام کے بعد فرمایا۔

"لوگو! اسلام ایک محفوظ قلعہ اور مضبوط دروازہ ہے۔ اسلام کا قلعہ عدل و انصاف اور اس کا دروازہ حق و صداقت ہے۔ اگر قلعہ ٹوٹ جائے اور دروازہ اکھڑ جائے گا تو اس دین کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ اقتدار جب تک مستحکم و مضبوط رہے گا اسلام محفوظ رہے گا۔ اور اقتدار کی مضبوطی کوڑے سے پیٹنے اور تلوار سے قتل کرنے میں نہیں ہے بلکہ اس کی مضبوطی اور استحکام کا راز حق کو اختیار کرنے اور عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے میں مضمر ہے۔"

اس کے بعد وہ اس منصوبے پر عمل کرنے میں منہمک ہو گئے جس کا اعلان انھوں نے اپنی اس مختصر سی تقریر میں کیا تھا۔

حضرت عمیرؓ بن سعد نے حمص میں مکمل ایک سال گزارا مگر اس مدت میں نہ تو انھوں نے دربار خلافت کو کوئی خط لکھا نہ مسلمانوں کے بیت المال کے لیے خراج وغیرہ کی کوئی رقم ہی بھیجی تو خلیفہ کے دل میں ان کے خلاف شکوک و شبہات نے سر اٹھانا شروع کیا، کیونکہ وہ اپنے گورنروں کے متعلق امارت کے فتنے سے ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہتے تھے۔ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی معصوم نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے کاتب کو بلا کر کہا کہ عمیرؓ بن سعد کو لکھو کہ "امیرالمومنین کا خط پاتے

ہی حمص کو چھوڑ دو، دربار خلافت کے لیے روانہ ہو جاؤ اور اپنے ساتھ خراج کی وہ پوری رقم لے کر آؤ جو تم نے اب تک جمع کی ہے۔"

خط پڑھ کر انھوں نے زادِ راہ کی تھیلی اُٹھائی، کندھے پر پیالہ اور پانی کا برتن رکھا، ہاتھ میں نیزہ تھاما اور حمص کو اپنے پیچھے چھوڑ کر پیدل ہی مدینہ پہنچے تو بھوک اور فاقہ کی وجہ سے ان کا رنگ بدل گیا تھا، جسم نحیف و لاغر ہو گیا تھا، سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے تھے اور صعوبتِ سفر کے آثار ان کے اُوپر پورے طور سے نمایاں تھے۔

حضرت عمرؓ نے انھیں اس حال میں دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئے اور ان سے پوچھا۔

"عُمیر! یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"امیر المومنین! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے، خدا کا شکر ہے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے ساتھ اپنی پُوری دنیا اُٹھا لایا ہوں۔" عمیرؓ نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ کیا؟" (انھوں نے سمجھا کہ بیت المال کے لیے خراج کی رقم لاتے ہیں)۔ "میرے ساتھ میری تھیلی ہے جس میں زادِ راہ رکھتا ہوں، میرا پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں، جس سے اپنا سر اور اپنے کپڑے دھوتا ہوں، میرے ساتھ میرا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں۔" ایک لحہ توقف کے بعد پھر بولے۔

"امیر المومنین! میرے اس سامان کے علاوہ باقی دنیا میرے لیے بے ضرورت ہے مجھے اس کی کوئی احتیاج نہیں۔"

"کیا تم پیدل ہی آتے ہو؟"

"ہاں اے امیر المومنین ۔"

"بیت المال سے سواری کے لیے تمہیں کوئی گھوڑا نہیں ملا ؟"

"نہ انھوں نے دیا، نہ میں نے ان سے اس کا مطالبہ کیا ۔"

"تم بیت المال کے لیے جو رقم لائے ہو، وہ کہاں ہے ؟"

"میں بیت المال کے لیے کچھ نہیں لایا ہوں ۔"

"وہ کیوں ؟"

"حمص پہنچا تو میں نے وہاں کے صلحاء کو جمع کر کے خراج کی وصولی اور اس کی فراہمی کی ذمہ داری ان کو سونپ دی تھی۔ وہ جو کچھ بھی وصول کر کے لاتے میں ان کے مشورے سے وہ پوری رقم مستحقین میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔" حضرت عمیرؓ بن سعد نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے کاتب سے فرمایا۔

"عمیرؓ کے لیے حمص کی گورنری کا پروانہ تجدید تحریر کر دو ۔"

"نہیں امیر المومنین ! میں اب یہ ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا، نہ آپ کے لیے نہ آپ کے بعد کسی دوسرے کے لیے ۔" حضرت عمیرؓ نے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ حضرت عمرؓ سے اجازت لے کر مضافات مدینہ کی ایک بستی میں چلے گئے جہاں ان کے اہل و عیال مقیم تھے۔ عمیرؓ بن سعد کو اپنی بستی میں آئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمرؓ نے ان کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے ایک قابلِ اعتماد شخص، حارث کو بلا کر کہا کہ "عمیر کے یہاں جاؤ اور وہاں بہ حیثیت مہمان قیام کرو۔ اگر تمہیں ان کے یہاں خوش حالی اور کشادگی کے آثار نظر آئیں تو فوراً واپس آ کر مجھے آگاہ کرنا۔ اور

اگر افلاس و تنگدستی کے حالات دیکھو تو یہ سو دینار ان کے حوالے کر دینا"
انھوں نے دیناروں کی تھیلی ان کو تھماتے ہوئے کہا۔ حارث عمیرؓ کی بستی میں آئے، اور پتہ پوچھتے ہوئے ان کے گھر پہنچے۔ ملاقات ہوئی تو ان کو سلام کیا۔ حضرت عمیرؓ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مدینہ سے"

"مدینے کے مسلمان کیسے ہیں؟"

"بخیر و عافیت۔"

"امیرالمومنین کیسے ہیں؟"

"وہ بھی بخیریت ہیں۔"

"کیا وہ حدود کا نفاذ نہیں کر رہے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔ ابھی انھوں نے اپنے لڑکے پر حدِ زنا کا نفاذ کیا ہے جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔"

"اے اللہ عمرؓ کی مدد فرما۔ وہ تجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں" انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"حارثؓ عمیرؓ بن سعد کے یہاں مہمان کی حیثیت سے تین رات مقیم رہے۔ وہ ہر رات ان کو جو کی ایک روٹی پیش کرتے۔ تیسرے دن ان کے قبیلے کے ایک شخص نے حارثؓ سے کہا کہ تم نے عمیرؓ اور ان کے گھر والوں کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ان کے پاس ایک ہی روٹی ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود بھوک اور فاقہ کے ہاتھوں پریشان ہونے کے باوجود تم کو اپنے آپ پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ اگر مناسب سمجھو تو تم میرے یہاں منتقل ہو جاؤ۔"

اس کے بعد حارثؓ نے دیناروں کی تھیلی نکالی اور لے جا کر عمیرؓ کے سامنے رکھ دی، عمیرؓ نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اسے امیرالمومنین نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔"

"اس کو واپس لے جاؤ اور ان کی خدمت میں میرا سلام پیش کرنے کے بعد کہنا کہ عمیرؓ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ سن کر ان کی اہلیہ بول پڑیں ــــ وہ اپنے شوہر اور مہمانؓ کی گفتگو دروازہ کی اوٹ سے سن رہی تھیں ــــ "عمیرؓ! اسے لے لیجیے، آپ کو ضرورت ہو تو خرچ کیجیے ورنہ مستحقین میں تقسیم کر دیجیے۔ یہاں ضرورت مندوں اور محتاجوں کی کمی نہیں ہے۔"

حارثؓ دیناروں کی تھیلی عمیرؓ کے سامنے چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑ گئے۔ عمیرؓ نے دیناروں کو لیا اور انھیں بہت سی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں رکھ کر راتوں رات ضرورت مندوں خصوصاً شہداء کی اولاد میں تقسیم کر دیا۔ ادھر حارث مدینے پہنچے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا۔

"حارثؓ! تم نے کیا دیکھا؟"

"امیرالمومنین! عمیرؓ اور ان کے اہل و عیال بڑے سخت حالات سے دوچار ہیں۔"

"تم نے دینار ان کو دے دیے تھے؟"

"ہاں اے امیرالمومنین!"

"انھوں نے کیا کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس میں سے ایک دینار

بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کریں گے۔"
تب حضرت عمرؓ نے حضرت عمیرؓ بن سعد کو لکھا۔
"میرا یہ خط تم کو ملے تو اسے اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے مدینے کے لیے روانہ ہو جاؤ۔"
حضرت عمیرؓ نے مدینہ کا رُخ کیا اور دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے۔
"عمیر! تم نے ان دیناروں کا کیا کیا؟"
"امیر المومنین! جب وہ دینار آپ مجھے دے چکے ہیں تو اب آپ کو ان سے کیا غرض ہے؟"
"میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے ان کو کہاں خرچ کیا۔"
"میں نے انھیں جمع کر دیا ہے تاکہ وہ اس روز میرے کام آئیں جس روز مال اور اولاد کوئی چیز کام نہ آئے گی۔"
یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں چھلک پڑیں اور انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
"عمیرؓ! میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو تنگدستی کے باوجود اپنے اُوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔"
پھر آپؓ نے انھیں ایک وسق غلّہ اور دو کپڑے دینے کا حکم دیا۔ حضرت عمیرؓ نے کہا۔
"امیر المومنین! مجھے غلّہ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں دو صاع جَو گھر پر چھوڑ آیا ہوں۔ جب تک ہم اسے کھائیں گے۔ خدائے تعالیٰ ہمارے

لیے رزق کا بندوبست کر دے گا۔ البتہ کپڑے میں بیوی کے لیے رکھ لیتا ہوں، اس کے کپڑے بالکل بوسیدہ ہو چکے ہیں۔"

اس ملاقات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت عمیرؓ بن سعد کے لیے اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا وقت آپہنچا جن سے ملنے کا شوق انھیں شب و روز مضطرب اور بیقرار رکھتا تھا۔ وہ سفر آخرت پر روانہ ہوئے تو اس شان سے کہ اُن کے کندھے پر دنیا کا کوئی بوجھ نہ تھا۔ ان کے اس سفر میں ان کے ساتھ اگر کوئی چیز تھی تو وہ ان کا نور ایمان و ہدایت اور ان کا زہد و تقویٰ تھا۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب ان کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع پہونچی تو ان کا دل حزن و ملال سے بھر گیا اور چہرے پر رنج والم کے آثار نمایاں ہو گئے جو ان کے اندرونی کرب کا پتہ دے رہے تھے۔ انھوں نے حضرت عُمیرؓ بن سعد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

وَدِدتُ اَنَّ لِی رِجَالاً مِثْلَ عُمَيْرِبنِ سَعْدٍ اَسْتَعِيْنُ بِهِمْ فِی اَعْمَالِ الْمُسْلِمِيْنَ ۔	کاش میرے پاس عُمیرؓ بن سعد جیسے کچھ اور لوگ ہوتے جن سے میں مسلمانوں کے مسائل میں مدد لیتا۔

اللہ تعالیٰ حضرت عمیرؓ بن سعد سے راضی ہو۔ وہ اپنے طرز کے یگانہ و بے مثال فرد تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

وہ ان آٹھ خوش نصیب ہستیوں میں سے ایک تھے جو سب سے پہلے ایمان لائے ۔ وہ ان دس نیک بخت اشخاص میں سے ایک تھے جنھیں جنّت کی بشارت سے نوازا گیا ۔ وہ ان چھ اصحاب شوریٰ میں سے ایک تھے جنھیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ کا انتخاب کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا ۔ اور وہ ان مخصوص علماء صحابہ میں سے ایک تھے جن کو رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں فتویٰ دینے کا مجاز قرار دیا گیا تھا ۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کا نام عبدِ عَمرو تھا ۔ مگر قبولِ اسلام کے بعد رسُول اللہؐ نے بدل کر عبدالرحمٰن رکھ دیا ۔ تو یہ ہیں عبدالرحمان بن عوف اللہؓ اُن سے راضی ہو اور ان کو راضی کرے ۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِ ارقم میں داخل ہونے سے قبل اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے صرف دو دن بعد مشرف بہ اسلام ہوئے اور خدا کی راہ میں ابتلا و آزمائش کے ان سارے مراحل سے گزرے جن سے السابقو الاولون کو گزرنا پڑا تھا ۔ لیکن وہ آزمائشیں ان کے پائے ثبات کو ذرا بھی متزلزل نہ کر سکیں بلکہ وہ نہایت صدق و خلوص کے ساتھ اپنے دین پر جمے رہے اور دوسرے بہت سے اہل ایمان کی طرح وہ بھی

اپنے دین کو کفار قریش سے بچانے اور آزادی کے ساتھ اس پر عمل کرنے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور بعد میں جب رسول اللہؐ اور آپ کے اصحاب کو مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم ملا تو وہ مسلمانوں کے اس پہلے قافلے میں شامل تھے جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کا قصد کیا تھا۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان مُواخاۃ کا رشتہ قائم کیا، اور اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو حضرت سعد بن ربیع انصاریؓ کے ساتھ رشتۂ اخوت میں منسلک کیا تو حضرت سعد بن ربیعؓ نے ان سے کہا۔

"میرے بھائی! میں مدینہ کا سب سے مالدار شخص ہوں، میرے پاس اس وقت دو باغ اور دو بیویاں ہیں۔ تم دیکھ لو کہ دونوں میں سے کون سا باغ تمہیں پسند ہے تاکہ میں اس سے تمہارے حق میں دست بردار ہو جاؤں اور دونوں میں سے کس عورت کو اپنے حبالۂ نکاح میں لینا چاہتے ہو، تاکہ میں تمہارے لیے طلاق دے کر اُس سے الگ ہو جاؤں"۔

جواب میں حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے اپنے انصاری بھائی سے کہا۔

"اللہ تعالیٰ آپ کے مال و دولت اور اہل و عیال میں برکت دے..... آپ صرف مدینہ کے بازار تک میری رہنمائی فرمادیں..."

چنانچہ حضرت سعد بن ربیعؓ نے ان کو بازار کا راستہ دکھا دیا اور انھوں نے وہیں سے اپنی تجارت کا آغاز کر دیا۔ وہ ضرورت کی چیزیں

خریدتے اور بیچتے رہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کاروبار میں انھیں نفع حاصل ہوتا رہا اور وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتے رہے۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی تھی جس کو بطور مہر ادا کر کے وہ کسی عورت سے نکاح کر سکیں۔

نکاح کے بعد جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کے کپڑوں پر شادی کے موقع پر استعمال کی ہوئی خوشبو کے اثرات اور اس کے داغ دھبّوں کو دیکھ کر آپؐ نے فرمایا۔

"مَهْيَمْ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ؟" عبدالرحمان! یہ کیا ہے؟"

"اے اللہ کے رسولؐ! میں نے شادی کر لی ہے۔" انھوں نے عرض کیا۔

"مَا اَعْطَيْتَ زَوْجَكَ مِنَ الْمَهْرِ؟" بیوی کو مہر کیا دیا ہے؟" آپؐ نے دریافت کیا۔

"ایک نواۃ[1] سونا، اے اللہ کے رسول!" انھوں نے جواب دیا۔

"اَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ، بَارَكَ اللّٰهُ فِي مَالِكَ۔" ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالےٰ تمہارے مال میں برکت دے۔" حضورؐ نے فرمایا۔

حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ فرماتے ہیں۔

"اس کے بعد دنیا اپنی پوری برکات و فوائد کے ساتھ اس طرح میری طرف متوجہ ہو گئی اور میری تجارتی کامیابیوں کا حال یہ ہو گیا کہ اگر میں کسی پتھر کو اٹھاتا تو مجھے اس بات کی توقع ہوتی تھی کہ اس کے نیچے

---

[1] پانچ درہم کے برابر وزن۔

مجھے سونے یا چاندی کا کوئی ٹکڑا ملے گا۔"

غزوہ بدر میں حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے جہاد فی سبیل اللہ کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ انھوں نے دشمنِ خدا عمیر بن عثمان کعبی کو اس کے کیفر کردار تک پہنچایا۔ اور غزوہ اُحد کے موقع پر جب بہت سے لوگوں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اور انھوں نے راہِ فرار اختیار کر لی تھی، حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پائے استقلال میں جنبش تک نہیں ہوئی اور وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ میدانِ کارزار میں ڈٹے رہے۔ اور جب معرکۂ جنگ سے سرخرو اور کامران واپس لوٹے تو ان کے جسم پر بیس سے زیادہ زخم تھے، جن میں سے بعض اتنے گہرے تھے کہ ان میں آدمی کا ہاتھ چلا جاتا تھا۔

لیکن دیکھا جائے تو ان کا جہاد بالنفس ان کے جہاد بالمال کے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فوجی دستہ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے آپؐ صحابۂ کرامؓ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"تَصَدَّقُوْا فَاِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اَبْعَثَ بَعْثًا۔" "میں ایک فوجی دستہ بھیجنا چاہتا ہوں، تم لوگ اس کے لیے مالی تعاون پیش کرو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف فی الفور اپنے گھر جاتے ہیں اور بہ سرعت واپس آکر حضورؐ سے عرض کرتے ہیں۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میرے پاس چار ہزار کی رقم ہے، میں اس میں سے دو ہزار اپنے رب کو قرض دے رہا ہوں اور باقی دو ہزار میں نے

اپنے اہل وعیال کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيمَا أَعْطَيْتَ... وَبَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِيمَا تَرَكْتَ....."

جو کچھ تم نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں تم کو برکت دے اور جو کچھ تم نے بچوں کے لیے چھوڑا ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ تم کو برکت سے نوازے۔"

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک کا قصد فرمایا — جو آپؐ کی زندگی کا آخری غزوہ تھا — تو اس وقت جس طرح افرادی قوت کی ضرورت تھی، مالی وسائل کی احتیاج اس سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیونکہ ایک طرف رومی فوج کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور وہ ہر قسم کے جنگی سازوسامان سے لیس تھی اور دوسری طرف مدینہ میں قحط کا زمانہ تھا، مسافت طویل اور سامانِ سفر قلیل تھا۔ خصوصاً سواریوں کی تو ایسی قلت تھی کہ بہت سے مسلمانوں نے جو غزوہ میں شریک ہونا چاہتے تھے مگر ان کے پاس سواریاں نہیں تھیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر نہایت پُرسوز الفاظ میں بڑی حسرت کے ساتھ سواری کے لیے درخواست کی اور آپؐ سے عرض کیا کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ لے لیں اور آپؐ نے ان کو صرف اس وجہ سے واپس کر دیا کہ آپ کے پاس زائد سواریاں نہیں تھیں جو ان کو دیتے تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریکِ جہاد ہونے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ ان لوگوں کا نام "بَکَّائِین" اور اس لشکر کا نام "جَیْشُ الْعُسْرَة" پڑ گیا۔

اِس موقع پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو حکم دیا کہ وہ اللہ سے اجر و ثواب پانے کی نیّت سے اس کی راہ میں مال خرچ کریں۔ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس اپیل پر لبیک کہنے کے لیے تیزی سے لپکے۔ خود حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ ان معاونین کی صفِ اول میں شامل تھے۔ انھوں نے دو سو اوقیہ[1] کی خطیر رقم بارگاہِ رسالت میں پیش کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ عبدالرحمانؓ بن عوف ایسا کرکے ایک گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے اپنے اہل و عیال کی ضروریات کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے۔" اور جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے دریافت فرمایا کہ

"هَلْ تَرَكْتَ شَيْئًا لِأَهْلِكَ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ ؟"

"عبدالرحمان! تم نے بچّوں کے لیے کچھ چھوڑا ہے؟"

تو انھوں نے عرض کیا۔

"نَعَمْ، تَرَكْتُ لَهُمْ أَكْثَرَ وَأَطْيَبَ۔"

"ہاں، میں نے ان کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے جو میں نے خرچ کیا ہے۔"

آپؐ نے دوبارہ سوال کیا۔

"كَمْ"، کتنا؟"

تو انھوں نے جواب دیا۔

"مَا وَعَدَ اللهُ وَرَسُولُهُ مِنَ

خیر اور اجر کا وہ وعدۂ برحق جو اللہ

---

[1] ایک اوقیہ = ساڑھے دس تولے۔

الخَیرِ وَالاَجرِ۔" اور اس کے رسولؐ نے کیا ہے۔"

لشکر تبوک روانہ ہوا۔ قیام تبوک کے دوران اللہ عزوجل نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو ایک ایسے شرف سے نوازا جو تمام مسلمانوں میں سے صرف انھیں کے لیے مخصوص تھا۔ ہوا یہ کہ نماز کا وقت ہوگیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت موجود نہیں تھے۔ آخر حضرت عبدالرحمان ابن عوفؓ کی امامت میں نماز کھڑی ہوگئی۔ ابھی پہلی رکعت ختم نہیں ہوئی تھی کہ نبی کریمؐ تشریف لے آئے اور نمازیوں کے ساتھ شامل ہوگئے اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کی اقتداء میں نماز ادا فرمائی۔

کیا اس سے بڑھ کر بھی کسی فضل و شرف کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص سرور عالم، امام الانبیا، حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کے شرف سے مشرف ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اُمہات المومنینؓ کی ذاتی ضروریات اور ان کے نجی کاموں کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ وہ ان کی تمام حاجتیں پوری کرتے۔ جب وہ لوگ سفر میں نکلتیں تو یہ اُن کے ہم رکاب ہوتے، جب وہ لوگ حج کے لیے جاتیں تو یہ اُن کے ہمراہ ہوتے۔ ان کے کجاؤں اور ہودجوں پر قیمتی طیلسان کے پردوں کا نظم کرتے اور ان کی پسندیدہ جگہوں پر ان کے قیام کا بندوبست کرتے تھے۔ اُمہات المومنینؓ کی دل و جان سے خدمت کرنا اور ان کے نزدیک پورے طور پر ان کا قابلِ اعتماد ہونا حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی وہ خصوصیت ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر و ناز کریں، کم ہے۔

عامۃ المسلمین اور امہات المومنینؓ کے ساتھ حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کے حُسنِ سلوک اور برّ و احسان کا یہ حال تھا کہ ایک بار انھوں نے اپنی ایک زمین چالیس ہزار دینار میں فروخت کی اور وہ ساری رقم انھوں نے بنو زُہرہ، ضرورت مند مسلمانوں، مہاجرین اور نبی کریمؐ کی ازواج میں تقسیم کردی۔ جب حضرت عائشہؓ کے حصّے کی رقم ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے دریافت کیا کہ یہ رقم کس نے بھیجی ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ عبدالرحمان بن عوفؓ نے، تو انھوں نے کہا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"لَا یَحْنُوْ عَلَیْکُنَّ مِنْ بَعْدِیْ اِلَّا الصَّابِرُوْنَ۔" "میرے پیچھے تم لوگوں کی نگہداشت نہیں کریں گے مگر صابرین۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و برکت کی جو دُعا فرمائی تھی وہ زندگی بھر ان کے اوپر سایہ فگن رہی۔ یہاں تک کہ وہ صحابۂ کرامؓ میں سب سے زیادہ مالدار آدمی ہوگئے۔ ان کا تجارتی کاروبار برابر ترقی کرتا اور اس کا دائرہ لگاتار وسعت اختیار کرتا رہا۔ ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا جو دوسرے شہروں سے اہل مدینہ کے لیے گیہوں، آٹا، کپڑے، برتن اور خوشبو وغیرہ اشیاءِ ضرورت لے کر مدینے پہنچتے اور وہاں کی پیداوار کا وہ فاضل حصّہ دوسرے علاقوں میں لے جاتے تھے جو اُن کی ضرورت سے بچ رہتا۔

ایک بار ان کا ایک تجارتی قافلہ ـــ جو سات سو اُونٹوں پر مشتمل تھا ـــ مدینہ پہنچا۔ جی ہاں، وہ قافلہ سات سو اُونٹوں پر مشتمل

تھا جن کی پیٹھوں پر خوراک کے ذخیرے، ضروریاتِ زندگی کے سامان اور وہ تمام چیزیں لدی ہوئی تھیں جن کی ضرورت لوگوں کو اکثر پڑتی ہے۔ جیسے ہی وہ قافلہ مدینے میں داخل ہوا، پوری زمین دہل گئی، گلیاں گونج اُٹھیں اور ہر طرف چیخ و پکار اور شور و غل سُنائی دینے لگا۔ شور سُن کر حضرت عائشہ رضؓ نے پوچھا کہ یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ عبدالرحمان بن عوف رضؓ کا سات سو اونٹوں پر مشتمل ایک تجارتی قافلہ، گندم، آٹا اور سامان خوراک لے کر پہنچا ہے تو انھوں نے فرمایا۔

"بَارَكَ اللّٰهُ لَهُ فِيمَا أَعْطَاهُ فِي الدُّنْيَا، وَلَثَوَابُ الْآخِرَةِ أَعْظَمُ. فَلَقَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول: "يَدْخُلُ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ الْجَنَّةَ حَبْوًا۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس میں برکت دے۔ یقیناً آخرت کا ثواب بہت بڑا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ عبدالرحمان بن عوف رضؓ گھسٹتے ہوئے جنت میں جائیں گے۔"

اونٹوں کے بیٹھنے سے پہلے کسی نے ام المومنین رضؓ کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ حضرت عبدالرحمان رضؓ بن عوف تک پہنچاتے ہوئے ان کو جنّت کی خوش خبری سُنادی۔ یہ مژدۂ جاں فزا سنتے ہی وہ اُڑ کر حضرت عائشہ رضؓ کی خدمت میں پہنچے اور ان سے دریافت کیا۔

"امّاں! کیا خود آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا تھا؟"

تو انھوں نے فرمایا، "ہاں!"

یہ سُن کر وہ بے حد خوش ہوئے اور حضرت عائشہ رضؓ کو مخاطب کر کے بولے۔

"اماں جان! اگر ہو سکا تو میں کھڑا ہو کر جنّت میں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میں آپ کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں یہ پورا قافلہ اس کے اُوپر لدے ہوئے سامانوں، اس کے کجاوُں اور ٹاٹوں سمیت اللہ کی راہ میں دے رہا ہوں۔"

اس روشن، تابناک اور مبارک دن سے ــــ جس دن سے ان کو دخولِ جنّت کی خوش خبری دی گئی تھی ــــ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ مال کمانے اور اسے خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی طرف غیر معمولی شوق اور جذبے کے ساتھ متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے خفیہ اور علانیہ، دائیں اور بائیں ہر طرف مال خرچ کرنے لگے۔ اُنھوں نے چالیس ہزار درہم صدقہ کے طور پر دیے۔ پھر دو سو اوقیہ سونا خیرات کیا۔ پھر مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے پانچ سو گھوڑے اور دُوسرے مجاہدین کے لیے ڈیڑھ ہزار اونٹ فراہم کیے۔ اور جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کی ایک بڑی تعداد کو غلامی کے بندھن سے آزاد کر دیا۔ اور اس وقت اصحابِ بدر میں سے جتنے صحابۂ کرامؓ زندہ تھے ان میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیت کی۔ چنانچہ ان حضرات نے وصیت کے مطابق وہ رقم لے لی۔ اس وقت ان کی تعداد ایک سو تھی۔ اور انھوں نے امہات المومنینؓ میں سے ہر ایک کے لیے کثیر رقم کی وصیت کی۔ حضرت عائشہؓ اکثر اُن کے لیے دعا کرتے ہوئے فرماتی تھیں۔

"سَقَاهُ اللّٰهُ مِن مَاءِ السَّلْسَبِيْلِ۔" "اللہ تعالیٰ ان کو چشمۂ سلسبیل سے سیراب کرے۔"

انھوں نے اپنے ورثاء کے لیے اس قدر مال چھوڑا کہ اعداد ان کا شمار کرنے سے قاصر ہیں۔ انھوں نے ایک ہزار اونٹ، سو گھوڑے اور تین ہزار بکریاں چھوڑیں۔ وفات کے وقت موجود ان کی چار بیویوں میں سے ہر ایک کو کل ترکے کا $\frac{1}{32}$ ملا جس کی مالیت اسّی ہزار تھی۔ انھوں نے سونے اور چاندی کے جو ڈھیر ترکے میں چھوڑے انھیں وارثوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لیے کلہاڑیوں سے کاٹنا پڑا۔ اور کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔

یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعاء کی وجہ سے تھا جو آپؐ نے ان کے مال میں برکت کے لیے کی تھی۔ لیکن یہ مال نہ تو ان کو کسی قسم کے مالی فتنے میں مبتلا کر سکا نہ ان کے رویّے میں کسی تبدیلی کا سبب بن سکا۔ لوگ جب ان کو ان کے غلاموں کے درمیان دیکھتے تو اُن کے اور غلاموں کے درمیان تمیز نہیں کر پاتے تھے۔ ایک دن ان کے سامنے کھانا لایا گیا ــــ اس روز وہ روزے سے تھے ــــ تو انھوں نے کھانے کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ کہا۔

"جب مصعب بن عمیرؓ شہید کیے گئے ــــ اور وہ مجھ سے بہت بہتر تھے ــــ تو ان کو کفن دینے کے لیے ہم لوگوں کو صرف اتنا کپڑا میسّر آسکا کہ جب اس سے ان کا سَر چھپایا جاتا تو پاؤں کھُل جاتے اور جب پاؤں کو چھپایا جاتا تو سر کھُلا رہ جاتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو غیر معمولی خوش حالی اور فراخی سے نوازا۔ مجھے تو اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہمارے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں نہ دے دیا

گیا ہو۔" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔
حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کی پوری زندگی خیر و سعادت سے معمور اور انتہائی قابلِ رشک تھی۔

• صادق و مصدوق حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنّت کی بشارت دی۔

• آخری آرام گاہ تک لے جاتے ہوئے ان کے جنازے کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کندھا دیا۔

• ان کی نماز جنازہ ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

• اور ان کے جنازے کی مشایعت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کی اور ان الفاظ میں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار فرمایا۔

"لَقَدْ اَدْرَكْتَ صَفْوَهَا، وَ سَبَقْتَ زَيْفَهَا، يَرْحَمُكَ اللّٰهُ۔"

آپ نے دنیا میں سے اس کے عمدہ حصے کو اپنایا اور اس کے خراب حصے کو چھوڑ کر گزر گئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت کرے۔

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہٗ

بنی عبد مناف میں سے پانچ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی غیر معمولی مشابہت رکھتے تھے کہ کمزور نگاہ والوں کو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اکثر التباس ہو جایا کرتا تھا۔

یقیناً آپ اُن پانچوں حضرات کا تعارف حاصل کرنا چاہتے ہوں گے جو آپ کے نبی کے ساتھ اتنی مشابہت رکھتے ہوں۔ تو آیئے ہم ان کا تعارف حاصل کریں۔

وہ ہیں حضرت ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برادرِ عم زاد اور رضاعی بھائی حضرت قُثَم بن عباس بن عبدالمطلب، آپؐ کے چچازاد بھائی۔ حضرت سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم، امام شافعیؒ کے دادا۔ حضرت حسن بن علی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے۔ وہ پانچوں میں سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کے برادر حقیقی۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

ذیل کی سطروں میں ہم حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی زندگی کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ابو طالب قریش اور خاندانِ بنی ہاشم میں اپنی رفعتِ شان اور عُلوِ منزلت

کے علی الرغم ایک کثیر العیال اور تنگ دست شخص تھے۔ اور اس قحط نے ان کی مفلوک الحالی میں مزید اضافہ کر دیا تھا جس میں قریش کے لوگ مبتلا تھے۔ جس کی لپیٹ میں آ کر جانور ہلاک اور فصلیں تباہ برباد ہو رہی تھیں۔ جس نے لوگوں کو بوسیدہ ہڈیاں تک کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)، اور ان کے چچا عباس بن عبد المطلب بنو ہاشم کے خوش حال ترین افراد تھے۔ ایک روز محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عباس سے کہا۔

"چچا جان! آپ کے بھائی ابو طالب ایک کثیر العیال آدمی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس بُری طرح سے قحط کی شدت اور فاقہ کشی کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم ان کے پاس چلیں اور ان کے بچوں میں سے کچھ کی کفالت اپنے ذمے لے کر ان کے بار کو کچھ ہلکا کرنے کی کوشش کریں۔"

عباس نے ان کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک تم نے ایک کار خیر کی طرف دعوت دی ہے اور حُسنِ سلوک پر اکسایا ہے۔"

پھر دونوں نے جا کر ابو طالب سے کہا۔

"جب تک لوگوں کے سروں سے مصیبت کے یہ بادل چھٹ نہیں جاتے، ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی پرورش کا جو بھاری بوجھ تنہا آپ کے کندھوں پر ہے، اس میں آپ کا ہاتھ بٹائیں اور آپ کے اس بوجھ کو کچھ ہلکا کریں۔"

ابو طالب نے بھائی اور بھتیجے کی اس پیش کش کو قبول کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگ عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو تو باقی بچوں کے متعلق جو چاہو فیصلہ کر سکتے ہو۔"
چنانچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے علی کو اور عباس نے جعفر کو لے کر اپنے بچوں کے ساتھ شامل کر لیا۔ اس کے بعد علی برابر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی بنایا اور دینِ حق اور ہدایت دے کر مبعوث فرمایا۔ اسی طرح جعفر بھی برابر اپنے چچا عباس کے یہاں رہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔

حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور ان کی اہلیۂ محترمہ حضرت اسماء بنت عُمَیس اس کاروانِ نکہت و نور میں آغازِ سفر ہی سے شریک تھے۔ یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دارِ ارقم میں داخل ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک پر ایمان لا چکے تھے۔ اور اس ہاشمی نوجوان اور اس کی نوعمر بیوی نے قریش کے ہاتھوں وہ ساری بلائیں اور مصیبتیں جھیلیں جن سے ابتدائی زمانے کے مسلمانوں کو پالا پڑا تھا۔ انھوں نے ہر اذیت پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا کیوں کہ ان کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ جنت تک پہنچنے کے لیے ان پُرخار وادیوں اور دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن یہ چیز ان کے اور ان کے دوسرے دینی بھائیوں کے لیے انتہائی تکدر اور پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی کہ قریش کے لوگ ان کے اور اسلامی شعائر و احکام کی ادائیگی کے درمیان حائل ہو کر انھیں لذتِ عبادت سے محروم کر رہے تھے۔ وہ ہر جگہ ان کی گھات میں بیٹھے رہتے اور ہر وقت ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

اس صورتِ حال سے تنگ آکر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی اجازت طلب کی کہ وہ اپنی بیوی اور صحابۂ کرام رض کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ سرزمینِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ آپؐ نے انھیں اس کی اجازت تو دیدی مگر آپؐ کو اس پر دلی صدمہ ہوا۔ کیوں کہ یہ چیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مستقل سوہانِ رُوح کا باعث تھی کہ ان پاک طینت اور نیک نفس ہستیوں کو صرف اس جرم میں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعلان کیا ہے، ناحق اور ظالمانہ طور پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنا پیارا وطن جس کی گلیوں اور میدانوں میں انھوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے بہترین ایام گزارے ہیں، جس کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے پر ان کی محبت کے لافانی نقوش ثبت ہیں ـــ چھوڑ کر چلے جائیں ـــ لیکن اس وقت آپؐ کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ قریش کے ان مظالم کو روک سکتے۔

مہاجرین کا یہ پہلا قافلہ خدا کی راہ میں اپنا وطن چھوڑ کر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں سرزمین حبشہ کی طرف روانہ ہوا۔ اور وہاں پہنچ کر اس کے نیک دل اور انصاف پسند حکمران نجاشی کی پناہ میں قیام پذیر ہوگیا۔ اور قبولِ اسلام کے بعد پہلی بار انھوں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا اور عبادتِ الٰہی کی لذت اور اس کی حلاوت سے لطف اندوز ہوئے۔ وہاں نہ ان کو اس بات کا کھٹکا تھا کہ کوئی ان کی عبادت کا مزہ کرکرا کرے گا نہ وہ اس اندیشے میں مبتلا تھے کہ کوئی ان کے پُرسکون لمحات کو بے چینی اور بے اطمینانی سے بدل دے گا۔

اِدھر جب قریش کو ان مسلمانوں کے ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا علم ہوا اور ان کو پتہ چلا کہ وہ لوگ شاہِ حبشہ کی حمایت اور اس کی پناہ میں اپنے دین و عقیدہ کے مطابق اطمینان اور بے خوفی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں تو وہ اُن کے خلاف سازش اور صلاح و مشورہ میں مصروف ہوگئے۔ تاکہ یا تو انھیں قتل کرنے میں کامیاب ہوجائیں یا واپس لاکر قید خانے میں ڈال دیں۔ اب وہ پوری سرگزشت ہم حضرت ام سلمہ کے حوالے کرتے ہیں کہ وہ اُسے ہو بہو اس طرح بیان کریں جس طرح اُن کی آنکھوں نے دیکھا اور ان کے کانوں نے سُنا تھا۔ وہ فرماتی ہیں۔

"جب ہم لوگ حبشہ کی سرزمین میں جاکر ٹھہرے تو وہاں ہم کو بہترین لوگوں کی ہم سائیگی ملی۔ وہاں ہم اپنے دین کے متعلق ہر طرح بے خوف ہوکر اپنے رب کی عبادت میں مصروف ہوگئے۔ وہاں نہ تو ہم کو کسی اذیت سے دو چار ہونا پڑا نہ کوئی ناپسندیدہ اور دل آزار بات سُننی پڑی۔ ان حالات کی اطلاع جب قریش کو ہوئی تو انھوں نے ہمارے خلاف سازش کرکے اپنے دو مضبوط آدمیوں، عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو نجاشی کے پاس بھیجا۔ اور ان کے ہاتھ نجاشی، اس کے درباریوں اور فوجی سرداروں کے لیے سرزمین حجاز کی وہ نادر اور بیش قیمت چیزیں تحفہ کے طور پر بھیجیں جنھیں وہ پسند کرتے تھے۔ ساتھ ہی ان کو اس بات کی تاکید بھی کردی کہ ہمارے (مسلمانوں کے) مسئلہ پر بادشاہ سے گفتگو کرنے سے پہلے ہر سردار کو اس کا تحفہ دیدینا۔

جب وہ دونوں حبشہ پہنچے تو حسب ہدایت سب سے پہلے وہ نجاشی کے درباریوں سے ملے اور ان میں سے ہر ایک کے سامنے ہدیہ پیش کرنے

کے بعد اس سے کہا کہ ہمارے یہاں سے کچھ نا سمجھ لڑکے جنھوں نے اپنے آباء و اجداد کا پرانا دین ترک کر کے ایک نیا دین اپنا لیا اور اپنی قوم کے اندر پھوٹ ڈال دی ہے ـــــ بھاگ کر بادشاہ کے ملک میں آگئے ہیں۔ جب ہم بادشاہ سے ان کے معاملہ میں گفتگو کریں تو آپ لوگ ہماری تائید کریں اور اس کو یہ مشورہ دیں کہ وہ ان سے ان کے دین کے بارے میں کوئی سوال و جواب کیے بغیر انھیں ہمارے حوالے کر دے، کیوں کہ اُن کے قبیلوں کے سربراہ ان کو اور ان کے عقائد کو زیادہ بہتر طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ تو درباریوں نے کہا کہ ہم ضرور بادشاہ کو مشورہ دیں گے۔"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں۔

"عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کو اگر کوئی بات سب سے زیادہ ناگوار تھی تو وہ یہ کہ نجاشی ہم لوگوں میں سے کسی کو اپنے پاس بلا کر اس کی بات سنے۔ ان دونوں نے بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر اس کی خدمت میں ہدیے پیش کیے جن کو اس نے بہت پسند کیا، پھر اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"اے بادشاہ! ہمارے کچھ بدترین قسم کے نوجوان ہیں جنھوں نے بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لے رکھی ہے۔ انھوں نے ایک ایسا دین اختیار کر رکھا ہے جس سے نہ ہم لوگ واقف ہیں نہ آپ ہی اس سے متعارف ہیں۔ انھوں نے ہمارا دین چھوڑ دیا ہے مگر وہ آپ کے دین میں بھی نہیں داخل ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی قوم کے سرداروں، ان کے آباء و اعمام اور ان کے خاندان کے سربراہوں نے اس درخواست کے ساتھ ہم کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ انھیں واپس بھیج دیں،

کیونکہ جو فتنہ اِن لوگوں نے برپا کر رکھا ہے اس کو وہی لوگ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔"

یہ سُن کر بادشاہ نے سرداروں کی طرف نظر اُٹھائی۔ اُنھوں نے قریشی سفیروں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"عالی جاہ! یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جو غلط رویّہ اپنایا ہے اس کے متعلق وہی لوگ بہتر جانتے ہیں اس لیے ان کو واپس بھیج دیں تاکہ وہ لوگ ان کے بارے میں جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔"

بادشاہ کو درباریوں کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اُس نے سخت غصّے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، خدا کی قسم جب تک ان کو بلا کر ان باتوں کے متعلق ان سے پُوچھ نہیں لیتا جو ان کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں، انھیں کسی کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اگر وہ باتیں جو یہ دونوں ان کے بارے میں کہہ رہے ہیں درست ہوئیں تو میں اُنھیں ان کے سپرد کر دوں گا۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا تو میں اس وقت تک ان کی حمایت سے ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا جب تک وہ یہاں رہیں گے۔"

حضرت ام سلمہؓ اپنے بیان کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہتی ہیں۔

"پھر نجاشی نے ہم لوگوں کو ملاقات کے لیے بلا بھیجا۔ اُس کے یہاں جانے سے پہلے ہم لوگ ایک جگہ جمع ہوئے اور ہم نے آپس میں کہا کہ بادشاہ ہم سے ہمارے دین کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ اس موقع پر ہمیں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر بالکل واضح طور پر وہ باتیں اس کے سامنے

رکھ دینی چاہئیں جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ اور بادشاہ کے سامنے ہم سب لوگوں کی نمائندگی صرف جعفرؓ بن ابی طالبؓ کریں گے۔ ان کے سوا دوسرا کوئی نہیں بولے گا۔

جب ہم لوگ بادشاہ کے دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ اس نے اپنے درباریوں کو بلا رکھا ہے، جو اپنی اپنی جگہوں پر، اپنے مخصوص درباری لباس زیب تن کیے، سروں پر ٹوپیاں رکھے، سامنے کتابیں کھولے بیٹھے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ بھی اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں۔ جب سب لوگ اطمینان سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تو نجاشی نے ہماری طرف رُخ کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ کون سا نیا دین ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے، جس کے لیے تم نے اپنے آبا و اجداد کا دین ترک کر دیا مگر نہ تو میرے دین میں داخل ہوئے نہ دیگر ادیان و ملل میں سے کسی کو اپنایا؟"

بادشاہ کا سوال سُن کر جعفرؓ بن ابی طالب اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے بادشاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے بادشاہ! ہم جاہل تھے، بت پرستی کرتے، مُردار کھاتے، فواحش کا ارتکاب کرتے، قطع رحمی کرتے اور پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے۔ ہم میں کا ہر طاقت ور اپنے کمزوروں پر ظلم ڈھاتا تھا۔ ایک زمانے تک ہماری زندگی کے شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسُول بھیجا جو خود ہم ہی میں سے تھا۔ جس کی خاندانی شرافت و نجابت، ذاتی صداقت و امانت اور فطری عفت و عصمت سے ہم سب اچھی طرح واقف تھے۔ اُس نے ہم کو خدا کی طرف پکارا۔ اس

نے ہمیں دعوت دی کہ ہم خدا کو ایک مانیں، صرف اسی کی عبادت کریں اور پتھر سے تراشے ہوئے ان بے جان بتوں کی پرستش سے باز آجائیں جن کی پوجا ہم اور ہمارے آبا و اجداد کرتے چلے آرہے تھے۔ اس نے ہم کو راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، محارم سے اجتناب اور خوں ریزی سے احتراز کرنے کی تلقین کی نیز بے حیائی، دروغ گوئی، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔ اس نے ہم کو حکم دیا کہ ہم خدائے واحد کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں اور ماہِ رمضان کے روزے رکھیں......

ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے ان تمام احکامات و ہدایات کی پیروی کی جن کو وہ خدا کے یہاں سے لایا تھا۔ اُس نے جن چیزوں کو ہمارے لیے حلال کیا، ہم نے ان کو حلال جانا اور جن چیزوں کو ہمارے اُوپر حرام قرار دیا، ہم نے ان کو حرام مان لیا۔

اے بادشاہ! یہی ہمارے وہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے ہماری قوم ہماری مخالف ہوگئی۔ وہ ہمارے اُوپر ٹوٹ پڑی۔ اس نے ہم کو سخت ترین عذاب سے دوچار کیا تاکہ وہ ہم کو ہمارے دین سے پھیر کر دوبارہ بُت پرستی میں مبتلا کردے۔ جب انھوں نے ہمارے اوپر ظلم و ستم کی حد کردی، ہمارے اُوپر عرصۂ حیات تنگ کردیا، ہم کو مغلوب کرلیا اور ہم کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روک دیا اور پانی ہمارے سر سے اُونچا ہوگیا تو ہم اپنا وطن چھوڑ کر آپ کے ملک میں چلے آئے۔ ہم نے دوسروں پر آپ کو ترجیح دی اور آپ کی ہم سائیگی کو پسند کیا کیوں کہ ہم کو

اس بات کی پوری اُمید تھی کہ آپ کے یہاں ہمارے اوپر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں۔

اس موقع پر نجاشی نے جعفر بن ابی طالبؓ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت کیا کہ تمہارے نبیؐ اللہ کی طرف سے جو پیغام لائے ہیں، کیا اس میں سے کچھ تمہارے پاس ہے؟

انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"اس کو مجھے سناؤ۔" نجاشی نے کہا۔

چنانچہ جعفر نے پڑھنا شروع کیا۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاۗءً خَفِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَاۗىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم ۱-۴)	"یہ ذکر ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی، جب کہ اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اُس نے عرض کیا اے پروردگار! میری ہڈیاں تک گھل گئی ہیں اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اُٹھا ہے ....."

یہاں تک کہ انھوں نے سورہ کا ابتدائی حصہ مکمل کرلیا۔

حضرت ام سلمہؓ سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں۔

"کلامِ الٰہی کو سن کر نجاشی اتنا متاثر ہوا کہ زار و قطار رونے لگا، یہاں تک کہ روتے روتے اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اس کے ساتھ اس کے درباری بھی رو رہے تھے۔ وہ بھی اتنا روئے کہ ان کی کتابیں اشکوں سے بھیگ گئیں۔ اس کے بعد نجاشی نے ہم سے کہا کہ یہ کلام

جو تمہارے نبی پر اترا ہے اور وہ کلام جو عیسٰی لائے تھے، دونوں ایک ہی نور کی شعاعیں ہیں۔

پھر اس نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

"تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ خدا کی قسم میں انھیں کبھی تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔"

حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں۔

"جب ہم لوگ نجاشی کے دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے ہم لوگوں کو دھمکی دیتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"خدا کی قسم میں کل پھر بادشاہ کے پاس آؤں گا اور اس کو ان لوگوں کے متعلق ایک ایسی بات بتاؤں گا۔ جو اس کے سینے کو ان کے خلاف غیظ و غضب اور اس کے دل کو نفرت و کراہت سے بھر دے گی۔ میں اُس کو اس بات پر آمادہ کر کے چھوڑوں گا کہ وہ مکمل طور پر ان کا استیصال کر دے اور ان کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔"

اس پر عبداللہ بن ربیعہ نے کہا۔

"عمرو! خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ یہ سب اگرچہ ہمارے مخالف ہیں مگر ہیں تو ہمارے قریبی عزیز ہی۔"

مگر عمرو بن عاص نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو اس بات کو ..... میں بادشاہ کو ایسی بات بتاؤں گا جس کی وجہ سے ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جائے گی ..... خدا کی قسم میں اس سے کہوں گا کہ عیسٰی بن مریمؑ کے متعلق ان لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خدا کے بیٹے نہیں اس کے بندے ہیں۔"

اور اگلے روز عمرو بن عاص نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر کہا۔
"عالی جاہ! یہ لوگ جن کو آپ نے اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے اور جن کو آپ نے اپنی حمایت کا سایہ فراہم کیا ہے یہ لوگ عیسٰی بن مریمؑ کے متعلق بہت سخت اور نہایت ناپسندیدہ بات کہتے ہیں۔ آپ انھیں بُلوائیے اور اس بات پر باز پُرس کیجیے۔ جو وہ عیسٰی ابن مریمؑ کے بارے میں کہتے ہیں۔"

حضرت ام سلمہؓ کا سلسلۂ بیان آگے بڑھتا ہے۔
"ہم لوگوں کو اس کا پتہ چلا تو ہمیں اس کی بڑی فکر ہوئی اور ہم لوگ غم سے نڈھال ہو گئے۔ پھر ہم نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے باہم مشورہ کی ایک مجلس منعقد کی کہ اگر بادشاہ نے عیسٰیؑ ابن مریم کے بارے میں پوچھا تو ہمیں کیا جواب دینا چاہیئے۔ آخرکار یہ بات طے ہوئی کہ ہم اُن کے متعلق وہی بات کہیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتائی ہے۔ اس معاملے میں ہم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم سے سرِ مُو انحراف نہیں کریں گے، چاہے اس کے نتیجے میں ہمارا جو بھی حشر ہو۔ ہم نے یہ بات بھی متفقہ طور پر طے کی کہ بادشاہ کے سامنے اس دفعہ بھی جعفرؓ بن ابی طالب ہی ہماری نمائندگی کریں گے۔

پھر جب بادشاہ کے طلب کرنے پر ہم اس کے دربار میں پہنچے تو دیکھا کہ اس کے درباری آج بھی حسبِ معمول اور حسبِ مراتب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی کو بھی بادشاہ کے پاس موجود پایا۔ جب ہم بادشاہ کے سامنے پہنچ گئے تو اس نے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ عیسٰی ابنِ مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"
"اُن کے بارے میں ہم وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبیؐ نے ہم کو بتائی ہے۔" جعفر نے جواب دیا۔
"وہ اُن کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" نجاشی نے پوچھا۔
"وہ کہتے ہیں۔" جعفر نے کہا "کہ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسُول، اس کی رُوح اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے کنواری مریم بتول کی طرف القا کیا تھا۔"
جعفر کی یہ بات سُن کر نجاشی نے اپنے ہاتھ کو زمین پر مارتے ہوئے کہا۔
"خدا کی قسم، عیسٰی ابن مریم کے بارے میں تمہارے نبیؐ نے جو بات بتائی ہے، اُن کی حیثیت ایک بال کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔"
نجاشی کے مُنہ سے یہ باتیں سُن کر اس کے پاس بیٹھے ہوئے درباری غصّے سے پیچ وتاب کھانے اور پھنکاریں مارنے لگے۔ اُن کی یہ حالت دیکھ کر نجاشی نے پھر کہا۔
"چاہے تم لاکھ پھنکاریں مارو مگر حقیقت یہی ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں۔"
پھر اس نے ہماری طرف ملتفت ہوتے ہوئے کہا۔
"جاؤ، تم لوگ بے خوف وخطر اور اطمینان کے ساتھ رہو۔ جو شخص بھی تم کو گالی دے گا یا بُرا بھلا کہے گا، اس کو تاوان ادا کرنا پڑے گا اور جو تم سے کسی قسم کا تعرض کرے گا، اسے سزا بھگتنی پڑے گی۔ خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ تم میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی جائے اور اس کے عوض مجھے سونے کا پہاڑ مل جائے۔"
پھر اس نے عمرو بن عاص اور اُس کے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

"ان کے ہدیے انھیں واپس لوٹا دو۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔"

حضرت ام سلمہؓ اپنی سرگزشت کا آخری ورق پلٹتی ہیں۔

"اس کے بعد عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ وہاں سے خائب و خاسر واپس لوٹ گئے اور ہم لوگ عزت اور آرام کے ساتھ نجاشی کے یہاں رہنے لگے۔"

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نہایت امن و اطمینان کے ساتھ نجاشی کے یہاں دس سال گزارنے کے بعد سن سات ہجری میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ حبشہ چھوڑ کر یثرب کا رخ کیا۔ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی فتح سے فارغ ہو کر مدینہ واپس پہنچے ہی تھے کہ مہاجرین حبشہ کا یہ قافلہ بھی حضرت جعفرؓ کی قیادت میں وہاں پہنچ گیا۔ آپؐ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنی خوشی کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا۔

"مَاأَدْرِي بِأَيِّهِمَا أَنَا أَشَدُّ فرحًا أَبِفَتْحِ خَيْبَرَ أَمْ بِقُدُومِ جَعْفَرَ۔"	"مجھے نہیں معلوم کہ دونوں میں کس بات کی مجھے زیادہ خوشی ہے، آیا خیبر کی فتح کی یا جعفر کی آمد کی؟"

اور ان کی واپسی پر مسلمانوں، خصوصاً ان میں سے فقراء و مساکین کی خوشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ کیوں کہ وہ کمزوروں، ضعیفوں اور حاجت مندوں کے ساتھ نہایت مہربانی اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ اور اسی وجہ سے لوگ ان کو "ابوالمساکین" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔

"ہم مساکین کے حق میں جعفرؓ بن ابی طالب سب سے اچھے تھے۔ وہ ہمیں اپنے گھر لے جاتے اور جو کچھ بھی ان کے پاس ہوتا، ہم کو کھلاتے۔ یہاں تک کہ اگر کھانے کی چیز ختم ہو جاتی تو وہ گھی رکھنے کا خالی شدہ مشکیزہ لاکر ہمارے آگے رکھ دیتے جس کو پھاڑ کر ہم گھی کی وہ معمولی مقدار بھی جو اس کی اندرونی دیوار کے ساتھ لپٹی ہوتی ــــ چاٹ لیا کرتے تھے۔"

مدینۂ منورہ میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کا زمانۂ قیام بہت مختصر رہا۔ کیوں کہ ۸ھ کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلادِ شام میں رومیوں کے ساتھ معرکہ آرائی کے لیے ایک فوج تیار کی اور اس فوج کی قیادت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا۔

"اگر زیدؓ بن حارثہ قتل یا زخمی ہو جائیں تو فوج کی امارت جعفرؓ بن ابی طالب کے ذمے ہو گی۔ اگر جعفر بھی شہید یا مجروح ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہؓ امیر ہوں گے۔ لیکن اگر عبداللہ بن رواحہؓ بھی جنگ میں کام آجائیں یا وہ گھائل ہو جائیں تو مسلمان خود اپنے میں سے کسی کو اپنا سپہ سالار بنالیں۔"

جب مسلمان "موتہ" پہنچے جو اردن میں شام کے بالائی حصے میں واقع ہے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے مقابلے کے لیے ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل زبردست رومی فوج تیار کھڑی ہے۔ اور اس کی مدد کے لیے نصرانی عربوں نے مزید ایک لاکھ کی بھاری جمعیت فراہم کر رکھی ہے جس میں لخم، جذام اور قضاعہ وغیرہ عیسائی قبائل کے جنگ جو شامل ہیں۔ اس دو لاکھ کے عظیم لشکر کا مقابلہ کرنے والی مسلمانوں کی فوج صرف تین ہزار

مجاہدین پر مشتمل تھی۔

آخر کار جب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور جنگ کی چکی اپنی پوری رفتار سے چلنے لگی تو حضرت زید بن حارثہ رضؓ بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کے گرتے ہی حضرت جعفر ابن ابی طالب رضؓ اپنی گھوڑی (شقراء) سے کود پڑے۔ پھر انھوں نے تلوار سے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں تاکہ ان کے بعد دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں اور جھنڈا لے کر یہ رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں دُور تک گھُستے چلے گئے۔

"اہا، کتنی عمدہ ہے جنّت، کتنا خوش آیند ہے اس کا قرب اور کیسا ٹھنڈا ہے اس کا پانی۔ رُومیوں کا عذاب قریب آگیا ہے۔ یہ سب کافر اور بعید النسب ہیں۔ جب ان سے مُڈبھیڑ ہوگئی ہے تو لازم ہے کہ میں ان کے اوپر کاری ضرب لگاؤں۔"

وہ دشمن کی صفوں میں ہر طرف چکر لگاتے اور اپنی شمشیر خارا شگاف کے جوہر دکھاتے پھر رہے تھے کہ دشمن کی ایک کاری ضرب نے ان کے دائیں ہاتھ کو کاٹ کر الگ کر دیا۔ انھوں نے جھنڈے کو بائیں ہاتھ میں تھام لیا مگر دشمن نے تلوار کا دوسرا وار کیا اور ان کا بایاں ہاتھ بھی کٹ کر جُدا ہو گیا اب انھوں نے جھنڈے کو اپنے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے سے چمٹا لیا مگر جلد ہی تیسری ضرب نے ان کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اب جھنڈا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضؓ کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بھی برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے۔

جب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے تینوں سالاروں کے

قتل کی خبر پہنچی تو آپ رنج اور صدمے سے نڈھال ہو گئے اور تعزیت کے لیے اپنے ابنِ عم حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ ان کی زوجۂ محترمہ حضرت اسمارؓ بنت عمیس ان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ وہ روٹی کے لیے آٹا گوندھ کر رکھ چکی تھیں اور بچّوں کو نہلا دُھلا کر، تیل وغیرہ لگا کر، صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تیار کر چکی تھیں۔

حضرت اسمارؓ کہتی ہیں۔

"جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے یہاں تشریف لائے تو میں نے حزن و ملال کے وہ سائے آپؐ کے چہرۂ انور پر پھیلے ہوئے دیکھ لیے تھے جو آپؐ کے اندرونی کرب کی غمازی کر رہے تھے۔ آپؐ کو اس طرح رنجیدہ دیکھ کر میرے دل میں مختلف اندیشے اور وسوسے سر اُٹھا رہے تھے مگر اس وقت میں جعفرؓ کے متعلق آپؐ سے کوئی سوال اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی کہ مبادا مجھے آپ کی زبانِ مبارک سے کوئی ناپسندیدہ بات سُننی پڑ جائے۔ آپؐ نے سلام کے بعد مجھ سے فرمایا کہ جعفرؓ کے بچّوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں نے انھیں آواز دی تو وہ خوشی سے چہکتے ہوئے آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ آپؐ کے پاس پہنچنے کے لیے ایک دُوسرے کو دھکا رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ سب سے پہلے آپؐ کے پاس پہنچ جائے۔ آپؐ نے ان کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا، ان کے اُوپر جھک گئے اور انہیں چُومنے لگے۔ اس وقت آپؐ کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو جاری تھے۔ جب میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ آپؐ کیوں رو رہے ہیں۔ کیا آپؐ کے پاس جعفرؓ اور

ان کے دونوں ساتھیوں کے متعلق کوئی ناخوشگوار اطلاع آئی ہے ؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ ہاں، آج وہ سب شہید ہوگئے۔"

اس وقت جب چھوٹے بچوں نے اپنی ماں کو روتے دیکھا تو ان کے معصوم چہروں سے تبسّم کی کرنیں غائب ہوگئیں اور وہ سب اپنی جگہ پر اس طرح بے حس و حرکت اور ساکت و جامد ہوگئے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں ۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آنسو پوچھتے اور یہ کہتے ہوئے واپس گئے۔

"اَللّٰھُمَّ اخْلُفْ جَعْفَراً فِی وَلَدِہٖ، اے اللہ جعفر کے پیچھے اس کے بچوں
اَللّٰھُمَّ اخْلُفْ ......" کی کفالت فرما۔

پھر فرمایا کہ میں نے جعفر کو جنت میں اس حال میں دیکھا ہے کہ ان کے دو بازو ہیں جو خون سے رنگین ہیں۔

حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ

دو شخصوں کے درمیان شاید ہی کبھی ایسے گہرے اور مضبوط تعلقات قائم ہوئے ہوں گے، جیسے حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوسفیان بن حارثؓ کے درمیان تھے۔

ابوسفیان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر اور اُن کے ہم جولی تھے، دونوں ایک زمانے میں پیدا ہوئے، اور ایک ہی خاندان میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی عم زاد تھے۔ ان کے والد حارث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ ایک ہی صلب، صلبِ عبدالمطلب سے تھے۔ مزید برآں یہ کہ وہ آپؐ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ سیدہ حلیمہ سعدیہؓ نے ان دونوں کو ایک ہی وقت میں دُودھ پلایا تھا۔ ان تعلقات کے علاوہ وہ نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت گہرے دوست تھے اور جسمانی طور پر آپؐ سے غیر معمولی مشابہت رکھتے تھے۔

انھیں تمام وجوہ و اسباب کی بنا پر ابوسفیان کی ذات سے اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے میں پہل کریں گے، اور آپؐ کی پیروی میں سب پر سبقت لے جائیں گے۔ لیکن اس کے توقع کے علی الرغم معاملہ بالکل برعکس سامنے آیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے ہی کارِ دعوت کا آغاز فرمایا، اور

اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانا شروع کیا، اچانک ابوسفیان کے سینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی اور ان کی دوستی دشمنی میں، صلہ رحمی قطع رحمی میں اور بھائی چارگی نفرت و اعراض میں بدل گئی۔

ابوسفیان بن حارث کا شمار اس وقت قریش کے مشہور شہسواروں اور اس کے اونچے درجے کے شعراء میں ہوتا تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور ان کی دعوت کی مزاحمت میں اپنی تلوار اور زبان دونوں کا بھرپور استعمال کیا۔ اور اسلام کو نقصان پہنچانے اور مسلمانوں کی اذیت رسانی اور انھیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔

قریش نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان سب جنگوں کی آگ بھڑکانے والے یہی ابوسفیان تھے۔ اور مسلمانوں کو جتنی بھی اذیتیں اور تکلیفیں جھیلنی پڑیں ان سب میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔ اس شخص نے اپنی شاعری کے شیطان کو بیدار کیا اور اپنی زبان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں بے لگام چھوڑ دیا۔ اور آپؐ کی شانِ مبارک میں انتہائی دریدہ دہنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت گھٹیا، فحش اور دل آزار قسم کے اشعار کہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی دشمنی کا زمانہ بیس سال کی طویل مدت تک پھیلتا چلا گیا۔ اس دوران میں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں، ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے تمام مکروہ حربے استعمال کر ڈالے اور انھیں صفحۂ ہستی

سے نیست ونابود کرنے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔
ابوسفیان بن حارث فتح مکہ سے کچھ دنوں پہلے نعمتِ ایمان سے سرفراز ہوئے۔ ان کے دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی تفصیلات کتب سیرت میں محفوظ ہیں، اور تاریخ کے صفحات نے انھیں ہم تک منتقل کیا ہے۔ وہ تفصیلات انھیں کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہیں۔

"اسلام کا معاملہ جب پورے طور پر مستحکم ہوگیا، اسے بڑی حد تک قرار وثبات حاصل ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ آپؐ مکہ کو فتح کرنے کے لیے تشریف لارہے ہیں تو زمین اپنی وسعت وکشادگی کے باوجود میرے لیے تنگ ہوگئی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اب میں کہاں جاؤں، کس کی صحبت اختیار کروں اور کس کے ساتھ رہوں؟ پھر میں اپنے اہل وعیال کے پاس آیا اور ان سے کہا۔

"تم لوگ مکہ سے نکل چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیوں کہ محمدؐ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اور اگر مسلمانوں نے مجھے پکڑ لیا تو یقیناً میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

"کیا آپ کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ تقریباً پورا عرب محمدؐ کے آگے سرفگندہ، ان کے دائرہ اطاعت میں داخل اور ان کے دین کا حلقہ بگوش ہو چکا ہے، اور آپ ابھی تک ان کی عداوت پر مُصر ہیں۔ حالانکہ آپ ان کی نصرت وتائید کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔"
انھوں نے کہا۔ اور برابر مجھے محمدؐ کے دین کی طرف مائل کرتے، اور مسلسل مجھے اس کی طرف رغبت دلاتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو قبول اسلام کے لیے کھول دیا۔ میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور اٹھ کر اپنے غلام "مذکور" سے کہا۔

"ہماری سواریاں سفر کے لیے تیار کر دو۔"
پھر اپنے بیٹے جعفر کو ساتھ لیا۔ اور ہم دونوں تیز رفتاری کے ساتھ "ابوار"[1] کی طرف چل پڑے —— ہمیں خبر ملی تھی کہ محمدؐ وہیں فروکش ہیں ——
جب مقام ابوار کے قریب پہنچا تو میں نے اپنا حلیہ تبدیل کر لیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے ہی کوئی مجھے پہچان کر قتل کر دے۔ میں ایک میل تک پیدل چلتا رہا۔ مسلمانوں کے دستے یکے بعد دیگرے مکہ کی سمت بڑھتے رہے اور میں ان کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اصحاب محمدؐ میں سے کوئی مجھے دیکھ کر پہچان نہ لے۔
میں اسی حالت میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستے کے ساتھ نمودار ہوئے۔ میں نے آپؐ کی طرف رخ کیا اور جا کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپؐ نے مجھے نظر بھر کر دیکھا اور مجھے پہچانتے ہی اپنا چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں گھوم کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ آپؐ نے پھر مجھ سے اعراض کیا اور میری طرف سے رخ پھیر لیا، میں پھر سامنے آ گیا۔ جب میں آپ کے سامنے آتا آپؐ اپنا رخ دوسری طرف کر لیتے۔
جب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے ارادے سے چلا تھا تو اس وقت مجھے اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبولِ اسلام سے خوش ہوں گے۔ اور آپؐ کی خوشی آپؐ کے اصحابؓ کے لیے باعثِ فرحت و انبساط ہو گی۔ لیکن

---

[1] مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔

جب مسلمانوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعراض کو دیکھا تو ان کے چہروں پر بھی نفرت و بے زاری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ ان کی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور میں نے اُن کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت و حقارت کے شعلے رقص کرتے دیکھے۔

میں ابوبکرؓ سے ملا تو انھوں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ میں نے عمر بن خطابؓ کو ایسی تسلی طلب نظر سے دیکھا جو ان کے دل میں نرمی اور ہمدردی کے جذبات بیدار کر دے۔ مگر ان کی نگاہوں میں بھی میرے لیے غصہ، نفرت اور غیظ و غضب کے سوا کچھ نہ تھا۔ بلکہ انھوں نے تو یہاں تک کیا کہ ایک انصاری کو میرے خلاف اُکسا دیا۔ اور اس نے مجھ سے کہا کہ " دشمن خدا! تو ہی وہ شخص ہے جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں حد سے متجاوز ہو گیا تھا؟" وہ انصاری برابر مجھے لعنت ملامت کرتا اور مسلسل میرے اُوپر چیختا چلاتا رہا۔ دوسرے مسلمان بھی مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھتے اور میری پریشانی سے خوش ہو رہے تھے۔

اس وقت اچانک میری نظر اپنے چچا حضرت عباسؓ پر پڑی۔ میں ان کے پاس پہنچا اور بولا۔ "چچا جان! خاندان میں اپنے مقام و مرتبہ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے قریبی رشتے کی بنا پر میں سمجھتا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے قبولِ اسلام سے خوش ہوں گے لیکن ان کا جو رویّہ سامنے آیا ہے، آپ جانتے ہیں۔ تو اب آپ میرے متعلق ان سے بات کر کے انھیں مجھ سے راضی کر دیجیے۔"

مگر انھوں نے کہا کہ

"نہیں! خدا کی قسم میں تمہارے ساتھ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے اعراض کو دیکھ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارے متعلق میں ان سے کوئی بات نہیں کرسکتا۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا ہوں۔ البتہ آئندہ موقع ومحل کی مناسبت سے کوئی بات کرسکتا ہوں۔"

میں نے کہا۔

"چچا جان! تو اس وقت آپ مجھے کس کے حوالے کر رہے ہیں؟"

اُنھوں نے جواب دیا۔

"جو کچھ تم مجھ سے سُن چکے ہو، اس کے علاوہ میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔"

اُن کا یہ جواب سُن کر میرے اُوپر شدید حزن وملال کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اپنے عم زاد علی بن ابی طالبؓ کو دیکھا۔ اور ان سے اپنے اس معاملے میں بات کی مگر انھوں نے بھی وہی کہا جو چچا عباسؓ نے کہا تھا۔ تب میں پھر چچا عباسؓ کے پاس واپس آیا اور اُن سے کہا۔

"چچا جان! اگر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کر کے میرے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتے تو کم از کم مجھے اس شخص سے بچا لیجئے جو برابر مجھے بُرا بھلا کہہ رہا ہے اور دُوسروں کو بھی اس پر اکسا رہا ہے۔"

"کون ہے وہ؟ ذرا اس کا حُلیہ تو بیان کرو۔" انھوں نے پُوچھا۔

جب میں نے اس کا حلیہ بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ نعیمان بن حارث نجاری ہیں۔" پھر ایک شخص کو بھیج کر انھیں بُلوایا اور ان سے کہا۔

"نعمان! ابو سفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عم زاد اور میرا بھتیجہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ آج اس سے خفا ہیں لیکن عنقریب آپؐ اس سے راضی ہو جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم اس کو ستانے سے باز آجاؤ۔" اور برابر ان سے اصرار کرتے رہے حتیٰ کہ وہ اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ سب و شتم سے باز آجائیں گے اور کہا کہ اب میں ان سے کوئی تعرض نہیں کروں گا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جحفہ[1] میں نزول فرمایا تو میں آپؐ کی قیام گاہ کے دروازے پر جا بیٹھا، اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیا۔ خیمے سے نکلتے ہوئے جب آپؐ کی نگاہیں میرے اوپر پڑیں تو آپؐ نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔ لیکن پھر بھی میں آپؐ کی رضامندی سے نا اُمید نہیں ہوا۔ میں نے اپنا معمول بنا لیا کہ جب بھی کسی منزل پر آپؐ کا قیام ہوتا، میں آپؐ کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا اور اپنے لڑکے جعفر کو اپنے پاس کھڑا کر لیتا۔ لیکن آپؐ جب بھی مجھے دیکھتے مُنہ پھیر لیتے۔

میں کافی دنوں تک اس صبر آزما صورت حال سے دوچار رہا، آخر کار جب یہ پریشانی میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تو ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"خدا کی قسم اب میرے سامنے دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں۔ یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں، ورنہ میں اپنے اس

---

[1] مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مقام جو مکّہ سے چار منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔

لڑکے کو ساتھ لے کر نکل جاؤں گا اور زمین میں حیران و سرگرداں پھرتا رہوں گا حتیٰ کہ ہم دونوں بھوک پیاس سے مرجائیں۔ جب یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو وہ کچھ نرم پڑے اور ان کے دل میں میرے لیے ہمدردی اور رحمت وشفقت کے جذبات بیدار ہوگئے۔ اور جب خیمہ سے باہر تشریف لائے تو پہلی بار میری طرف محبت آمیز نظر سے دیکھا اور میں نہال ہوگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ لبِ مبارک کی بند کلی اب کھل اٹھے گی۔

پھر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں داخل ہوئے، میں بھی آپؐ کا ہم رکاب تھا۔ آپؐ مسجد حرام کی طرف روانہ ہوئے میں دوڑتا ہوا آپؐ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ غرضیکہ میں کسی حال میں بھی آپؐ سے جدا نہ ہوتا۔

حنین کی وادی میں بنو ہوازن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے زبردست جمعیت اکٹھا کی اور غیر معمولی تیاریوں اور بے پناہ جوش کے ساتھ آپ کے مدِمقابل ہوئے۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے صحابہؓ کا لشکر لے کر روانہ ہوئے تو میں بھی آپؐ کے ساتھ شامل ہوگیا۔ اور جب میں نے مشرکین کے اس زبردست اجتماع کو دیکھا تو اپنے دل میں کہا۔

"خُدا کی قسم آج میں ان تمام محرومیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کردوں گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے نتیجے میں مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔ آج میں ایسی جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کروں گا جو میرے تمام پچھلے گناہوں

کا کفارہ بن جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو جائیں گے"۔

جب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور مشرکین کا دباؤ مسلمانوں پر بڑھنے لگا تو ان کے اندر کمزوری اور بزدلی کو راہ مل گئی۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد سے منتشر ہو گئے اور راہِ فرار اختیار کر لی اور قریب تھا کہ ہم ہزیمت سے دوچار ہو جائیں۔

اس کٹھن گھڑی میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلیری و شجاعت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آپ میدان جنگ کے بیچوں بیچ اپنے خچر "شہبا" پر مضبوط چٹان کی طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ اور ایک بپھرے ہوئے شیر کی مانند شمشیر بکف اپنی اور اپنے آس پاس کے لوگوں کی طرف سے مدافعت کر رہے تھے۔ اس وقت میں اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اپنی تلوار کی نیام توڑ کر پھینک دی ۔۔۔ خدا جانتا ہے کہ اس وقت میرا ارادہ یہی تھا کہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں لڑتا ہوا آپؐ کے سامنے ہی شہید ہو جاؤں ۔۔۔ میرے چچا حضرت عباسؓ آپؐ کے خچر کی لگام تھامے ایک جانب کھڑے تھے۔ میں نے دوسری سمت اپنی جگہ سنبھالی۔ میرا دایاں ہاتھ تلوار کے قبضے پر تھا۔ اور بائیں ہاتھ سے حضورؐ کی رکاب تھامے دشمنوں کو آپؐ سے دُور ہٹا رہا تھا۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس طرح بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تو بڑے تحسین آمیز انداز میں چچا عباسؓ سے پوچھا

"یہ کون ہے جو اس طرح دادِ شجاعت دے رہا ہے؟"

"یہ آپؐ کا بھائی، آپ کا عم زاد ابوسفیان بن حارث ہے۔ اے اللہ

کے رسول! آپ اس سے راضی ہو جائیں۔" چچا نے جواب دیا۔
"میں اس سے راضی ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس کی اس ساری عداوت کو معاف فرمائے جو اس نے اب تک میرے ساتھ کی ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے راضی ہو گئے۔ اس سے مجھے بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اور میرا دل خوشی کے مارے بلّیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے رکاب ہی میں آپ کے قدم مبارک کو بوسہ دیا۔ پھر آپ نے میری طرف ملتفت ہوتے ہوئے فرمایا۔

"میرے بھائی! آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔"

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اپنے لیے یہ کلمات سُن کر میرے اندر شجاعت و دلیری کے شعلے بھڑک اُٹھے اور میں نے مشرکین پر ایسا زوردار حملہ کیا کہ ان کے قدم ڈگمگا گئے اور وہ اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ اس حملے میں بہت سے مسلمان بھی میرے ساتھ شریک ہو گئے۔ ہم ان کو تقریباً تین میل تک کھدیڑتے چلے گئے۔ اور وہ مختلف اطراف میں بھاگ نکلے۔"

حضرت ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ کو غزوۂ حنین کے موقع پر نبی کریم کی رضامندی کی نعمت حاصل ہو گئی اور وہ آپ کی صحبت کی سعادت سے بھی سرفراز ہو گئے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے سابقہ رویّے کی وجہ سے ان کو ایسی شرمندگی و پشیمانی دامن گیر ہوئی کہ وہ زندگی بھر آپ کے چہرے کی طرف کبھی نظر نہ اُٹھا سکے، نہ کبھی آپ سے آنکھیں چار کر سکے۔
حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کے اُن تاریک ایام پر بے حد ندامت و خجالت محسوس کرتے جو دورِ جاہلیت کی نذر ہو گئے، جن میں نورِ خداوندی اور کتابِ الٰہی

سے محروم رہے۔ لیکن اب وہ شب و روز قرآنِ کریم پر جھکے رہتے، اس کی آیات کی تلاوت اور اس کے احکام پر غور و فکر میں مشغول رہتے اور اس کی نصیحتوں سے بھرپور استفادہ کی کوشش کرتے۔

انھوں نے دُنیا اور اس کے عیش و آرام سے یکسر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے تمام اعضاء و جوارح کے ساتھ خدائے تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مسجد میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا۔

" عائشہؓ ! جانتی ہو یہ کون ہے ؟"

حضرت عائشہؓ نے کہا۔

" نہیں اے اللہ کے رسولؐ ! "

" یہ میرے عم زاد ابوسفیان بن حارثؓ ہیں۔ دیکھو ! یہ سب سے پہلے مسجد میں آتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں اس سے نکلتے ہیں۔ اور جب تک اس میں رہتے ہیں، نماز میں مشغول رہتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا۔

اور جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وہ اپنے رب سے جا ملے تو حضرت ابوسفیانؓ شدید صدمہ اور رنج و الم سے دوچار ہوئے، ایسے صدمے سے جو کسی ماں کو اپنے اکلوتے فرزند کی وفات پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ آپؐ کی جدائی کے غم میں اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جس طرح کوئی شخص اپنے محبوب کی جُدائی پر بھی نہیں روتا۔ اور آپؐ کی یاد میں ایسا شاہکار اور درد انگیز مرثیہ کہا جو ان کے سوزِ محبت، دردِ عشق اور اندرونی کرب و اَلم کا آئینہ دار ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں انھیں اس بات کا احساس ہوا

کہ اب ان کی موت کا وقت قریب آگیا ہے تو انھوں نے اپنے ہاتھوں اپنے لیے قبر کھودی۔ اور اس پر ابھی تین دن بھی نہیں گزرے تھے کہ ان کا آخری وقت آپہنچا، جیسے موت کے ساتھ ان کا کوئی عہد و پیمان ہو۔ اس وقت انھوں نے اپنے گھر والوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

خبردار! میری موت پر آنسو نہ بہانا۔ خدا گواہ ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے . . . . . پھر ان کی پاکیزہ روح اس دارفانی کو چھوڑ کر اپنی ابدی آرام گاہ کی طرف پرواز کر گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی نمازِ جنازہ حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ نے پڑھائی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ اور تمام صحابۂ کرامؓ غم سے نڈھال ہو گئے۔ اور ان کی وفات کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک زبردست حادثہ شمار کیا گیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہٗ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ
حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ
وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ
لِي وَلِوَالِدَيْكَ، إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَ
إِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ
بِي شَيْئاً مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ
فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي
الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ
مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ
مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُونَ ۝

(لقمان ۱۴، ۱۵)

میں شیطانِ رجیم سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ میں نے اس کو نصیحت کی کہ میرا شکر ادا کر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے۔ لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کر جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے، اس وقت میں تمہیں بتا

دوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے "

اِن آیات کریمہ کے پسِ منظر میں ایک بڑی انوکھی اور حیرت انگیز کہانی ہے جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک کم سِن نوجوان مختلف اور باہم متضاد جذبات و میلانات کی اندرونی کش مکش میں بتلا ہے۔ اور آخرکار یہ کش مکش شر پہ خیر کی فتح اور کفر پر ایمان کی کامیابی پر منتج ہوتی ہے۔ اس کہانی کا ہیرو ایک نجیب الطرفین نوجوان ہے جو اپنی نسبی شرافت اور خاندانی عظمت کے لحاظ سے اپنے ہم چشموں میں بلند ترین مقام کا حامل نظر آتا ہے۔ اور وہ نوجوان ہیں حضرت سعد بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ وارضاہ۔

اُس وقت، جب نورِ نبوت نے مکّہ کے در و بام اور اس کے گلی کوچوں کو روشنی کا لباس پہنا دیا تھا ــــ سعد بن ابی وقاص ابھی ایک کم سِن نوجوان تھے، شباب سے بھرپور اور ناز و نعمت کے پروردہ۔ وہ بڑے رقیق اور نازک احساسات کے مالک، والدین کے انتہائی فرماں بردار اور اپنی والدہ سے غیر معمولی محبت رکھنے والے تھے۔

باوجود اس کے کہ سعد بن ابی وقاص اس وقت ابھی اپنی عمر کی سترہویں بہار کا استقبال کر رہے تھے ـــــ اپنے وجود میں پختہ عمر والوں کی سی بُرد باری و دانش مندی اور بوڑھوں جیسی دانائی و دُور اندیشی سمیٹے ہوئے تھے۔ ان کو ان بچکانہ کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں تھی جن میں اُن کے ہم سِن نوجوان غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کرتے اور بڑے شوق سے حصّہ لیتے تھے۔ اس کے برعکس وہ اپنی کوششیں صرف تیروں کی تیاری، کمانوں کی درستی اور تیر اندازی کی مشق میں صرف کیا کرتے تھے۔ ان کی ان مصروفیات اور ان میں غیر معمولی انہماک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ شاید وہ خود کو مستقبل

میں کسی عظیم الشان کارنامے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ نیز وہ اپنی قوم کی اس بدعقیدگی اور زبوں حالی پر انتہائی بے چینی اور بے اطمینانی محسوس کر رہے تھے، جس میں وہ مبتلا تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہ کسی مضبوط، دُور اندیش اور مہربان ہاتھ کے منتظر ہیں جو غیب سے برآمد ہو کر لوگوں کو اُن تاریکیوں سے نکال دے جن کے اندر وہ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

ان حالات میں اللہ عز وجل کی مشیئت نے ساری انسانیت کو اس مہربان اور کارساز ہاتھ سے نوازنا چاہا۔ اور وہ ہاتھ تھا سرور کائنات محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہاتھ، جس کی مٹھی میں وہ ستارۂ روشن تھا، وہ کوکبِ درخشاں تھا جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی یعنی کتاب الٰہی، قرآن عظیم۔

سعد بن ابی وقاص رضؓ نے حق اور ہدایت کی اس پکار کے بلند ہوتے ہی کسی تاخیر کے بغیر اس پر لبیک کہی۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے مردوں میں ان کا تیسرا یا چوتھا نمبر تھا۔ بسا اوقات وہ بڑے فخر کے ساتھ یہ بات کہا کرتے تھے کہ "سات روز تک میں اسلام کا تیسرا حصہ تھا۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے پناہ مسرت حاصل ہوئی اس لیے کہ ان کے اندر شرافت و مردانگی کی ایسی علامات پائی جاتی تھیں جو اس بات کا پتہ دے رہی تھیں کہ عنقریب یہ ہلال بدرِ کامل بن کر آسمان شہرت پر جگمگائے گا۔ اور حسب ونسب کے لحاظ سے ان کو معاشرے میں جو بلند مرتبہ حاصل تھا وہ مکہ کے نوجوانوں کو اس بات پر اُبھار رہا تھا کہ وہ بھی ان کے راستے کو اپنائیں اور خود کو ان کے سانچے میں ڈھالیں۔ اور ان ساری

باتوں کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق بنوزہرہ سے تھا اور بنوزہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کا قبیلہ تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ اپنے اس رشتے پر فخر کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چند صحابۂ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ آپ نے سامنے سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو آتے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔

"هٰذَا خَالِي فَلْيُرِنِي امْرُءٌ خَالَهُ" یہ میرے ماموں ہیں۔ ایسا اگر کسی کا ماموں ہو تو مجھے دکھائے۔

لیکن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قبولِ اسلام کا معاملہ اتنی آسانی اور سہولت کے ساتھ نہیں گزر گیا۔ بلکہ اس کی وجہ سے انہیں سخت آزمائش کے دور سے گزرنا پڑا۔ ان کی آزمائش کی سختی کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق قرآن نازل فرمایا۔ ہم یہ بات حضرت سعدؓ ہی پر چھوڑتے ہیں کہ اس انوکھی آزمائش کی تفصیلات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

"میرے قبولِ اسلام سے تین دن پہلے کی بات ہے۔ میں نے ایک رات خواب دیکھا کہ میں تہ بہ تہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہوں۔ اور اس اثناء میں کہ میں ان تاریکیوں سے باہر آنے کے لیے ان کی موجوں میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں، اچانک ایک چاند میرے سامنے نمودار ہوا۔ میں اس کی طرف چل پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چند آدمی میرے آگے آگے اسی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے دیکھا، وہ زید بن حارثہؓ، علی بن ابی طالب اور ابوبکر صدیق تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ آپ لوگ یہاں کب سے ہیں۔

اُنھوں نے کہا، ہم ابھی آئے ہیں۔ جب دن کو مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفیہ طور پر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اُن کے ذریعہ مجھے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لائے۔ میں فوراً ان کی تلاش میں نکل پڑا۔ آپ مجھے جیاد کی گھاٹی میں ملے اور اسی وقت عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ چنانچہ میں مسلمان ہو گیا۔ ان تین آدمیوں کے علاوہ جن کو میں نے خواب میں دیکھا تھا، کوئی اور مجھ سے پہلے اسلام نہیں لایا تھا۔"

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس دل چسپ داستان کے اگلے حصّے سے پردہ اُٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میرے قبولِ اسلام کی خبر سنتے ہی میری ماں سخت ناراض ہوئی ــــ میں ایک اطاعت شعار اور خدمت گزار لڑکا تھا مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی ــــ اُس نے اپنے انتہائی غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سعد! یہ کیسا دین ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ جس نے تم کو تمہارے ماں باپ کے دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔ خدا کی قسم، تم اپنے اس نئے دین کو ترک کر دو، ورنہ میں کھانا پانی چھوڑ کر خود کو ہلاک کر لوں گی۔ اُس وقت تمہارا سینہ شدتِ غم سے شق ہو جائے گا، ندامت و پشیمانی کے مارے اپنے کیے پر کفِ افسوس ملو گے اور لوگ تم کو ہمیشہ اس پر عار دلاتے رہیں گے۔"

میں نے اس سے کہا۔ "ماں! ایسا نہ کرو کیوں کہ میں کبھی بھی قیمت پر اپنے دین کو ترک نہیں کر سکتا۔" لیکن وہ اپنی دھمکی پوری کرنے پر اَڑ گئی۔ اس نے کھانا، پینا سب چھوڑ دیا۔ آخر کئی روز کی مسلسل فاقہ کشی کی وجہ سے اس کا جسم دُبلا ہو گیا، ہڈیاں کمزور ہو گئیں اور اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ میں تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد اس کے پاس جاکر کہتا رہا کہ کچھ کھالو، مگر وہ شدت سے انکار کرتی رہی اور قسم کھا کر کہتی تھی کہ "یا تو تم اپنا دین چھوڑ دو ورنہ میں کھانا پینا چھوڑ کر جان دے دوں گی۔" اس وقت میں نے اس سے کہا۔

"ماں! بے شک میں تیرے ساتھ شدید محبت رکھتا ہوں، لیکن اللہ اور اس کے رسول کی محبت تیری محبت سے زیادہ ہے۔ تو یہ بات اچھی طرح سُن لے۔ خدا کی قسم اگر تیری ہزار جانیں ہوں اور وہ سب ایک ایک کر کے تیرے اندر سے نکل جائیں تب بھی میں اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

جب اس نے میرا یہ اٹل فیصلہ سُنا اور میرے استقلال کو دیکھا اور اس کو یقین ہو گیا کہ میں اپنے دین کو کسی حال میں چھوڑنے والا نہیں ہوں تو آخر کار وہ اپنی ضد سے باز آگئی اور کھانے پینے پر مجبور ہو گئی۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق اپنا یہ قول نازل فرمایا۔

"وَاِنْ جَاهَدَاكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔"

"اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کر جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔"

جس روز حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ نے اسلام قبول کیا، وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے انتہائی خیر و برکت کا دن تھا۔ غزوہ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور ان کے بھائی حضرت عُمیر بن ابی وقاصؓ نے جو موقف اختیار کیا وہ بڑا قابل دید تھا۔

حضرت عُمیرؓ اس وقت ایک کم سِن نوجوان تھے اُن کی عُمر حدِ بلوغت

سے کچھ ہی متجاوز تھی۔ جنگ کے لیے روانگی سے قبل، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان مجاہدین کا جائزہ لے رہے تھے، حضرت عمیرؓ اس ڈر سے آپؐ کی نگاہوں سے چھپنے کی کوشش کے باوجود وہ خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں آنے سے نہیں بچا سکے۔ آپؐ نے ان کو دیکھ لیا اور واپس کر دیا۔ واپسی کا حکم سن کر وہ رونے لگے۔ آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترس کھا کر ان کو جنگ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ اجازت مل گئی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ خوش خوش ان کے پاس گئے اور اپنے ہاتھ سے ان کی کمر میں تلوار باندھی، پھر دونوں بھائی جہاد فی سبیل اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اور جب جنگ ختم ہوئی تو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنے بھائی عمیرؓ کو خونِ شہادت میں لت پت میدانِ بدر میں چھوڑ کر اللہ سے ان کے اجر کی امید لیے تنہا مدینہ واپس لوٹے۔

اور جنگ احد میں — جب مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بکھر گئے، یہاں تک کہ اس وقت آپؐ کے ساتھ صرف چند صحابہ کرامؓ رہ گئے تھے، جن کی تعداد دس سے بھی کم تھی — حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ڈٹ کر اپنی کمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت اور حفاظت کرتے رہے۔ اس وقت ان کی کمان سے نکلا ہوا ہر تیر اپنے صحیح نشانے پر لگتا اور کسی نہ کسی مشرک کے لیے فرشتۂ اجل ثابت ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس شان سے تیر اندازی کرتے دیکھا تو یہ کہہ کر ان کو مزید تیر اندازی پر اکسایا۔

"اِرْمِ سَعْدُ، اِرْمِ، فَدَاكَ أَبِي وَأُمِّي۔"

"تیر چلاؤ سعد! تیر چلاؤ، میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں۔"

لیکن حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اس وقت اپنی عظمت کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ نے ایرانیوں کے خلاف ایک فیصلہ کن جنگ کا ارادہ فرمایا۔ ایسی فیصلہ کن جنگ کا جو ان کی سلطنت کا خاتمہ کردے، جو ان کے تخت کو متزلزل کردے اور ایران کی سرزمین سے بت پرستی کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سارے گورنروں کے نام یہ تحریری حکم بھیجا۔

"ہر اس شخص کو میرے پاس بھیج دو جس کے پاس اسلحہ یا گھوڑا ہو۔ یا اس کے اندر شجاعت، اصابتِ رائے، جنگی مہارت یا شعر وشاعری اور تقریر وخطابت کی کوئی امتیازی خوبی ہو، یا اس کے اندر کوئی ایسا وصف پایا جاتا ہو جس سے جنگ میں کوئی مفید کام لیا جاسکے۔"

خلیفہ کے اس حکم کی تعمیل میں ہر طرف سے مجاہدین کے وفود مدینہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ اس کام کے مکمل ہوجانے کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ارباب حل وعقد سے اس عظیم الشان لشکر کی قیادت کے سلسلے میں مشورے طلب کیے تو سب نے یک زبان ہوکر شیر دغا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا نام لیا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو طلب کرکے فوج کی کمان ان کے ہاتھ میں سونپ دی۔

جب اس لشکر جرار نے مدینہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا تو حضرت عمرؓ اس کو الوداع کہنے اور اس کے قائد کو نصیحت کرنے کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر انھوں نے حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"سعد! اللہ عزوجل کے مقابلے میں یہ چیز تم کو ہرگز کسی قسم کے فریب میں مبتلا نہ کرے کہ تم کو "خال رسول اللہ" اور "صاحب رسول اللہ"

کے معزز القاب سے پکارا جاتا ہے۔ یاد رکھو، اللہ تعالیٰ کبھی بُرائی کو بُرائی کے ذریعے نہیں مٹاتا، بلکہ وہ ہمیشہ بُرائی کو بھلائی سے محو کرتا ہے۔"

"سعد! بے شک اللہ تعالیٰ اور کسی بندے کے درمیان اطاعت و فرماں برداری کے سوا دوسرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور وہ صرف اطاعت ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ ہمیشہ اپنی نگاہیں ان امور پر مرکوز رکھنا جن پر تم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا تھا، اور ان کا حد درجہ اہتمام اور التزام کرنا کہ دراصل وہی اس لائق ہیں کہ ان کا اتباع کیا جائے اور ان کو نافذ کیا جائے۔"

یہ مبارک لشکر اس شان سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا کہ اس میں ننانوے وہ خوش قسمت صحابۂ کرام شریک تھے جن کو حق و باطل کے اولین معرکہ "معرکۂ بدر" میں شرکت کا زریں موقع نصیب ہوا تھا۔ تین سو دس سے کچھ اُوپر وہ محترم ہستیاں تھیں جو بیعت رضوان اور اس کے بعد کے غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہیں۔ تین سو وہ حضرات تھے جو غزوہ فتح مکہ میں نبی کریمؐ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے علاوہ ان لوگوں کی تعداد سات سو تھی جن کو صحابۂ کرامؓ کی اولاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔

حضرت سعد مدینہ سے روانہ ہو کر قادسیہ[1] پہنچے اور اپنی فوج کے ساتھ

---

[1] کوفہ سے ۴۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام جہاں مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان ۱۶ھ میں وہ فیصلہ کن معرکہ پیش آیا تھا جس میں مسلمانوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی، جس کے بعد ایرانی کسی میدان میں مسلمانوں کے سامنے جم نہیں سکے۔

بھمہ زن ہو گئے۔ یوم ہریرہ[1] کے موقع پر مسلمانوں نے ایرانیوں پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا عزم بالجزم کیا۔ چنانچہ انھوں نے دشمن کو ہر طرف گھیرے میں لے لیا اور "لاالہ الا اللہ" اور "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے ہوئے ہر سمت سے ان کی صفوں میں گھس گئے۔ آخر ایک زبردست اور گھمسان کی جنگ کے بعد مسلمان ایرانی سپہ سالار "رستم" کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انھوں نے اس کا سر نیزے پر اٹھا لیا۔ اس کے بعد ایرانی افواج کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب اس طرح مسلط ہو گیا اور ان کی ہمتیں اس طرح پست ہو گئیں کہ ایک مسلمان سپاہی کسی ایرانی کو اشارے سے اپنے پاس بلاتا اور بسا اوقات اسی کی تلوار سے اس کا کام تمام کر دیتا تھا۔

اس جنگ میں بے شمار مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور ایرانی مقتولین کی تعداد کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ صرف دریائے قادسیہ میں ڈوب کر مرنے والوں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو عمرِ طویل اور مالِ کثیر سے نوازا تھا۔ مگر جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنا ایک پرانا اونی جبہ منگوایا اور اپنے ورثاء کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا۔

"مجھے اسی جبّے میں کفنانا کیونکہ اسی کو پہن کر میں نے جنگِ بدر میں مشرکین کا سامنا کیا تھا اور چاہتا ہوں کہ اسی کو پہن کر اللہ عزوجل کے سامنے جاؤں۔"

---

[1] جنگ قادسیہ کا تیسرا اور آخری معرکہ جس میں شدتِ قتال کی وجہ سے تلواروں کی جھنکار، تیروں کی سنسناہٹ اور گھوڑوں کی ہنہناہٹ کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔

رازدانِ رسولؐ حضرت حذیفہؓ بن الیمان رضی اللہ عنہ

"تم چاہو تو مہاجرین میں شامل ہو جاؤ اور اگر چاہو تو انصار میں شمولیت اختیار کر لو۔ تمہیں اختیار ہے، دونوں میں سے جو بھی پسند ہو، اپنا لو۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہؓ ابن الیمان سے اس وقت فرمائے تھے جب وہ پہلے پہل دربارِ رسالتمآب میں حاضر ہوئے۔

حضرت حذیفہؓ کے والد حضرت یمانؓ مکی تھے اور قبیلۂ بنی عبس سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے اپنے ہی قبیلے کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ مکہ چھوڑنے اور یثرب میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے وہاں انھوں نے قبیلۂ بنی عبدالاشہل کے ساتھ حلیفانہ معاہدہ کر لیا، پھر اسی خاندان میں شادی کر لی اور وہیں حضرت حذیفہؓ کی پیدائش ہوئی۔ بعد میں جب وہ موانع دور ہو گئے جو ان کے اور مکہ کی آمد و رفت کے درمیان حائل تھے، تو وہ آزادی کے ساتھ وہاں آنے جانے لگے۔ لیکن ان کا قیام زیادہ تر مدینہ ہی میں رہتا۔ اور جب آفتاب اسلام جزیرہ نمائے عرب پر ضوفگن ہوا تو حضرت یمانؓ بنو عبس کے دس افراد پر مشتمل اس وفد کے ایک رکن تھے، جس نے بارگاہِ نبوت میں باریاب ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا۔ یہ واقعہ ہجرتِ نبوی سے پہلے کا ہے۔ اس طرح حضرت حذیفہؓ اپنی اصل کے اعتبار سے مکی اور پیدائش و پرورش کے لحاظ سے مدنی تھے۔ ان کی پرورش و پرداخت ایک مسلم گھرانے

میں ایسے مسلمان والدین کی آغوش میں ہوئی تھی جو ابتدا ہی میں اسلام کے ٹھنڈے اور خوشگوار سائے میں آ گئے تھے۔ اس طرح حضرت حذیفہ آنحضورؐ کے دیدار سے مشرف ہونے سے قبل ہی دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔

حضرت حذیفہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کے بے حد مشتاق تھے۔ اسلام لانے کے بعد سے وہ حضورؐ کے حالات اور اوصاف کے متعلق لوگوں سے برابر پوچھتے رہتے اور ان کے دل میں آتشِ شوقِ دیدار و زیارت ہمیشہ بھڑکتی رہتی تھی۔ آخر کار سمندِ شوق پر سوار وہ آپؐ کی ملاقات کے لیے مدینہ جا پہنچے اور بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوتے ہی دریافت کیا۔

"اللہ کے رسولؐ! میں مہاجر ہوں یا انصاری؟"

"تم چاہو تو مہاجرین میں شامل ہو جاؤ اور اگر چاہو تو انصار میں شمولیت اختیار کر لو، تمہیں اختیار ہے، دونوں میں سے جو بھی پسند ہو اپنا لو" آپؐ نے فرمایا۔ "یا رسول اللہؐ! میں انصاری ہوں" حضرت حذیفہؓ نے فیصلہ کُن لہجہ میں کہا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے پہنچے تو حضرت حذیفہؓ نے حضورؐ کی صحبت اختیار کر لی۔ وہ سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ لگے رہتے، اور غزوۂ بدر کے سوا تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ غزوۂ بدر میں اپنی عدم شرکت کی وجہ انھوں نے خود ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"میں اُس وقت اپنے والد کے ساتھ ایک ضرورت سے مدینے سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہاں کفارِ قریش نے ہم دونوں کو گرفتار کر لیا اور پوچھا کہ "تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

ہم نے کہا "مدینہ"، انھوں نے پوچھا "کیا تم لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)،

کے پاس جانا چاہتے ہو؟" ہم نے جواب دیا "ہم مدینہ جانا چاہتے ہیں۔" اور پھر وہ ہم کو اس شرط پر رہا کرنے پر آمادہ ہوئے کہ ہم ان سے اس بات کا عہد کریں کہ "نہ ہم ان کے خلاف محمدؐ کی مدد کریں گے، نہ جنگ میں ان کا ساتھ دیں گے۔" یہ عہد لے کر جب انھوں نے ہم کو رہا کیا تو ہم نے مدینے پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا، اور آپؐ سے دریافت کیا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو اپنا عہد پورا کرنے اور ان کے خلاف خدائے تعالیٰ سے استعانت کی تاکید فرمائی۔

جنگِ اُحد میں حضرت حذیفہؓ اور آن کے والد حضرت یمانؓ دونوں نے شرکت کی۔

حضرت حذیفہؓ نے اس میں خوب دادِ شجاعت دی اور اختتامِ جنگ کے بعد صحیح سالم واپس لوٹے لیکن ان کے والد حضرت یمانؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ مگر ان کو یہ سعادت مشرکین کی بجائے مسلمانوں کی تلوار سے حاصل ہوئی۔

ہوا یہ کہ اس غزوے کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت یمانؓ اور حضرت ثابت بن وقش رضی اللہ عنہما کو عورتوں اور بچوں کے ساتھ ایک محفوظ جگہ میں چھوڑ دیا۔ کیونکہ یہ دونوں حضرات کافی ضعیف اور سن رسیدہ تھے۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو حضرت یمانؓ نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"ہم کس بات کے منتظر ہیں؟ خدا کی قسم اب ہماری عمر کا بہت قلیل حصہ باقی رہ گیا ہے ہم بہت جلد اپنی مدتِ حیات پوری کرنے والے ہیں کیوں نہ ہم اپنی تلواریں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ میں

شریک ہو جائیں۔ ممکن ہے خدائے تعالیٰ ہم کو دولت شہادت سے بہرہ ور فرماتے۔" پھر وہ دونوں اپنی اپنی تلواریں لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت ثابتؓ بن وقش کو تو مشرکین کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی مگر حضرت یمانؓ پر نادانستگی میں مسلمانوں کی تلواریں برسنے لگیں۔ حضرت حذیفہؓ میرے والد .... میرے والد .... پکارتے رہ گئے مگر کسی نے ان کی آواز پر دھیان نہ دیا اور بوڑھے یمانؓ اپنے ساتھیوں کی تلواروں سے زخمی ہو کر گرے اور گوہر مقصود اپنے دامن میں سمیٹے بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہو گئے۔ اور حضرت حذیفہؓ صرف اتنا کہہ کر رہ گئے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی مغفرت کرے وہ ارحم الراحمین ہے۔" پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ بیٹے کو اس کے باپ کی دیت ادا کر دیں۔ مگر حضرت حذیفہؓ نے یہ کہہ کر دیت لینے سے معذرت کر دی کہ "وہ شہادت کے طالب تھے اور ان کی مطلوبہ چیز ان کو حاصل ہو گئی۔ خدایا تو گواہ رہنا۔ میں نے اپنے باپ کی دیت کو مسلمانوں پر صدقہ کر دیا۔" اس وسیع النظری اور کشادہ دلی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ان کا مرتبہ اور بلند کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کی صلاحیتوں کو بھانپ کر ان کے اندر پوشیدہ اور مخفی صلاحیتوں سے ان کے حسبِ استعداد کام لیا کرتے تھے۔ آپؐ نے جب اس پہلو سے حضرت حذیفہؓ کو جانچا تو ان کے اندر تین اعلیٰ ترین اور غیر معمولی خوبیوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تو غیر معمولی ذہانت جس سے کام لے کر وہ مشکل سے مشکل مسائل کو بہ آسانی حل کر لیا کرتے۔ دوسری زود فہمی اور حاضر دماغی، جس کے ذریعہ وہ بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ اور تیسری چیز تھی رازداری،

جس پر وہ سختی کے ساتھ کاربند تھے۔

مدینے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے سب سے مشکل اور ان کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ یہودیوں اور ان کے ہم خیال وہم مشرب مشرکین میں منافقین کا ایک گروہ موجود تھا جو اپنی گھناؤنی سازشوں اور مکروہ ریشہ دوانیوں کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات کھڑی کرتا رہتا تھا۔ اس لیے آپؐ نے حضرت حذیفہؓ کو ان تمام منافقوں کے ناموں سے آگاہ کر دیا تھا ——— اور یہ ایک ایسا راز تھا جس سے حضرت حذیفہؓ کے سوا کسی دوسرے کو مطلع نہیں کیا تھا ——— اور یہ خدمت اُن کے سپرد کی تھی کہ وہ ان منافقین کی سرگرمیوں اور ان کی حرکات وسکنات پر برابر نظر رکھیں۔ اور ان کی طرف سے پیش آنے والے خطرات کا سدِ باب اور تدارک کریں۔ اسی وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ "رازدانِ رسولؐ" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مواقع پر بہت سی اہم اور نازک ذمہ داریوں کی ادائیگی میں حضرت حذیفہؓ کا تعاون حاصل کرتے رہتے تھے لیکن سب سے مشکل اور خطرناک ذمہ داری جس میں ان کی ذہانت، زود فہمی اور رازداری کا زبردست امتحان تھا۔ اس وقت ان کے حوالے کی گئی تھی جب غزوۂ خندق کے موقع پر دشمن نے ہر طرف سے مسلمانوں کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اور محاصرے کے طول پکڑ جانے کی وجہ سے مسلمانوں کی پریشانیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ یہاں تک کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔ اور کتنے ہی مسلمان خدا کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو گئے۔

مسلمانوں کی تو یہ حالت تھی، لیکن قریش اور ان کے حلیف مشرک

قبائل کی حالت بھی ان سخت گھڑیوں میں مسلمانوں سے بہتر نہیں تھی۔ ان کے قدم ڈگمگا گئے۔ خدائے تعالیٰ نے ان کے اوپر تیز آندھی کا عذاب مسلّط کر دیا تھا جس سے ان کے خیمے اُلٹ گئے۔ دیگیں اوندھی ہو گئیں اور ان کے چولھے بجھ گئے ہوا کے تیز جھکڑوں نے ان کے چہروں پر کنکریوں کی بوچھار کر دی اور ان کی آنکھوں اور نتھنوں کو گرد و غبار سے بھر دیا۔

جنگ کے ان نازک اور فیصلہ کن لمحات میں جو فریق گھبرا کر صبر و ثبات کا دامن ہاتھوں سے چھوڑ دیتا ہے، وہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد رہتا ہے۔ اور وہ فریق جو ضبط و تحمل سے کام لیتا ہے اور فریق مخالف کے راہ فرار اختیار کرنے کے بعد تک محاذ پر ڈٹا رہتا ہے، فتح مند اور کامران ہوتا ہے۔ اور ایسے لمحات میں جو جنگ کے انجام پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتے ہیں ــــ برتری اسی فریق کو حاصل ہوتی ہے جو فریق ثانی کے حالات سے مکمل طور پر آگاہی حاصل کر کے اپنے موقف کا تعین کرتا اور نقشہ جنگ کو ترتیب دیتا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حذیفہؓ کی صلاحیتوں اور ان کے تجربات سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور آپ نے طے کیا کہ کوئی آخری اور فیصلہ کن قدم اٹھانے سے پہلے ان کو رات کی تاریکی میں دشمن کے کیمپ میں بھیج کر اس کے حالات معلوم کر لیں۔ تن تنہا دشمن کے کیمپ میں جانا، موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا لیکن جذبۂ اطاعت و جاں سپاری کی رہ نمائی میں حضرت حذیفہؓ نے اس مہم کو کس طرح انجام دیا۔ اس کو انھوں نے خود اپنے الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے۔

"اس رات ہم لوگ صفیں باندھے محاذ پر ڈٹے ہوتے تھے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی مشرکین ہم سے بالائی جانب صف آرا تھے۔ اور بنو قریظہ کے

یہودی ہم سے نشیب کی طرف تھے۔ ہم لوگوں کو بنو قریظہ کے ان یہودیوں سے اپنے اہل و عیال کے متعلق سخت خطرات لاحق تھے۔ وہ رات، ظلمت، ٹھنڈک اور ہواؤں کی شدت کے لحاظ سے محاصرے کی شدید ترین رات تھی۔ ہوائیں اس طرح گرج رہی تھیں جیسے وہ کانوں کے پردے پھاڑ ڈالیں گی اور تاریکی کا یہ عالم تھا کہ ہم کو اپنے ہاتھ نہیں دکھائی دیتے تھے۔

ایسی سخت گھڑیوں میں منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اپنے گھر لوٹ جانے کی اجازت مانگنے لگے۔ وہ کہتے کہ "ہمارے مکانات دشمن کے سامنے کھلے پڑے ہیں" ــــ حالانکہ دراصل وہ کھلے ہوتے نہ تھے ــــ تو منافقین میں سے جو بھی آپ سے جانے کی اجازت مانگتا آپؐ اُسے اجازت مرحمت فرما دیتے۔ یہاں تک کہ محاذ پر صرف تقریباً تین سو آدمی رہ گئے تھے۔ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایک کر کے ہم میں سے ہر شخص کے پاس تشریف لائے۔ آپؐ میری طرف بھی آئے ــــ اس وقت ٹھنڈک سے بچاؤ کے لیے میرے پاس صرف بیوی کی ایک ہلکی سی چادر تھی، جو میرے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچتی تھی ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے قریب آئے۔ میں زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔ آپؐ نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"حذیفہؓ" میں نے جواب دیا۔

"حذیفہؓ؟"

میں فاقے اور سردی کی شدت کے مارے زمین کی طرف سمٹ گیا اور بولا۔

"ہاں اے اللہ کے رسول! میں حذیفہؓ ہوں، حذیفہ بن یمان"۔
آپ مجھ سے اور قریب آگئے اور سرگوشی کے انداز میں فرمایا۔
"تم چپکے سے دشمن کے کیمپ میں جاؤ اور اس کے حالات معلوم کر کے مجھے آگاہ کرو۔" حکم سن کر انتہائی خوف اور سخت ٹھنڈک کے باوجود میں نے موت کی وادی کی سمت قدم اٹھا دیئے۔ اور آپ کی زبانِ مبارک سے میرے لیے دعا کے الفاظ نکلے۔

اَللّٰھُمَّ احْفَظْہُ مِن بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ وَعَنْ یَمِیْنِہٖ وَعَنْ شِمَالِہٖ وَعَنْ فَوْقِہٖ وَتَحْتِہٖ۔

"خدایا اس کی حفاظت فرما۔ اس کے سامنے سے، اس کے پیچھے سے، اس کے دائیں سے، اس کے بائیں سے، اس کے اوپر سے اور اس کے نیچے سے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ الفاظ ابھی ختم بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل سے خوف اور میرے جسم سے ٹھنڈک کے اثرات کو زائل کر دیا۔ جب میں جانے کے لیے مڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پکارا اور فرمایا۔
"حذیفہؓ! دیکھو ان کے کیمپ میں پہنچ کر کوئی اقدام نہ کرنا"۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ اور خاموشی کے ساتھ تاریکی کے پردے میں چلتا ہوا مشرکین کے لشکر میں پہنچ گیا۔ اور ان کے درمیان اس طرح گھل مل گیا گویا میں انھیں میں کا ایک فرد ہوں۔ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر کے بعد ابوسفیان ان کے درمیان تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔
"قریش کے لوگو! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، مگر مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچ

جائے۔ اس لیے تم میں سے ہر شخص اپنے بغل والے کو اچھی طرح سے دیکھ لے"۔
میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے آدمی کا ہاتھ پکڑا اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس نے کہا فلاں ابن فلاں۔ اور پھر ابو سفیان نے تقریر کا سلسلہ آگے بڑھایا
"قریش کے لوگو! اب تمہارے لیے یہاں مزید ٹھہرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی ہے تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ہمارے جانور ہلاک ہوتے جا رہے ہیں، بنو قریظہ کے یہودی ہم سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ اور تند و تیز ہواؤں کے ہاتھوں جن پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا ہمیں کرنا پڑ رہا ہے، ان کا بھی تم مشاہدہ کر رہے ہو۔ اس لیے اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کوچ کر چلو۔ میں خود بھی واپس جا رہا ہوں"۔
یہ کہہ کر وہ اپنے اونٹ کے پاس آیا اس کے گھٹنے سے بندھی ہوئی رسی کھولی اور اس پر سوار ہو گیا۔ پھر اسے ایک کوڑا رسید کر دیا۔ اونٹ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے سوار کو لے کر روانہ ہو گیا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپسی سے پہلے مجھے کسی اقدام سے روک نہ دیا ہوتا تو اس وقت تیر مار کر ابو سفیان کو قتل کر ڈالنا میرے لیے بہت آسان تھا۔
اس کے بعد جب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آیا تو دیکھا آپؐ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی چادر اوڑھے نماز میں مشغول ہیں۔ آپؐ نے مجھے دیکھا تو اپنے قریب بلایا، میں جا کر آپؐ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اور آپؐ نے میرے اوپر اپنی چادر کا ایک کنارہ ڈال دیا۔ میں نے پوری رپورٹ خدمتِ اقدس میں پیش کر دی۔ جسے سن کر آپؐ بہت خوش ہوئے۔ اس پر اللہ کی تعریف کی اور اس کا شکر ادا کیا"۔
"حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ زندگی بھر منافقین سے متعلق رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے رازوں کے امین رہے۔ خلفاء راشدین منافقوں کے متعلق ہمیشہ ان کی طرف رجوع کرتے رہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطابؓ کا تو یہ حال تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کا انتقال ہوتا تو وہ لوگوں سے دریافت فرماتے کہ حذیفہؓ اس کی نماز جنازہ میں شریک ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہوتا تو وہ بھی شریک جنازہ ہوتے۔ بصورت دیگر انھیں اس کے مومن مخلص ہونے میں شک ہوجاتا اور نماز جنازہ نہ پڑھتے۔ ایک بار انھوں نے حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا کہ "میرے گورنروں میں سے کوئی منافق ہے؟" حضرت حذیفہؓ نے کہا "ہاں ایک ہے۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا، کون؟ مگر حضرت حذیفہؓ نے اس کا نام بتانے سے معذرت کردی۔ حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ "اس کے چند ہی دنوں کے بعد حضرت عمرؓ نے اس عامل کو معزول کردیا۔ جیسے انھیں اس کی نشان دہی کردی گئی ہو۔"

شاید کچھ لوگوں کو یہ بات نہ معلوم ہو کہ حضرت حذیفہؓ نہاوند، دینور، ہمدان اور رے کے فاتح تھے۔ اور تمام مسلمانوں کے ایک مصحف پر جمع کیے جانے کے محرک بھی یہی حضرت حذیفہؓ تھے۔

مگر ان تمام خدمات اور عظیم الشان کارناموں کے باوجود خدا کے خوف اور اس کی گرفت سے ہمیشہ لرزہ براندام رہتے تھے۔ جب ان کا مرض الموت شدت اختیار کرگیا اور وقت موعود قریب آپہنچا تو کچھ صحابہ کرامؓ رات کے پچھلے پہر ان کی عیادت کو تشریف لائے۔

حضرت حذیفہؓ نے دریافت فرمایا کہ "یہ کون سا وقت ہے؟" جب ان کو بتایا گیا کہ اب صبح ہونے ہی والی ہے تو فرمایا۔ اعوذ باللہ من صباح یفضی بی الی النار۔ میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس صبح سے

جو مجھے جہنم میں پہنچا دے گی۔ پھر پوچھا، "کفن لائے ہو؟"
کہا گیا "ہاں" تو فرمایا "دیکھو! میرے کفن میں غلو سے کام نہ لینا۔ اگر خدائے تعالیٰ کے یہاں میرے لیے خیر ہے تو وہاں مجھے اس سے اچھا لباس مل جائے گا۔" پھر کہنے لگے، "خدایا! تو جانتا ہے کہ میں ہمیشہ فقر کو غنا پر، تواضع کو تکبر پر اور موت کو زندگی پر ترجیح دیتا رہا۔"

پھر ان کی زبان سے آخری الفاظ ادا ہوئے۔ حبیبٌ جاءَ علی شوقٍ، لا اَفلحَ مَن نَدِمَ .... اور طائرِ رُوح قفسِ خاکی کو چھوڑ کر اپنے ابدی اور دائمی آشیانے کی طرف پرواز کر گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

خدائے تعالیٰ حضرت حذیفہؓ بن الیمان پر رحم فرمائے۔ وہ اپنی طرز کے ایک نرالے شخص تھے۔

ردیفِ رسول حضرت عُقبہ بن عامر جُہنی رضی اللہ عنہٗ

یہ ہیں رسُول خدا جو ایک طویل انتظار اور شدید بے چینی کے بعد یثرب کے بالائی حصّے سے نمودار ہو رہے ہیں۔ اور اُدھر مدینہ منورہ کے باشندے ہیں جو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ملاقات کی خوشی میں اپنے گھروں کے دروازوں اور مکانوں کی چھتوں پر اکٹھا ہو رہے ہیں۔ اور ان کے ہونٹوں پر تہلیل و تکبیر کے سرمدی کلمات مچل رہے ہیں۔ اور اس طرف مدینہ کی کم سن اور بھولی بھالی بچیاں اپنے ہاتھوں میں دف اور آنکھوں میں شوقِ انتظار لیے نکل پڑی ہیں۔ ان کے لبوں پر خیر مقدمی نغمات ہیں، جنھیں وہ ایک ساتھ مل کر بار بار دہرا رہی ہیں

اَقْبَلَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا	"ثنیۃ الوداع کی گھاٹیوں سے طلوع
مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ	ہو کر ماہِ کامل ہمارے سامنے آگیا جب
وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا	تک بلانے والا اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا
مَا دَعٰی لِلّٰہِ دَاعِ	رہے ہمارے اوپر اس کا شکر واجب ہے"

اور یہ رہا رسُول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوس جو دو رویہ صف بستہ کھڑے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہایت سبک خرامی اور نرم روی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔ جس کو مشتاق رُوحوں اور پُر شوق دِلوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے، جس کے اُوپر

اشکہائے مسرت و نشاط کے گہر ہائے آبدار اور تبسم ہائے سرور و انبساط کے گلہائے مشکبار نچھاور کیے جا رہے ہیں۔

لیکن حضرت عقبہ ابن عامر جہنیؓ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جلوس کا مشاہدہ نہ کر سکے۔ وہ آپؐ کے استقبال کی سعادت سے محروم رہ گئے۔ یہ محرومی ان کے حصّے میں اس لیے آئی کہ وہ اپنی بکریوں کو لے کر انھیں چرانے کے لیے وادیوں کی طرف نکل گئے تھے کیونکہ بھوک پیاس کی وجہ سے اُن کے ہلاک ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جب کہ یہ چند بکریاں ہی ان کا کُل سرمایہ تھیں جو دُنیا کے متاعِ فانی میں سے ان کے زیرِ ملکیت تھا۔

فرحت و سرور کی وہ کیف پرور فضا جو مدینہ پر چھائی ہوئی تھی، بہت جلد اس کی دُور و قریب کی وادیوں تک عام ہو گئی، سارے کہسار و بیابان اس کی ضیا باریوں سے جگمگا اُٹھے اور اس کی خوش خبریاں حضرت عقبہ ابن عامر جہنیؓ کے کانوں تک بھی پہنچ گئیں حالانکہ وہ مدینہ سے دُور وسیع میدانوں میں اپنی بکریاں چراتے پھر رہے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آن کی ملاقات کیسے اور کن حالات میں ہوئی۔ اُس کی تفصیل ہم اُنھیں کے الفاظ میں ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو میں اس وقت اپنی بکریوں میں تھا۔ آپؐ کی تشریف آوری کی خبر جیسے ہی مجھے ملی، میں نے بکریوں کو وہیں چھوڑا اور بلا تاخیر آپؐ سے ملنے کے لیے مدینہ روانہ ہو گیا اور بارگاہِ نبوی میں پہنچ کر عرض کیا " اللہ کے رسُولؐ! آپ میری

بیعت قبول فرمائیں گے ؟"

"تم کون ہو؟" آپؐ نے پوچھا۔

"عُقبہ ابن عامر جُہنی"۔ میں نے جواب دیا۔

"کون سی بیعت تمہیں پسند ہے ۔ تم بیعت اعرابیہ کروگے یا بیعت ہجرت ؟ آپؐ نے پوچھا۔

"بیعت ہجرت"۔ میں نے جواباً عرض کیا۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے بھی انھیں باتوں پر بیعت کی جن پر اور مہاجرین سے لی تھی۔ پھر میں آپؐ کی خدمت میں ایک رات گزار کر واپس اپنی بکریوں میں آگیا۔

ہم لوگ کُل بارہ آدمی تھے جو اسلام لانے کے بعد اپنی بکریاں چرانے کے لیے مدینۂ منورہ سے دُور ــــ وادیوں میں اقامت گزین تھے ــــ ایک دن ہمارے ایک ساتھی نے کہا ــــ "اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھنے اور ان کے اُوپر آسمان سے نازل ہونے والی وحی کو سُننے کے لیے باری باری خدمت اقدس میں حاضری نہ دے سکیں تو ہمارے اندر خیر کی کوئی بات نہ ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ روزانہ ہم میں سے ایک آدمی یثرب جائے اور اپنی بکریاں باقی ساتھیوں کی حفاظت میں چھوڑ جائے"۔

میں نے کہا کہ "تم لوگ یکے بعد دیگرے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ہر جانے والا اپنی بکریاں میرے حوالے کر جایا کرے ــــ میں اپنی بکریوں کے بارے میں بہت محتاط رہتا تھا اور انھیں کسی کے سپرد کر جانا مجھے گوارا نہ تھا۔

"اس کے بعد سے روزانہ صبح کو میرا ایک ساتھی حضورؐ کی خدمت میں جاتا۔

اوراس کی بکریوں کو چرانے کی ذمہ داری میں انجام دیتا۔ اور واپسی پر میں وہ تمام باتیں اس سے پُوچھ کر معلوم کرلیتا جو وہاں سے سُن کر اور دیکھ کر وہ آتا تھا۔

لیکن چند روز کے بعد میں نے اپنے آپ سے کہا۔

" تمہارا بُرا ہو۔ کیا تم ان چند حقیر سی بکریوں کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی صحبت اور ان سے براہِ راست اور بالمشافہ دین سیکھنے پر ترجیح دینا چاہتے ہو " پھر میں اپنی بکریوں سے کنارہ کش ہو کر مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ وہاں پہنچ کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر ہمسائیگی مسجد نبوی میں قیام کروں۔"

حضرت عقبہؓ ابن عامر جُہنی جس وقت یہ اہم فیصلہ کر رہے تھے اس وقت اُن کے دل میں یہ بات کھٹکی بھی نہ ہو گی کہ چند سال گزرنے کے بعد وہ اکابر علماء صحابہؓ میں سے ایک زبردست عالم، بڑے قُراء میں سے ایک مشہور قاری، عظیم فاتحین میں سے ایک نامور فاتح اور قابلِ ذکر والیانِ اسلام میں سے ایک کامیاب والی ہو جائیں گے۔ اور جب وہ اپنی بکریوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف جا رہے تھے تو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی ہو گی کہ وہ ام الدنیا ــ دمشق ــ کو فتح کرنے والے لشکر کا ہراول دستہ ہوں گے۔ اور اس کے سرسبز و شاداب باغات کے درمیان باب توما کے پاس اپنے لیے ایک شاندار محل تعمیر کروائیں گے نیز وہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ دنیا کے سبز نگینہ اور اس کے والی ــ مصر ــ کو فتح کرنے والی فوج کے قائدین میں سے ایک قائد ہوں گے اور وہاں جبل مقطم کی جڑ میں ایک خوبصورت

مکان بنوائیں گے۔ یہ ساری باتیں مستقبل کے سینے میں پوشیدہ تھیں اور خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی بھی انھیں نہیں جانتا تھا۔

مدینہ منورہ آکر حضرت عقبہ ابن عامرؓ نے مستقل طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کر لی۔ وہ سائے کی طرح ہمیشہ آپؐ کے ساتھ رہتے۔ آپؐ جہاں کہیں تشریف لے جاتے، آپؐ کے خچر کی لگام ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ آپؐ جدھر بھی رُخ کرتے، وہ ہمیشہ آپؐ کے آگے آگے چلتے۔ اور بسا اوقات آپؐ انھیں اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھا لیتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ "ردیفِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ آنحضورؐ خود اپنی سواری سے اُتر جاتے تاکہ وہ سوار ہو جائیں۔ اور آپؐ خود پا پیادہ چلیں۔ خود ان کا بیان ہے کہ

"ایک دفعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر کی لگام تھامے مدینہ کے ایک بن میں آپؐ کے آگے چل رہا تھا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ۔۔ "عُقبہ! کیا تم سوار نہیں ہو گے؟"

میرے دل میں آیا کہ کہدوں "نہیں"، مگر پھر اس خوف سے کہ کہیں اس میں حضورؐ کی نافرمانی نہ ہو جائے، میں نے کہا۔

"جی ہاں! اے اللہ کے نبیؐ۔"

تب آپؐ اپنے خچر سے نیچے اُتر آئے اور میں امتثالِ امر کے طور پر سوار ہو گیا ۔۔ اور آپؐ پیدل چلنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نیچے اُتر آیا اور رسول اللہؐ سوار ہو گئے ۔۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔

"عُقبہ! میں تم کو دو بے مثل سورتیں بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں اے اللہ کے رسولؐ! ضرور بتائیں۔"

تب آپؐ نے مجھے "قُل اعُوذ بربّ الفلق" اور "قُل اعُوذ بربّ الناس" پڑھایا۔ اس کے بعد جب نماز کھڑی ہوئی تو آپؐ نے امامت فرمائی اور انھیں دونوں سُورتوں کو اس نماز میں پڑھا۔ اور مجھ سے فرمایا۔ "سونے سے پہلے اور نیند سے بیدار ہونے کے بعد ان دونوں سُورتوں کو ضرور پڑھ لیا کرو۔"

اس کے بعد سے میں زندگی بھر اس وظیفے پر عمل پیرا رہا۔"

حضرت عُقبہ ابن عامر جہنیؓ نے صرف دو چیزوں علم اور جہاد — پر اپنی تمام توجہ مرکوز کر دی تھی۔ اور اپنی تمام ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو ان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ علم کے گہرے اور میٹھے چشمے — چشمۂ نبوت — سے خوب خوب سیراب ہوئے۔ اور مختلف اصنافِ علم میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسبِ فیض کیا۔ حتیٰ کہ قرآن و حدیث، فقہ و فرائض، ادب و فصاحت اور شعر و شاعری میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔

حضرت عُقبہؓ نہایت خوش گلو شخص تھے۔ قرآن نہایت خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب رات کا سنّاٹا چھا جاتا اور فضا پرسکون اور خاموشی کی چادر تن جاتی تو یہ کتاب اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس کی آیات کی تلاوت شروع کرتے تو صحابۂ کرامؓ ان کی قرأت کو سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو جاتے، اس سے بیحد متاثر ہوتے اور خُدا کے خوف سے ان کے دلوں میں سوز و گداز ہو جاتا اور ان کی آنکھیں بے تحاشا اشک ریز ہو جاتیں۔

ایک روز حضرت عمر ابن خطابؓ نے ان کو بُلایا اور فرمایا کہ "عُقبہ!

مجھے کچھ قرآن سناؤ۔" انھوں نے قرآن حکیم کی آیات پڑھنی شروع کیں۔ ایک تو "ربّ السمٰوات والارض" کا پُرشوکت اور لرزہ براندام کر دینے والا کلام، دوسرے حضرت عُقبہ ابن عامرؓ کی پُرسوز اور دل میں اُتر جانے والی آواز۔ حضرت عمرؓ بے حد متاثر ہوئے اُن کے اوپر بے اختیار گریہ طاری ہوگیا اور روتے روتے اُن کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

انتقال کے بعد حضرت عُقبہ ابن عامرؓ اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مُصحف چھوڑ گئے تھے۔ یہ مُصحف مصر کی ایک جامع مسجد ــــ جامع عُقبہ ابن عامرؓ ــــ میں بہت زمانے تک موجود تھا جس کے آخر میں "کَتَبَہٗ عُقبَۃُ بن عامر الجُہَنِی" کے الفاظ درج تھے۔

حضرت عقبہ ابن عامرؓ کا یہ مُصحف دنیا میں پایا جانے والا قدیم ترین مصحف تھا، لیکن یہ بھی ہمارے دیگر قدیم اور بیش قیمت سرمایوں کی طرح زمانے کی دست بُرد سے نہ بچ سکا۔

اور جہاں تک جولانگاہِ جہاد میں ان کی سرگرمیوں اور کارناموں کا تعلق ہے، تو ہمارے لیے اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ حضرت عقبہ ابن عامرؓ جہنی غزوۂ احد اور اس کے بعد پیش آنے والے تمام غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ وہ اُن جانبازوں میں سے ایک تھے جنھوں نے فتحِ دمشق کے موقع پر غیر معمولی شجاعت اور ہمت و مردانگی کا مظاہرہ کیا اور دشمن کے چھکّے چھڑا دیے۔ اور حضرت ابو عبیدہؓ ابن جراح نے اس کے صلہ میں ان کو اس اعزاز سے نوازا کہ فتحِ دمشق کی خوش خبری انھیں کے ذریعہ امیر المومنین حضرت عمر ابن خطابؓ کی خدمت میں مدینہ بھجوائی، وہ ایک جمعہ سے دُوسرے جمعہ تک آٹھ دن سات راتیں

کہیں رُکے بغیر تیز رفتاری کے ساتھ سفر کر کے وہاں پہنچے اور حضرت عمرؓ کو فتحِ عظیم کی خوش خبری سُنائی۔ وہ اس لشکرِ اسلام کے قائدین میں سے تھے جس نے مصر کو فتح کیا تھا اور اس کا بدلہ امیرالمومنین حضرت معاویہؓ ابن ابی سفیان نے یہ دیا کہ انھیں وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ تین سال تک اس عہدے پر فائز رہے۔ پھر حضرت معاویہؓ نے انھیں جہاد کے لیے بحرِ ابیض متوسط میں واقع جزیرہ روڈس[1] بھیج دیا۔

جہاد سے ان کے شوق و تعلق کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جہاد سے متعلق بہت سی احادیث نبویہ کو اپنے سینے میں محفوظ کر لیا تھا اور ان کی روایت خاص طور پر مسلمانوں سے کرتے تھے۔ وہ بڑی جانفشانی اور شوق و دل چسپی کے ساتھ تیر اندازی کی مشق کرتے اور اس میں غیر معمولی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔

جب حضرت عُقبہ ابن عامر جہنیؓ مرض الموت میں مبتلا ہوئے ــــ اور اس وقت وہ مصر میں تھے ــــ تو انھوں نے اپنے لڑکوں کو پاس بلا کر یہ نصیحت کی۔ میرے جگر گوشو! میں تم کو تین باتوں سے روکتا ہوں۔ ان کی سختی سے ساتھ پابندی کرنا۔

۱۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کبھی کسی غیر ثقہ سے قبول نہ کرنا۔

۲۔ کبھی قرض نہ لینا۔ خواہ تم فقر و احتیاج کے اس درجے تک پہنچ جاؤ

---

[1] بحرِ متوسط میں واقع ایک جزیرہ قبرص کے مغربی اور ترکی کے جنوب مغربی سمت میں ہے۔

کہ تمہیں کمبل اور موٹے جھوٹے کپڑے پہننے پڑیں۔
۳۔ اشعار کبھی نہ لکھنا کہ اس کی مشغولیت کے نتیجے میں تمہارے دل قرآن سے غافل ہو جائیں۔ اور جب ان کی وفات ہوگئی تو انھیں جبل مقطم کی تلی میں دفن کیا گیا۔ پھر جب لوگ ان کے ترکے کی طرف متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ستر سے اُوپر کمانیں چھوڑی ہیں۔ اور ہر کمان کے ساتھ ترکش اور تیر بھی ہیں۔ اور ان کے متعلق ان کی یہ وصیت موجود تھی کہ انھیں راہِ خدا میں وقف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ قاری، عالم اور غازی حضرت عقبہ ابن عامر جہنی رض کے چہرے کو شاداب رکھے اور انھیں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین اجر سے نوازے۔ آمین۔
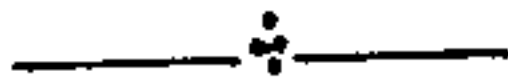
حضرت حبیب بن زید انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت جبیب بن زید رضی اللہ عنہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس کے ایک ایک شخص سے ایمان کی خوشبو پھوٹتی تھی اور ان کی نشو و نما ایک ایسے گھر میں ہوئی تھی جس کے ایک ایک فرد کی لوحِ جبین پر قربانی و فداکاری کی اَن گنت داستانیں رقم تھیں۔

ان کے والد حضرت زید بن عاصم رضی اللہ عنہ تھے جو یثرب میں مسلمانوں کے ہراول میں شامل تھے۔ وہ اُن ستر سعادت مند لوگوں میں سے تھے جو لیلۃ العقبہ میں موجود تھے، جنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی۔ اس موقع پر ان کے ساتھ ان کی زوجۂ محترمہ اور ان کے دونوں صاحب زادے بھی موجود تھے۔ اور ان کی والدہ تھیں حضرت ام عمارہ نسیبہ مازنیہؓ۔ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے اللہ کے دین کی حفاظت اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں ہتھیار اٹھایا تھا۔ اور ان کے بھائی تھے حضرت عبداللہ بن زیدؓ جنھوں نے غزوہ اُحد کے موقع پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہوکر ان لوگوں کے متعلق فرمایا تھا۔

"بَارَكَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مِنْ اَهْلِ بَيْتٍ رَحِمَكُمُ اللّٰهُ مِنْ	"تم گھر والوں پر اللہ اپنی برکت نازل فرمائے، تم گھر والوں پر اللہ اپنی

اَھْلِ بَیْتٍ۔ رحمت نازل کرے۔"

ایمان کا نور حضرت حبیب بن زیدؓ کے دل میں اس وقت جاگزیں ہو چکا تھا جب وہ ابھی اپنی عمر کی ابتدائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ اور قسّامِ ازل کی طرف سے ان کے مقدر میں یہ بات لکھ دی گئی تھی کہ وہ اپنے والدین خالہ اور بھائی کے ساتھ مکّہ جائیں اور ستّر خوش بخت اور فرخندہ فال ہستیوں کے ساتھ مل کر اسلام کی تاریخ بنانے میں اپنا کردار ادا کریں، جہاں انھوں نے تاریکی کے پردے میں اپنے ننھے ہاتھوں کو بڑھا کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقبہ کی بیعت کی تھی۔ اور اُس تاریخ سے اللہ کا رسُولؐ ان کو اپنے والدین سے زیادہ محبوب اور اس کا دین اُن کے نزدیک اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو گیا تھا۔

اپنی کم سِنی کے باعث حضرت حبیب بن زیدؓ معرکۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے۔ اسی طرح وہ غزوۂ احد میں شرکت کے شرف سے بھی محروم رہے کیونکہ اس موقع پر بھی ان کی عمر ہتھیار اُٹھانے کی نہیں تھی۔ البتہ اس کے بعد سارے غزوات میں ان کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوتا رہا اور ان میں سے ہر ایک میں انھوں نے عزّت و غلبہ، مجد و شرف اور فداکاری و جاں سپاری کے لافانی نقوش اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیے۔

لیکن یہ سارے کارنامے اپنی عظمت و دل کشی کے باوجود حقیقت میں اس عظیم الشان کارنامے کی زبردست تیاری کے مختلف مراحل تھے جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کرنے والے ہیں۔ جو آپ کے ضمیر کو اس طرح جھنجھوڑ کر رکھ دے گا جس طرح وہ زمانۂ نبوت سے لے کر اب

تک لاکھوں مسلمانوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ چکا ہے اور جس کی کہانی مُرورِ زمانہ کے باوجود آپ کو اسی طرح حیرت واستعجاب سے دوچار کردے گی جس طرح ان کو کرچکی ہے۔ تو آیئے ہم اس الم ناک کہانی کو اس کے آغاز سے سنتے ہیں۔

۹ھ تک شجرِ اسلام کا تنہ کافی مضبوط و توانا ہوچکا تھا، اس کی شاخیں قوی ہوچکی تھیں اور اس کی جڑیں گہرائیوں میں اُتر چکی تھیں۔ اس سال عرب کے اطراف و جوانب سے مختلف قبائل کے وفود کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ یہ وفود مدینہ منورہ پہنچ کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے، ان کے سامنے اپنے قبول اسلام کا اعلان کرتے اور ان کے دستِ مبارک پر سمع و طاعت کی بیعت کرتے تھے۔ انھیں وفود میں بنی حنیفہ کا وہ وفد بھی تھا جو نجد کے بالائی حصّے سے آیا تھا۔ اس وفد نے مدینۃ الرسولؐ کے کنارے پڑاؤ ڈالا اور مُسیلمہ ابن حبیب نامی ایک شخص کو سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے چھوڑ کر دربار نبویؐ میں حاضری کے لیے روانہ ہوگیا۔ انھوں نے آپؐ کے سامنے اپنی اور اپنے قبیلے کی طرف سے اسلام کا اعلان کیا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا، ان کی خاطر تواضع فرمائی اور پیچھے رہ جانے والے ساتھی سمیت ان میں سے ہر ایک کے لیے عطیات کا حکم دیا۔

اس وفد کے واپس نجد پہنچنے کے ساتھ ہی مُسیلمہ ابن حبیب اسلام سے پھر گیا اور اس نے لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بنو حنیفہ کے لیے نبی بناکر بھیجا ہے جیسا کہ محمدؐ بن عبداللہ کو قریش کے لیے بھیجا ہے۔

اس اعلان کے ساتھ ہی بنو حنیفہ کے لوگ مختلف عوامل و داعیات کے تحت اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان عوامل میں زبردست عامل قبائلی عصبیت کا جذبہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سردار نے کہا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے اور مسیلمہ جھوٹا ہے لیکن مجھے بنو ربیعہ کا کذاب بنو مضر کے سچے سے زیادہ پسند ہے۔"

جب مسیلمہ کے بازو مضبوط ہو گئے، اس کا معاملہ قوی ہو گیا اور اس کے متبعین کی تعداد کافی بڑھ گئی تو اس نے اپنے دو آدمیوں کے ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا

"اللہ کے رسول مسیلمہ کی طرف سے، اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو۔

سلام علیک۔ اما بعد۔ نبوت کے اس منصب میں آپ کے ساتھ مجھے بھی شریک کیا گیا ہے۔ لیکن قریش زیادتی کرتے ہیں۔"

جب یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پڑھ کر سنایا گیا تو آپؐ نے ان دونوں قاصدوں سے پوچھا۔

"تم دونوں اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ہم بھی وہی کہتے ہیں جو اس خط میں لکھا ہوا ہے۔" ان دونوں نے جواب دیا۔

"خدا کی قسم، اگر سفراء کا قتل جائز ہوتا تو میں دونوں کی گردنیں اڑا دیتا۔" آپؐ نے فرمایا اور یہ خط لکھ کر انھیں دونوں کے ہاتھ مسیلمہ کے یہاں بھیج دیا۔

"بِسمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم   اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت

مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى مُسَيْلِمَةَ الْكَذَّابِ۔ اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اما بعد۔ فَاِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

رحم کرنے والا ہے۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کو۔ سلام اس پر جو ہدایتِ خداوندی کی پیروی کرے۔ اما بعد۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، اسے جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے۔ اور آخرت کا بہترین انجام متقیوں کے لیے ہے!"

جب مسیلمہ کا شر حد سے تجاوز کرنے اور اس کا فساد ہر طرف پھیلنے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسب سمجھا کہ اس کی گمراہی پر زجر و توبیخ کرتے ہوئے اس کو ایک خط بھیجیں۔ چنانچہ اس خدمت کے لیے آپؐ نے ہماری اس کہانی کے ہیرو حضرت حبیب بن زید رضی اللہ عنہما کو طلب فرمایا جو اس وقت ایک خوبصورت اور بھرپور جوانی کے مالک اور سرتاپا ایمان کی ایک مکمل تصویر تھے۔

حضرت حبیب بن زیدؓ کسی سستی اور تاخیر کے بغیر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے نجد کے بالائی حصے میں واقع بنو حنیفہ کے دیار میں پہنچے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک مسیلمہ کے حوالے کر دیا۔

خط کے مندرجات سے آگاہ ہوتے ہی مسیلمہ کا سینہ نفرت اور کینہ سے پھول گیا اور اس کے زرد اور قبیح چہرے پر شرارت اور غداری کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس نے حکم دیا کہ حضرت حبیب بن زیدؓ کو پابہ زنجیر کر دیا جائے اور اگلے روز چاشت کے وقت میرے سامنے پیش کیا جائے۔

اگلے روز مسیلمہ نے اپنی مجلس منعقد کی، کرسئ صدارت پر متمکن ہوا، دائیں بائیں اپنے متبعین کے سرغنوں کو بٹھایا اور عوام کو مجلس میں آنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے حضرت حبیب بن زیدؓ کو پیش کرنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ بوجھل بیڑیوں میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سامنے پہنچے اور اس کینہ پرور مجمع میں اپنے لمبے قد، بلند سر اور اُونچی ناک کے ساتھ اس طرح تن کر کھڑے ہو گئے جیسے کوئی مضبوط نیزہ زمین میں سیدھا گاڑ دیا گیا ہو۔

مسیلمہ نے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسُول ہیں؟"

"ہاں" انھوں نے فوراً جواب دیا۔ "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسُول ہیں۔"

یہ جواب سُن کر وہ غصّے سے پھٹ پڑا۔ اس نے پھر پوچھا۔

"اور کیا تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسُول ہوں؟"

"میرے کان تمھاری یہ بات سُننے کے لیے بہرے ہیں۔" انھوں نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا۔

یہ سُن کر مسیلمہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصّے میں اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور اس نے اپنے جلّاد کو حکم دیا کہ اس کے بدن کا ایک عضو کاٹ دو۔ جلّاد نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا اور ان کے جسم کا ایک حصہ کٹ کر زمین پر تڑپنے لگا۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔

"کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسُول ہیں۔"

"ہاں، میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے

رسُول ہیں۔" اُنھوں نے پھر وہی جواب دیا۔

"اور تم یہ بھی گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہُوں؟" اس نے دوبارہ وہی سوال کیا۔

"میں کہہ چکا ہوں کہ میرے کان تمہاری یہ بات سُننے سے معذور ہیں۔" انھوں نے جواب دیا۔

اس نے جلاد کو ان کے جسم کا ایک اور عضو کاٹنے کا حکم دیا، جو کاٹ دیا گیا اور لڑھکتا ہوا پہلے عضو کے پاس جاکر ٹھہر گیا۔ لوگ پورے عرصے میں نگاہیں اُٹھائے بڑی حیرت واستعجاب کے ساتھ ان کی ثابت قدمی اور ضد کو دیکھتے رہے۔

مسیلمہ سوال کرتا رہا، جلاد ایک ایک عضو کاٹتا رہا اور حضرت حبیبؓ بن زید کہتے رہے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔" یہاں تک کہ ان کا آدھا جسم کٹے ہوئے ٹکڑوں کی شکل میں زمین پر بکھر گیا اور آدھا گوشت کے لوتھڑے کی صُورت میں بولتا رہا۔ پھر ان کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ اس وقت ان کے پاکیزہ ہونٹوں پر اسی رسولِ پاک کا نام تھا۔ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام — جس کے دستِ مبارک پر انھوں نے عقبہ کی رات میں بیعت کی تھی۔

جب ان کی ماں، حضرت نسیبہ مازنیہ رضی اللہ عنہا کو ان کی شہادت کی خبر دی گئی تو انھوں نے صرف اتنا کہا۔

"میں نے ایسے ہی مواقع کے لیے اس کو تیار کیا تھا...... اور اس کے بدلے میں اللہ سے بہترین اجر کی توقع کی تھی...... اس نے بچپن

میں رسولؐ سے عقبہ کی بیعت کی اور جوان ہو کر ان سے وفاداری کا حق ادا کر دیا...... اگر اللہ نے مجھے مسیلمہ پر قابو بخشا تو میں اس کی لڑکیوں کو اس پر نوحہ کرنے کے لیے مجبور کر دوں گی۔"

اور حضرت نسیبہؓ کو جس دن کی تمنا کی تھی، اس کے آنے میں زیادہ دن نہیں لگے ...... ایک روز خلیفۂ رسول اللہؐ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا یہ اعلان ان کے منادی کی زبانی مدینہ منورہ کے تمام گلی کوچوں میں سنائی دے رہا تھا۔

"جھوٹے مدعیٔ نبوت ـــ مسیلمہ کذاب ـــ سے جنگ کے لیے چلو۔"

اور مسلمان تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے اس سے مقابلے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس فوج میں حضرت نسیبہ مازنیہؓ اور ان کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زیدؓ بھی شامل تھے۔ جنگ کے دوران یہ دیکھا گیا کہ حضرت نسیبہؓ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دشمن کی صفوں کو چیرتی ہوئی پکارتی پھر رہی تھیں۔

"کہاں ہے دشمنِ خدا...... بتاؤ مجھے، کہاں ہے وہ اللہ کا دشمن؟" اور جب اُس کے پاس پہنچیں تو دیکھا کہ وہ زمین پر گرا ہوا ہے اور مسلمانوں کی پیاسی تلواریں اس کے خون سے سیراب ہو رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر ان کا جی خوش ہو گیا اور ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے نیک اور متقی فرزند کا انتقام ان کے ظالم اور بدبخت قاتل سے نہیں لے لیا؟ کیوں نہیں، یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان کا انتقام لے لیا اور وہ دونوں فریق اپنے رب کی طرف گئے۔ مگر ایک فریق جنت میں ہے اور دُوسرا جہنم میں۔

حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہٗ

حضرت زید بن سہل نجّاری (ابو طلحہ) کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ رُمیصاء بنت مِلحان (اُمِّ سُلَیم) نجاریہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد بیوہ ہوگئی ہیں تو وہ فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے۔ اور ان کی یہ خوشی کچھ زیادہ حیران کن بھی نہیں تھی کیونکہ ام سُلَیم ایک پاک دامن، سنجیدہ و باوقار، عاقلہ اور مجموعۂ صفات خاتون تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کا ارادہ کرلیا کہ دوسرے خواہش مندوں سے پہلے ہی ان کو نکاح کا پیغام دے دیں۔ اور ان کو اس بات کا پورا اطمینان تھا کہ ام سلیم ان کے مقابلے میں کسی دُوسرے کو ترجیح نہیں دے سکتی ہیں۔ کیونکہ وہ مردانگی کا کامل نمونہ، معاشرے میں اُونچے مقام کے مالک اور ایک دولت مند شخص تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے قبیلے — بنو نجار کے مشہور شہسوار اور یثرب کے معدودے چند اور نامور تیراندازوں میں سے تھے۔

یہ سب سوچ کر ابو طلحہ ام سُلَیم کے گھر کی طرف چل پڑے لیکن راستے میں ان کو خیال آیا کہ اُمِّ سُلیم مکہ سے آتے ہوئے داعی — مصعب بن عُمیر — کی باتیں سُن کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاچکی اور ان کے دین کی پیروی اختیار کرچکی ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان کا پہلا شوہر جس کا ابھی انتقال ہوا ہے،

اپنے آباء و اجداد کے دین پر کاربند اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کی دعوت سے بے تعلق نہیں تھا؟

ابو طلحہ نے ام سلیم کے دروازے پر دستک دی اور ام سلیم نے ان کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس وقت ان کا لڑکا انس بھی وہاں موجود تھا۔ ابو طلحہ نے بات چھیڑ دی اور حرف مدعا زبان پر لائے۔ لیکن اس وقت وہ سخت حیران ہوئے جب ام سلیم نے ان کی توقع کے خلاف جواب دیا۔

"ابو طلحہ! آپ جیسے شخص کی بات رد نہیں کی جاتی، لیکن جب تک آپ کفر پر قائم ہیں میں آپ سے نکاح نہیں کر سکتی۔"

ابو طلحہ نے سمجھا کہ ام سلیم بہانہ کر رہی ہیں۔ دراصل وہ کسی ایسے شخص کو میرے اوپر ترجیح دے چکی ہیں جو مال اور افرادی قوت کے لحاظ سے مجھ سے برتر ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔

"ام سلیم! خدا کی قسم میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے انکار کی اصل وجہ یہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے میرے انکار کی اصل وجہ؟" ام سلیم نے پوچھا۔

"سونا چاندی اور مال و دولت۔" ابو طلحہ نے جواب دیا۔

"سونا چاندی؟" ام سلیم نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں" ابو طلحہ نے کہا۔

"ابو طلحہ! میں آپ کو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ اسلام قبول کر لیں تو میں سونا چاندی اور مال و دولت کے بغیر آپ سے نکاح کر لوں گی اور آپ کے اسلام کو اپنا مہر قرار دوں گی۔"

ام سلیمؓ کی یہ بات سن کر ابو طلحہ کا ذہن اپنے بت کی طرف منتقل ہو گیا

جس کو انھوں نے نہایت نفیس اور قیمتی لکڑی سے تراشا تھا اور قبیلے کے دوسرے رئیسوں کی طرح اسے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ لیکن ام سُلیم نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے گرم لوہے پر مزید ضرب لگائی۔

"ابوطلحہ! کیا آپ کو یہ بات نہیں معلوم کہ خدا کو چھوڑ کر آپ جس معبود کی پرستش کرتے ہیں وہ زمین سے اُگا ہوا ہے؟"

"کیوں نہیں، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔" ابوطلحہ کے لہجے میں قدرے ندامت تھی۔

"تو کیا آپ کو کبھی اس بات پر شرمندگی کا احساس نہیں ہوتا کہ درخت کے ایک ٹکڑے کو معبود بنا کر آپ اس کی پوجا کرتے ہیں اور اسی درخت کے دُوسرے ٹکڑے کو کوئی دُوسرا شخص آگ جلانے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کرتا اور اس سے کھانا پکاتا ہے؟" انھوں نے ایک لحظہ رُک کر کہا۔

"ابوطلحہ! اگر آپ مسلمان ہو جائیں تو میں آپ کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے پر راضی ہوں اور اس صورت میں اسلام کے سوا میں آپ سے کسی مہر کا مطالبہ نہیں کروں گی۔" ام سلیمؓ نے آخری اور بھرپور ضرب لگائی۔

"مجھے دائرۂ اسلام میں داخل کون کرے گا۔" ابوطلحہ نے پوچھا۔

"یہ کام میں خود کروں گی۔" حضرت ام سُلیمؓ نے جواب دیا۔

"وہ کس طرح؟" ابوطلحہ نے وضاحت چاہی۔

"وہ اس طرح کہ آپ اپنی زبان سے کلمۂ حق ادا کرتے ہوئے اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ

کے رسُول ہیں۔ پھر آپ اپنے گھر جائیں اور اپنے بُت کو توڑ کر پھینک دیں۔"
حضرت ام سُلیم رضؓ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سُن کر ان کا چہرہ فرطِ مسرت سے جگمگا اٹھا اور وہ بے ساختہ بول پڑے۔
"اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ"۔ اور پھر اُنھوں نے حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ مسلمان اس نکاح کے متعلق کہتے تھے کہ "ہم نے آج تک کسی مہر کے بارے میں نہیں سُنا جو ام سُلیم کے مہر سے زیادہ بہتر اور قیمتی ہو۔ اُنھوں نے اسلام کو اپنا مہر قرار دیا۔"

اور اس روز سے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے اور اُنھوں نے اپنی غیر معمولی اور بے مثال صلاحیتیں اس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ وہ اُن ستّر افراد میں سے تھے جو بیعت عقبہ میں شریک ہوئے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت ام سلیمؓ بھی تھیں۔ وہ ان بارہ آدمیوں میں سے تھے جن کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانانِ یثرب کا نقیب بنایا تھا۔ وہ تمام غزوات میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور ان میں غیر معمولی شجاعت و جواں مردی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا اور ناقابل فراموش دن یومِ اُحد ہے، جس کی روداد نذرِ قارئین ہے۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ ایسی محبت جس کی جڑیں ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتری ہوئی تھیں۔ ایسی محبت جو ان کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتی تھی۔ ان کا حال یہ تھا کہ نہ آپؐ کے چہرہ انور کو دیکھنے سے کبھی آسودہ ہوتے نہ آپؐ کی پیاری باتیں سُننے سے سیراب ہوتے اور جب کبھی تنہائی میں آپؐ

کے پاس ہوتے تو گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہتے ۔
”میری جان آپ پر قربان ہے، میرا چہرہ آپ کے لیے ڈھال ہے“
جنگ اُحد میں جب ایک موقع پر مسلمان آپؐ کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور مشرکین نے ہر طرف سے آپؐ پر دھاوا بول دیا، آپؐ کے دانت توڑ دیے، پیشانی اور ہونٹوں کو زخمی کر دیا اور چہرۂ مبارک کو لہولہان کر دیا یہاں تک کہ دشمنوں نے یہ افواہ اُڑا دی کہ محمدؐ (نعوذ باللہ) قتل کر دیے گئے، جس سے مسلمانوں کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور وہ دشمنوں کے سامنے سے شکست کھا کر بھاگنے لگے۔ اس کٹھن وقت میں رسول اللہؐ کے ساتھ صرف چند آدمی رہ گئے تھے، اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ ان میں پیش پیش تھے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ایک مضبوط اور غیر متزلزل پہاڑ کی طرح کھڑے ہو گئے، اور آپؐ نے کفار کے تیروں اور نیزوں سے بچنے کے لیے ان کی آڑ لے رکھی تھی — انھوں نے کمان کی تانت چڑھائی اور اس پر تیر جوڑ جوڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے کفار پر تیروں کی بارش کر دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پیچھے سے جھانک کر یہ دیکھنے کی کوشش کرتے کہ ان کے تیر کہاں گر رہے ہیں تو وہ زخمی ہونے کے خوف سے یہ کہتے ہوئے، آپؐ کو پیچھے ہٹا دیتے۔
”میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں، ان کی طرف نہ جھانکیں، کہیں وہ آپؐ کو زخمی نہ کر دیں۔ میری گردن آپؐ پر نثار، میری جان آپؐ پر فدا، میں آپ کے آگے سینہ سپر ہوں!“

جس طرح حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جنگ کے مواقع پر بے دریغ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے حاضر رہتے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ

کہ انفاق فی سبیل اللہ کے ہر موقع پر اپنا مال خرچ کرنے میں کبھی کوتاہی سے کام نہیں لیتے تھے۔ انھیں واقع میں سے ایک موقع یہ ہے۔

ان کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ تھا جو اپنے درختوں کی کثرت، پھلوں کی عمدگی اور پانی کی شیرینی کے لحاظ سے یثرب کے تمام باغوں سے اچھا تھا۔ ایک روز حضرت ابو طلحہؓ اس کے گھنے سائے میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ اچانک ایک خوش الحان پرندے نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی جس کے پر سبز، چونچ سرخ اور پاؤں رنگین تھے۔ وہ درختوں کی شاخوں پر خوشی سے چہچہاتا، رقص کرتا اور پھدکتا پھر رہا تھا۔ حضرت ابو طلحہؓ کو یہ منظر اتنا بھلا معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اس کی دل کشی میں کھو گئے۔ جب ان کی توجہ نماز کی طرف واپس آئی تو وہ بھول چکے تھے کہ انھوں نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔ دو؟ تین؟ وہ سوچتے رہ گئے مگر کچھ یاد نہیں آیا۔

وہ نماز ختم کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے اپنے نفس کی شکایت کی جس کو باغ، اس کے گھنے اور سایہ دار درختوں اور اس کے خوش نوا پرندے نے نماز سے غافل کر دیا۔ پھر انھوں نے کہا۔

"اللہ کے رسولؐ! آپ گواہ رہیں، میں اس باغ کو اللہ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں۔ آپؐ اس کو جس مصرف میں چاہیں صرف کریں۔"

حضرت ابو طلحہؓ نے اپنی پوری زندگی صائم النہار اور مجاہد فی سبیل اللہ کی حیثیت سے گزاری اور اسی حالت میں انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تقریباً تیس سال زندہ رہے۔ یہ پوری مدت انھوں نے روزہ کی حالت میں گزاری اور ایام عیدین کے سوا جن کے روزے حرام ہیں ـــ انھوں نے کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔

انھیں کافی طویل عمر ملی تھی جس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن یہ ضعف بھی ان کے جذبۂ جہاد کو سرد نہیں کر سکا۔ وہ بڑی پابندی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کی فوجی مہمات میں شریک ہوتے تھے۔ انھیں میں سے ایک مہم وہ تھی کہ جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں نے بحری جنگ کا ارادہ کیا تو انھوں نے بھی اس میں شرکت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر ان کے لڑکوں نے کہا۔

"ابا جان! اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر صدیق رضؓ اور حضرت عمر فاروق رضؓ کے ساتھ کافی جہاد کر چکے ہیں۔ اب آپ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ عمر جہاد کی نہیں ہے۔ اب آپ آرام کریں اور ہمیں چھوڑ دیں، ہم آپ کی طرف سے جہاد میں حصہ لیں گے۔"

مگر وہ نہیں مانے اور انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اِنفِرُوا خِفَافاً وَّ ثِقَالاً .... "نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل۔" اس نے عمر کی تحدید کے بغیر نکلنے کا حکم دیا ہے، خواہ ہم بوڑھے ہوں یا جوان۔

اور جب حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ بحری جہاز میں سوار، سمندر کا سفر کر رہے تھے ــــ سخت بیمار پڑے اور اسی بیماری میں اپنے رب سے جا ملے۔

انتقال کے بعد ان کو دفن کرنے کے لیے مسلمان کسی جزیرے کی تلاش میں تھے مگر سات روز سے پہلے ان کو اپنے اس مقصد میں کامیابی نہیں

ہوگئی۔ اس دوران ان کی لاش کپڑے سے ڈھکی ہوئی ان کے درمیان رکھی رہی اور اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں واقع ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بڑے آرام سے سو رہے ہیں۔ اور ان کو ان کے اہل و عیال اور ملک و وطن سے بہت دُور سمندر کے درمیان دفن کر دیا گیا۔

اُمّ المومنین حضرت رَملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا

یہ بات تو ابوسفیان بن حرب کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ قریش کا کوئی فرد اس کے کسی فیصلے سے بغاوت یا کسی اہم معاملے میں اس کی مخالفت کرنے کی جرأت کرے گا۔ کیوں کہ وہ مکّے کا ایک ایسا سردار اور قریش کا ایسا لیڈر تھا جس کا ہر فیصلہ واجب التعمیل اور ہر حکم واجب الاطاعت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی اپنی ہی بیٹی رملہ نے ـــــ جو اپنی کنیت ام حبیبہ سے معروف تھی ـــــ اس کے باطل معبودوں کی الوہیت سے انکار کر کے اس کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی۔ نیز اس نے اور اس کے شوہر عبیداللہ بن جحش نے خدائے واحد پر ایمان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کی تصدیق کا اعلان کر کے اس کی چودھراہٹ کا سارا بھرم کھول کر رکھ دیا۔

ابوسفیان نے اپنی بیٹی اور داماد کو ان کے دین سے پھیر کر اپنے اور اپنے آبار و اجداد کے دین میں واپس لانے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے لیے اس نے اپنا ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کر ڈالا مگر اس کی ساری ہیکڑی دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا کیونکہ ایمان جو رملہ کے دل میں راسخ ہو چکا تھا، اس کی جڑیں اتنی گہرائی میں اُتر چکی تھیں کہ ابوسفیان کے غیظ و غضب کی آندھیاں اسے اکھاڑ تو کیا سکتیں،

اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکیں۔

ابوسفیان کو رملہ کے مسلمان ہو جانے کا بڑا شدید قلق تھا۔ اور اپنی بیٹی کو اپنے منشار کے مطابق مجبور کرنے اور اس کو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر متبعین کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس مُنہ سے قریش کا سامنا کرے۔

جب قریش نے یہ دیکھا کہ ابوسفیان، رملہ اور اس کے شوہر پر ناراض ہے تو وہ ان دونوں کے خلاف جری ہو گئے، وہ ان کو سخت اور اذیت ناک سزائیں دیتے اور ان کے گرد زندگی کا دائرہ روز بروز تنگ کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کے لیے مکّے میں زندگی گزارنا دوبھر ہو گیا۔ اور جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت مرحمت فرمائی تو رملہ بنت ابوسفیانؓ، ان کا شوہر عبیداللہ بن جحش اور ان کی چھوٹی بچی حبیبہ مہاجرین کے اُس قافلے میں پیش پیش تھے جس نے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے نجاشی کی حمایت حاصل کی تھی۔

لیکن مسلمانوں کی اس مختصر سی جماعت کا ان کے ہاتھ سے بچ نکلنا اور حبشہ میں اس کا آرام و سکون سے رہنا ابوسفیان اور اس کے ہم خیال دوسرے زعمائے قریش کو سخت ناگوار گزرا، اس لیے انھوں نے نجاشی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے، ان کی واپسی کا مطالبہ کرنے اور اس کو یہ باور کرانے کے لیے کہ یہ لوگ عیسٰی ابنِ مریمؑ اور ان کی والدہ مریمؑ کے متعلق نہایت ناپسندیدہ بات کہتے ہیں ـــــ اپنے سفیروں کو حبشہ بھیجا۔

نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور ان سے ان کے دین کی حقیقت اور اس بات کی اصلیت دریافت کی جو وہ عیسٰی مسیحؑ اور ان کی والدہ کے متعلق کہتے

ہیں۔ اُس نے مسلمانوں سے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ وہ قرآن کے کچھ اجزاء اسے سُنائیں جو ان کے نبی کے قلب پر نازل ہوتا ہے۔ جب مسلمانوں نے اس کے سامنے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن کریم کی چند آیات اسے سُنائیں تو وہ اتنا متاثر ہوا کہ روتے روتے اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر اس نے مسلمانوں سے کہا۔

"یہ کلام جو تمہارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ جس کو عیسٰی ابن مریمؑ لائے تھے ـــ دونوں ایک ہی نور کی شعاعیں ہیں"

اور پھر وہ خدائے واحد پر ایمان اور نبوت محمدیہ کی تصدیق کا اعلان کرکے دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔ اس موقع پر اس نے ان مسلمانوں کے لیے اپنی حمایت کا اعلان بھی کیا جو ہجرت کرکے اس کے ملک میں آئے تھے۔ اس معاملے میں اس نے اپنے سرداروں کی مخالفت کی کوئی پرواہ نہیں کی جنھوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے دین نصرانیت پر قائم رہے۔

اس کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے سمجھا کہ طویل پریشانیوں کے بعد اب حالات ان کے لیے سازگار ہوگئے ہیں اور آلام و مصائب کے اس دُشوار گزار سفر نے ان کو امن وامان کے گہوارے میں پہنچا دیا ہے مگر وہ حالات ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے جنھیں نوشتۂ تقدیر نے ان کے لیے چھپا رکھا تھا۔

اللہ تعالٰی نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو ایک ایسے مشکل امتحان میں ڈالنا چاہا جس میں بڑے بڑے ارباب عقل ودانش حیران و سرگشتہ ہوکر رہ جائیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی چاہا کہ ان کو اس سخت ترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ نکال کر فوز وفلاح کی بلند ترین چوٹی پر پہنچا دے۔

چنانچہ ایک رات حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ ان کا شوہر عبید اللہ بن جحش ایک ایسے بحرِ مواج کی سرکش موجوں میں پھنسا ہوا ان سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جس پر تہ بہ تہ تاریکیاں مسلط ہیں اور وہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں گرفتار ہے۔

خوف اور اضطراب کی وجہ سے ان کی نیند کھل گئی۔ اس خواب کا ذکر وہ اپنے شوہر یا کسی دوسرے شخص سے کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن وہ خواب بہت جلد ایک حقیقت کی شکل میں ان کے سامنے آگیا۔ اس منحوس رات کی صبح ابھی شام سے تبدیل نہیں ہونے پائی تھی کہ عبید اللہ بن جحش نے اپنے دین سے مرتد ہو کر نصرانیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد اس کا زیادہ تر وقت شراب خانوں میں گزرنے لگا۔ اس کثرت کے ساتھ شراب نوشی کے باوجود وہ اس سے آسودہ نہیں ہوتا تھا۔ اس نے حضرت ام حبیبہؓ کو دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کی آزادی دے دی جو دونوں ہی انتہائی ناپسندیدہ تھیں یعنی یا تو وہ طلاق لے لیں یا نصرانیت اختیار کریں۔

حضرت ام حبیبہؓ نے خود کو اچانک تین مشکلات میں محصور پایا۔ یا تو وہ اپنے شوہر کی بات مان لیں ـــ جو مسلسل انھیں نصرانیت کی دعوت دے رہا تھا۔ اور اس طرح (العیاذ باللہ) اپنے دین سے پھر جائیں اور دنیا و آخرت کی ذلت و رسوائی سے دو چار ہوں۔ اور یہ ایسا کام تھا جس کو وہ کسی قیمت پر نہیں کر سکتی تھیں چاہے اس کے نتیجے میں ان کے جسم کا گوشت پوست لوہے کی کنگھیوں کے ذریعہ ان کی ہڈیوں سے کھرچ کر الگ کر دیا جاتا۔ یا وہ مکہ میں اپنے والد کے گھر واپس چلی جائیں اور وہاں ایسی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں جس میں ان کو اپنے دین پر عمل کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ کیونکہ مکہ ابھی

تک کفر و شرک کا گڑھ تھا۔ یا پھر وہ تنہا اور بے یار و مددگار سرزمین حبشہ میں ٹھہری رہیں۔ انھوں نے اللہ عزوجل کی رضا، کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہوئے تیسری اور آخری شکل کو ترجیح دی اور خدائے تعالیٰ کی طرف سے آسانی و کشادگی کی اُمید پر حبشہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔

حضرت ام حبیبہؓ نے اللہ تعالیٰ سے جس کشادگی کی توقع کی تھی اس کے لیے انھیں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ اُن کے شوہر کی عدتِ وفات سے فارغ ہوتے ہی ـــ جو ارتداد کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکا تھا ـــ بالکل غیر متوقع طور پر اُن کے پاس ان کی خوش نصیبی کا پیغام آپہنچا۔

ایک روز چاشت کے وقت جب دن خوب روشن ہوچکا تھا اور سورج کی رُوپہلی کرنوں نے زمین کو چاندی کا لباس پہنادیا تھا ـ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ جب انھوں نے دروازہ کھولا تو اچانک اپنے سامنے نجاشی کی خادمۂ خاص "ابرہہ" کو دیکھ کر مبہوت رہ گئیں۔ ابرہہ نے بڑے ادب اور خندہ جبینی کے ساتھ سلام کرکے اندر آنے کی اجازت مانگی اور کہا۔

"بادشاہ سلامت آپ کو سلام کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیجا ہے اور ایک خط کے ذریعے اُن کو اپنا وکیل بنایا ہے، تو آپ بھی اپنی طرف سے کسی کو وکیل مقرر کر دیجیے۔"

یہ سُن کر حضرت ام حبیبہؓ خوشی سے پھُولی نہ سمائیں اور بے ساختہ بول پڑیں۔

"بَشَّرَكِ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ........ "اللہ تم کو خوش رکھے۔ اللہ تم کو خوش
بَشَّرَكِ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ. خبری سنائے۔"

پھر اپنے جسم سے ایک ایک کر کے تمام زیورات اُتارنے لگیں۔ انھوں نے اپنے کنگن اتار کر ابرہہ کو دے دیے۔ پھر پازیب، پھر دونوں کانوں کی بالیاں اور انگوٹھیاں اس کو دیدیں۔ اور اگر اس وقت ان کے پاس دنیا کے سارے خزانے ہوتے تو وہ سب ابرہہ کو بخش دیتیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ میں خالد بن سعید بن عاص کو اپنا وکیل بناتی ہوں کیونکہ وہ میرے قریب ترین رشتہ دار ہیں۔

نجاشی کا رہائشی محل درختوں سے گھرے ہوتے ایک بلند ٹیلے پر واقع تھا اور اس کے نشیب میں حبشہ کا سب سے خوب صورت باغ اس کے حسن کو دو بالا کر رہا تھا۔ اُسی محل کے ایک وسیع و عریض ہال میں ـــــ جو نہایت خوبصورت نقش و نگار سے آراستہ اور پیتل کے سنہرے چمکیلے چراغوں کی روشنی سے منور ہو رہا تھا، جس میں قیمتی اور نفیس فرش بچھا ہوا تھا ـــ حبشہ میں مقیم صحابۂ کرام، حضرت جعفر بن ابی طالبؓ، حضرت خالد بن سعید بن عاصؓ اور حضرت عبداللہ ابن حُذافہ سہمیؓ وغیرہم، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منعقد ہونے والے ام حبیبہ بنت ابی سفیان کے نکاح میں شرکت کے لیے جمع تھے۔ جب سب لوگ آ چکے تو نجاشیؓ نے جو مجلس کے صدر نشین تھے ـــــ خطبہ دیتے ہوتے کہا۔

"میں شکر ادا کرتا ہوں اُس خدائے بزرگ و برتر کا. جو ہر قسم کے عیوب سے پاک، اپنے بندوں کو امن و اطمینان بخشنے والا اور لامحدود طاقت و قوت کا سرچشمہ ہے۔ اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ خدائے وحدہٗ لا شریک کے سوا کوئی دوسرا بندگی اور عبادت کا حقدار نہیں ہے۔ اور اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور اس

بات کی کہ وہ اُنھیں کی ذاتِ پاک ہے جس کی بشارت عیسٰی ابن مریمؑ نے دی تھی۔

امابعد! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کو ان کے عقد میں دیدوں۔ سو میں آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں اور اُن کی طرف سے ام حبیبہؓ کو چار سو طلائی دینار بطور مہر ادا کرتا ہوں۔

اور اُنھوں نے دینار حضرت خالد بن سعیدؓ کے سامنے ڈھیر کر دیے۔

اس کے بعد حضرت خالد بن سعیدؓ بن عاص کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے اپنے جوابی خطبے میں فرمایا۔

"ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ میں اسی کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی سے اعانت طلب کرتا ہوں، اسی سے استغفار کرتا ہوں اور اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت اور حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دیں، خواہ یہ بات کفار کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔

امابعد! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بجالاتا ہوں اور اپنی مؤکلہ ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کو ان کے نکاح میں دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو ان کی بیوی میں برکت عطا فرمائے اور ام حبیبہ کو وہ خیر و برکت مبارک ہو جو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں لکھ دی تھی۔"

پھر جب حضرت خالد بن سعیدؓ دیناروں کو اُٹھا کر کھڑے ہو گئے تاکہ

انھیں حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے یہاں پہنچادیں اور ان کے ساتھ ہی دُوسرے صحابۂ کرامؓ بھی واپسی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تو نجاشیؓ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"آپ سب حضرات ابھی تشریف رکھیں۔ کیونکہ انبیاء کرام کی سنّت یہ ہے کہ جب وہ نکاح کرتے ہیں تو کھانا کھلاتے ہیں۔"

پھر انھوں نے کھانا منگوایا۔ اور سب لوگ اس سے فارغ ہوکر اپنی قیام گاہوں کی طرف لوٹ گئے۔

حضرت ام حبیبہؓ کہتی ہیں۔

"جب مہر کی رقم میرے پاس پہنچی تو میں نے اس میں سے پچاس مثقال[1] سونا ابرہہ کے یہاں بھیج دیا اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی کہلا دیا کہ خوش خبری دیتے وقت میں نے تم کو جو کچھ دیا تھا وہ اس حال میں دیا تھا کہ میرے پاس اس وقت تم کو دینے کے لیے اور کچھ نہیں تھا...... تھوڑی دیر بعد ابرہہ میرے پاس آئی اور اس نے وہ سونا جو میں نے اس کے پاس بھیجا تھا، واپس کردیا۔ پھر اس نے ایک ڈبہ نکالا جس میں میرے دیے ہوئے زیورات تھے۔ اُس نے وہ سارے زیورات بھی یہ کہتے ہوئے مجھے لوٹا دیے کہ بادشاہ نے مجھے آپ سے کچھ لینے کو سختی سے منع کیا ہے۔ اور انھوں نے اپنی تمام بیگمات کو حکم دیا ہے کہ اُن کے پاس جتنی خوشبو ہو، وہ سب آپ کے پاس بھیج دیں۔ اور اگلے روز ابرہہ میرے پاس زعفران، عُود و عنبر لے کر آئی۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، میرے دریافت کرنے پر اس نے

---

[1] ایک مثقال = $1\frac{1}{2}$ تولہ

بتایا کہ میں نے اسلام قبول کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ تو آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا سلام پہنچا دیجئے گا اور ان کو بتا دیجئے گا کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکی ہوں۔ اس کو بھولیے گا مت۔ پھر اس نے میری روانگی کا انتظام کیا۔ اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روانہ کر دی گئی۔

جب میری ملاقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تو میں نے نکاح کی پوری روداد آپ کو سنائی اور جو کچھ میں نے ابرہہ کے ساتھ کیا تھا، اس سے بھی آپ کو آگاہ کیا اور اس کا سلام بھی آپ کو پہنچا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی باتیں سن کر نہایت خوشی کا اظہار کیا اور اس کے سلام کے جواب میں فرمایا۔

وَعَلَيْهَا السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وبركاتهٗ۔

حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہٗ

یہ کون شخص ہے جس نے غزوۂ اُحد میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم حضرت حمزہؓ ابن عبد المطلب کو شہید کر کے آپؐ کے قلبِ مبارک کو زخمی کر دیا تھا؟ پھر جنگِ یمامہ میں مُسیلمہ کذّاب کو واصلِ جہنم کر کے مسلمانوں کے دلوں پر خنک مرہم رکھا تھا؟ یہ ہیں حضرت وحشی ابن حرب حبشی رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابو دسمہ ہے۔

حضرت وحشیؓ کی داستان بڑی ہی سنگ دلانہ، غم انگیز اور خوں چکاں داستان ہے۔ آیئے ہم اس داستان کو انھیں کی زبانی سُنیں۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

"میں قریش کے ایک سردار جُبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ جبیر کا چچا طُعیمہ ابن عدی جنگِ بدر میں حمزہ ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ جبیر کو اپنے چچا کے قتل ہونے کا بے انتہا صدمہ تھا اور اُس نے لات و عُزّیٰ کی قسم کھائی تھی کہ اپنے چچا کے انتقام میں ان کے قاتل کو ضرور قتل کروں گا اور اس کے لیے وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اور اس کے لیے اسے زیادہ عرصے تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیوں کہ قریش نے محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر فیصلہ کن ضرب لگانے اور مقتولینِ بدر کا انتقام لینے کے لیے بہت جلد اُحد کی طرف کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے فوجی دستوں

کو منظم کرنے، اپنے حلیفوں کو جمع کرنے اور سامانِ جنگ کی فراہمی کے بعد
اس فوج کی قیادت ابوسفیان ابن حرب کے سپرد کر دی۔ اور ابوسفیان
نے اُن عورتوں کی ایک ٹولی کو بھی فوج کے ساتھ شامل کر لیا جن کے باپ،
بیٹے، بھائی یا دوسرے قریبی اعزہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے
تھے۔ تاکہ وہ فوج کو جوش دلائیں اور اس کے لیے فرار کی راہیں مسدود کر دیں۔
ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ ان عورتوں میں سب سے پیش پیش تھی
کیونکہ اس کا باپ، چچا، اور بھائی تینوں جنگِ بدر میں مارے گئے تھے۔
جب فوج کی روانگی کا وقت قریب آیا تو جبیر بن مطعم نے مجھے مخاطب
کرتے ہوئے کہا۔

"ابو دسمہ! کیا تم اپنے آپ کو غلامی کی زنجیر سے آزاد کرانا چاہتے ہو؟
"کیوں نہیں، لیکن میرے لیے اس کا ذمہ کون لے گا؟" میں نے پوچھا۔
"میں تمہارے لیے اس کا ذمہ لیتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔
"وہ کس طرح؟" میں نے پھر سوال کیا۔
اگر تم میرے چچا طُعیمہ ابن عدی کے بدلے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کے چچا حمزہ ابن عبدالمطلب کو قتل کر دو تو تم آزاد ہو۔" اُس نے وعدہ
کرتے ہوئے کہا۔

"اور اس وعدے کی تکمیل کا ضامن کون ہوگا؟" میں نے مزید
اطمینان چاہا۔

"جس کو تم چاہو، میں تمام لوگوں کو اس پر گواہ بنا سکتا ہوں۔" اس نے
اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ کام کر سکتا ہوں، میں یہ کام ضرور کروں گا۔" میں نے

فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
حضرت وحشیؓ اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔
"میں ایک حبشی شخص ہوں اور حربہ پھینکنے میں اتنا ماہر ہوں کہ میرا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ میں اپنا حربہ لے کر فوج کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ میں فوج کے پچھلے حصّے میں عورتوں کے قریب چل رہا تھا کیونکہ لڑائی سے مجھے کوئی دلچسپی یا رغبت نہیں تھی۔ جب بھی میرا گزر ہند بنتِ عتبہ کی طرف یا اس کا گزر میری طرف سے ہوتا اور وہ سُورج کی روشنی میں چمکتے ہوئے حربے کو میرے ہاتھ میں دیکھتی تو کہتی۔
"ابو دسمہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے چچا کو قتل کر کے ہمارے دلوں میں بھڑکتے ہوئے غیظ و غضب کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دے۔"
اُحد پہنچ کر جب دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی اور گھمسان کا رَن پڑنے لگا تو میں حمزہ ابن عبدالمطلب کی تلاش میں نکلا۔ میں ان کو پہلے سے جانتا تھا، اور یوں بھی ان کی شخصیت ایسی نہیں تھی کہ کسی پر مخفی رہتی کیونکہ شجاعانِ عرب کے دستور کے مطابق امتیازی نشان کے طور پر وہ اپنے سر پر شترمرغ کے پروں سے بنی ہوئی کلغی لگاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ وہ رجز پڑھتے، اپنی تلوار سے مخالفین کے پرخچے اُڑاتے مضبوط خاکستری اونٹ کی طرح بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی ہیبت اور قوت کا یہ حال تھا کہ نہ کسی کے اندر اتنی ہمت تھی کہ ان کا سامنا کرتا نہ کسی میں یہ طاقت تھی کہ ان کے بالمقابل ثابت قدم رہتا۔ میں ایک درخت یا چٹان کی اوٹ میں بیٹھا ان کے اوپر وار کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور ان کے قریب آنے کا منتظر تھا۔ اتنے میں قریش کا ایک مشہور شہسوار سباع بن عبدالعزّیٰ

آگے بڑھا اور اس نے حمزہ کو للکارتے ہوئے کہا۔

"حمزہ! ہمت ہو تو میرے سامنے آؤ۔" اور حمزہ یہ کہتے ہوئے اس کے مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔

"ادھر آ مشرکہ کے بچے، ادھر میری طرف آ۔" اور چشم زدن میں ان کی شمشیر خاراشگاف کی ایک کاری ضرب نے اُس کے ٹکڑے اُڑا دیے اور وہ زمین پر گر کے ان کے سامنے اپنے خون میں تڑپنے لگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ گھات سے باہر نکلا اور ایک مناسب جگہ پر کھڑے ہو کر اپنے حربے کو ہاتھ میں لیا، اسے تھوڑی سی حرکت دی اور صحیح نشانہ لے کر ان کی طرف پھینک دیا جو ان کی ناف کے نیچے لگا اور دونوں پیروں کے درمیان سے پار ہو گیا۔ زخم کھا کر وہ میری جانب بڑھے، بڑی مشکل سے دو قدم چلے لیکن زخم کی تاب نہ لا کر گر پڑے۔ حربہ ابھی ان کے جسم میں تھا۔ میں نے ان کو یوں ہی چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ جب مجھ کو ان کی موت کا یقین ہو گیا تو ان کے قریب گیا اور حربے کو ان کے جسم سے نکال کر واپس جا کر خیمے میں بیٹھ گیا کیونکہ میں اپنی آزادی کی قیمت چکانے کے لیے حمزہ کو قتل کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔

پھر جب معرکۂ کارزار پوری طرح گرم ہو گیا اور طرفین کی طرف سے حملوں میں کافی تیزی آگئی تو تھوڑی دیر بعد جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، مسلمانوں کی کشتی جنگ کے گرداب میں پھنس گئی اور ان کے بہت سے آدمی مارے گئے ــــ اس وقت ہند بنتِ عتبہ اور اس کے ساتھ کی دوسری قریشی عورتوں نے مسلمان مقتولین کی لاشوں پر پہنچ کر ان کا مُثلہ کرنا شروع کر دیا۔ اُنھوں نے ان کے پیٹ چاک کر ڈالے، آنکھیں نکال لیں اور ناک کان کاٹ لیے۔ پھر اُن

کاٹے ہوئے اعضاء کو دھاگوں میں پرو کر ان سے ہار اور بالیاں بنائیں اور انھیں اپنے گلوں اور کانوں کی زینت بنا لیا۔ اور اپنے سونے کے زیورات نکال کر یہ کہتے ہوئے میرے حوالے کر دیے کہ

"ابو دسمہ! اب یہ تمہارے ہیں۔ ان کو حفاظت سے رکھنا یہ نہایت قیمتی ہیں۔"

جنگ ختم ہو جانے کے بعد میں فوج کے ساتھ مکے واپس لوٹ آیا اور جبیر ابن مطعم نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے مجھے آزاد کر دیا۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دین، دن دونی، رات چوگنی ترقی کرتا اور ان کے متبعین کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور جوں جوں ان کا معاملہ مستحکم اور مضبوط ہو رہا تھا ـــ میری گھبراہٹ اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور حالات کا دائرہ میرے گرد تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ میں انھیں پریشان کن حالات میں گھرا رہا یہاں تک کہ وہ وقت بھی آ گیا جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر جرار کے ساتھ فاتحانہ طور پر مکے میں داخل ہو گئے۔ اس وقت میں پناہ کی تلاش میں طائف کی طرف بھاگ گیا لیکن طائف والے بھی زیادہ دیر تک اُن کا مقابلہ نہیں کر سکے انھوں نے جلد ہی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی اطاعت اور دینِ اسلام میں اپنے دخول کا اعلان کرنے کے لیے ایک وفد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس وقت میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور میری ندامت اور پشیمانی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اب زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود میرے لیے تنگ ہو چکی تھی۔ اور نجات کے تمام راستے میرے سامنے مسدود ہو کر رہ گئے تھے۔ میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اب میرے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں شام، یمن یا کسی دور ملک میں چلا جاؤں۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں مبتلا تھا کہ میرے ایک بہی خواہ

نے ترس کھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"وحشی! خدائے تعالیٰ تمہارے حال پر رحم کرے۔ خدا کی قسم، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے جو ان کا دین قبول کرکے کلمۂ توحید و رسالت کا اقرار کر لیتا ہے۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملنے کے ارادے سے یثرب کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اُن کا پتہ کیا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ اس وقت مسجد میں ہیں تو میں چپکے سے مسجد میں داخل ہوا اور احتیاط سے چلتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا اور بلند آواز سے پکار اٹھا۔ "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ" ——— شہادتین کے الفاظ سن کر انھوں نے اپنی نگاہیں میری طرف اٹھائیں اور مجھے پہچاننے کے بعد نظریں پھیرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم وحشی ہو؟"

"ہاں، اے اللہ کے رسولؐ!" میں نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

"اچھا، بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ تم نے حمزہ کو کس طرح قتل کیا تھا۔" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

حکم پاکر میں وہیں بیٹھ گیا اور شروع سے آخر تک حمزہ کے قتل کا واقعہ بیان کر دیا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو انھوں نے میری طرف سے اپنا چہرہ پھیرتے ہوئے کہا۔

"وحشی! اللہ تمہارا بھلا کرے، اپنا چہرہ مجھ سے پوشیدہ رکھنا۔ آج کے بعد سے میں تم کو دیکھنا نہیں چاہتا۔"

اور اس روز سے میں اس بات کی پوری احتیاط کرنے لگا کہ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میرے اُوپر نہ پڑ سکے۔ چنانچہ جہاں تمام صحابۂ کرامؓ آپؐ کے رُوبرُو بیٹھتے تھے، میں اپنی نشست ہمیشہ آپؐ کے پیچھے رکھتا تھا۔ جب تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان رہے، میں اسی طریقے پر کاربند رہا۔"

حضرت وحشیؓ اپنے سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اسلام تمام سابقہ گناہوں پر خطِ معافی کھینچ دیتا ہے مگر اس کے باوجود جس ناپسندیدہ فعل کا میں مرتکب ہو چکا تھا اور جس زبردست مصیبت سے میں اسلام اور اہلِ اسلام کو دوچار کر چکا تھا، اس کی قباحت کا شدید احساس مجھے شب و روز بے چین رکھتا اور میں ہر وقت کسی ایسے مناسب موقع کی تلاش میں رہتا، جس سے فائدہ اٹھا کر اپنی اُس غلطی کی تلافی کر سکوں جس کا صدور مجھ سے ماضی میں ہو چکا تھا۔

رسُولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب مُسلمانوں کی خلافت کی باگ ڈور آپؐ کے ساتھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی اور دوسرے مرتدین کے ساتھ مُسیلمہ کذاب کے حامیوں نے بھی ارتداد کی راہ اختیار کی اور خلیفۂ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُسیلمہ سے جنگ کرنے اور اس کے قبیلہ ــ بنو حنیفہ ــ کو خدا کے دین کی طرف واپس لانے کے لیے ایک فوج تیار کی تو میں نے اپنے دل میں کہا۔

"وحشی! خدا کی قسم یہ تمہارے لیے تلافیٔ مافات کا بہترین موقع ہے، اس سے فائدہ اُٹھاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سُنہرا موقع تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ۔"

میں نے اپنا وہی حربہ جس سے سیّد الشہداء حضرت حمزہ ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ

کو قتل کیا تھا۔ ساتھ لیا اور لشکرِ مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس وقت میں نے یہ بات اپنے دل میں ٹھان لی تھی کہ یا تو اسی حربے سے مُسیلمہ کذاب کو قتل کر دوں گا یا شہادت کی دولت سے سرفراز ہو جاؤں گا۔ چنانچہ جب مسلمان مجاہدین مسیلمہ کذاب اور اس کے لشکر کا تعاقب کرتے ہوئے حدیقۃ الموت میں داخل ہو گئے، اور وہاں دشمنانِ خدا سے فیصلہ کن اور گھمسان کی جنگ لڑنے لگے تو میں مسیلمہ کی تاک میں لگ گیا۔ آخر میری نظر اس پر جا پڑی میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھ میں تلوار لیے ایک جگہ کھڑا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ بالکل میری ہی طرح ایک انصاری نوجوان بھی اس کی گھات میں لگا ہوا ہے۔ ہم دونوں ہی اس کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک مناسب جگہ پر کھڑے ہو کر اس کو اپنی زد میں لیا اور اپنے حربے کو ہلا کر اس کی جانب پھینک دیا، جو ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ ٹھیک اسی لمحے میں جب میں نے اپنا حربہ مُسیلمہ کی طرف اُچھالا تھا، اُس انصاری نوجوان نے بھی اُس کے اُوپر چھلانگ لگائی تھی اور تول کر تلوار کا ایک بھر پور ہاتھ مارا تھا۔ اب یہ بات خدائے تعالیٰ ہی کے علم میں ہے کہ ہم دونوں میں سے کس نے اس کو قتل کیا۔ اگر اس کا قاتل میں ہوں تو پھر میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہترین انسان کو قتل کرنے کے بعد سب سے بدترین شخص کو قتل کر کے میں نے اس کی تلافی کر دی ہے۔"

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ

کیا اِس صحابی کی خبر آپ کو پہنچی ہے؟ تاریخ نے اپنے ریکارڈ میں یہ بات محفوظ کرلی ہے کہ یہ واحد شخص ہیں جن کی پیدائش خانہ کعبہ میں ہوئی تھی۔ان کی ولادت کا قصہ مختصراً یہ ہے

ایک روز جب وہ کسی تیوہار کے موقع پر عوام کے لیے کھلا ہوا تھا، اُن کی والدہ غم غلط کرنے اور جی بہلانے کے خیال سے اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ خانہ کعبہ میں داخل ہوئیں۔اس وقت وہ حاملہ تھیں اور حمل کی مدت پوری ہوچکی تھی۔ خانہ کعبہ کے اندر ہی یکایک ان کو اس شدّت کا دردِ زہ شروع ہوگیا کہ اس میں سے باہر نہ نکل سکیں۔آخرکار ان کے لیے چمڑے کا ایک فرش لاکر بچھا دیا گیا جس پر انھوں نے اپنے بچے کو جنم دیا۔ اور وہ بچہ تھا حکیم ابن حزام جو ام المومنین حضرت خدیجہ بنتِ خُویلد کا بھتیجہ تھا۔

حضرت حکیمؓ بن حزام کی نشو و نما ایک ایسے اعلیٰ اور شریف خاندان میں ہوئی تھی جو زبردست اثر و رسوخ اور غیر معمولی دولت و ثروت کا مالک تھا۔ اس کے علاوہ ذاتی طور پر بھی وہ نہایت عقلمند، شریف اور فاضل شخص تھے۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے قبیلے والوں نے ان کو اپنا سردار منتخب کرلیا اور رفادہ کا اہم منصب ان کے حوالے کردیا تھا۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت میں وہ اپنے ذاتی مال میں سے کافی رقم بیت اللہ کے اُن حُجاج پر خرچ کرتے تھے جو زادِ راہ

اور سواری سے محروم ہوتے۔

حضرت حکیمؓ بن حزام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر فائز ہونے سے قبل آپؐ کے بڑے گہرے دوست تھے اگرچہ عمر میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ سال بڑے تھے مگر اس کے باوجود انھیں آپؐ سے غیر معمولی انسیت اور محبت تھی۔ آپؐ کے ساتھ رہ کر اور آپؐ کی مجلس میں بیٹھ کر انھیں بے انتہا مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پھوپھی حضرت خدیجہ بنتِ خویلد رضی اللہ عنہا سے شادی کر لی تو دوستی پر رشتہ داری کا اضافہ بھی ہو گیا جس نے ان دونوں کے تعلقات کو مزید مستحکم کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حکیم بن حزام کے اُن گوناگوں اور ہمہ جہتی تعلقات کو جاننے کے بعد جن کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے، جب یہ بات آپ کے علم میں آئے گی کہ وہ فتح مکہ کے موقع پر اس وقت مشرف بہ اسلام ہوئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بیس سال سے زیادہ کی مدت گزر چکی تھی تو آپ محو حیرت رہ جائیں گے، کیونکہ حکیم بن حزام جیسے آدمی سے جس کو اللہ تعالیٰ نے دانش مندی اور بالغ نظری سے نوازا ہو، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قریبی رشتہ داری کی خصوصیت حاصل ہو، بجا طور پر اس بات کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ رسول اللہؐ پر ایمان لانے والوں، ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والوں اور ان کے طریقے کی پیروی کرنے والوں کی صفِ اول میں ہوں گے۔ لیکن بہر حال یہ اللہ کی مشیت تھی اور وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

اور جس طرح حضرت حکیم بن حزام کا اسلام میں پیچھے رہ جانا ہمارے لیے باعثِ تعجب ہے اسی طرح خود ان کے لیے بھی یہ بات انتہائی باعثِ حیرت

تھی۔ جب سے وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر لذّتِ ایمان سے آشنا ہوئے تھے، اپنی زندگی کے ان لمحات پر مسلسل پچھتاتے اور ندامت کے آنسو بہاتے رہے جو شرک باللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں گزرے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ایک دن ان کے بیٹے نے ان کو روتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"ابا جان! کیا چیز آپ کو رُلا رہی ہے؟"

"بہت سی باتیں ہیں بیٹے! اور وہ سب مجھے رونے پر مجبور کر رہی ہیں۔" انھوں نے بڑی حسرت سے کہا۔ "ان میں سے سب سے پہلی بات ہے اسلام میں میرا پچھڑ جانا جس کی وجہ سے بہت سے ایسے زرّیں مواقع میرے ہاتھ سے نکل گئے کہ اب اگر دنیا کی ساری دولت بھی خرچ کر دوں تو ان کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ پھر یہ بات کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر اور اُحد سے مجھے نجات دی تو اُس وقت میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کسی بھی موقع پر قریش کے ساتھ نہ کسی قسم کا کوئی تعاون کروں گا نہ مکے سے باہر نکلوں گا۔ مگر افسوس، قریش کی مدد کے لیے مجھے برابر گھسیٹا جاتا رہا۔ پھر یہ بات کہ جب بھی میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرتا، میری نگاہیں قریش کے ان اہم اور سربرآوردہ لوگوں کی طرف اُٹھ جاتیں جو عمر میں مجھ سے بڑے اور قدر و منزلت میں مجھ سے فائق تر تھے۔ میں دیکھتا کہ وہ لوگ جاہلی دین اور اس کے طور طریقوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں۔ اور اس وقت میں خود کو ان کی تقلید پر مجبور پاتا تھا۔ کاش کہ میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ ہم کو تو بس ہمارے آباء و اجداد اور سرداروں کی اندھی تقلید ہی نے تباہی کے گڑھے میں گرایا ہے۔ تو میرے

بیٹے! بتاؤ کہ میں ان حالات میں کیوں نہ روؤں؟"

اور حکیم بن حزام کا اسلام کی راہ میں پیچھے رہ جانا جس طرح ہمارے اور خود ان کے لیے وجہِ حیرت تھا، اسی طرح یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی حیران کُن تھی کہ کوئی شخص جو حکیم بن حزام جیسی عقل و فہم سے آراستہ ہو، اسلام کی خوبیوں سے نابلد کیسے رہ گیا۔ آپؐ ان کے اور ان جیسے چند دوسرے لوگوں کے متعلق توقع رکھتے تھے کہ یہ لوگ اسلام قبول کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں گے۔ چنانچہ فتحِ مکہ سے ایک رات پہلے آپؐ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا تھا۔

مکے میں چار اشخاص ایسے ہیں جن کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ انھیں شرک سے دُور اور اسلام سے قریب ہونا چاہیئے تھا۔" اور یہ پوچھنے پر کہ وہ کون لوگ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا تھا۔

" وہ ہیں عتّاب بن اُسَید، جُبَیر بن مُطعِم، حکیم بن حزام اور سہیل بن عمرو۔"
اور خدا کے فضل سے یہ چاروں حضرات اسلام قبول کرکے اس کے دست و بازو بن گئے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے تو آپؐ نے حکیم بن حزامؓ کی عزت افزائی کے لیے اپنے مُنادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا۔

"• جو شخص اس بات کی شہادت دے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ مامون ہے۔

• جو شخص کعبہ کے پاس بیٹھ جائے اور اپنے ہتھیار اُتار کر رکھ دے، وہ بھی مامون ہے۔

• جوکوئی اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کرلے، وہ محفوظ ہے۔
• جو آدمی ابوسفیان بن حرب کے گھر میں داخل ہو جائے، اس کو امان ہے۔
• اور جو آدمی حکیم بن حزام کے گھر میں داخل ہو جائے، اُس کو بھی امان ہے۔"

حکیم بن حزام کا مکان مکہ کے نشیبی حصّے میں اور ابوسفیان کا مکان اس کے بالائی حصّے میں واقع تھا۔

حضرت حکیمؓ بن حزام نے اسلام قبول کیا تو اس شان سے کہ وہ ان کے دل ودماغ پر حاوی ہوگیا اور انھوں نے ایمان کو اپنایا تو اس انداز سے کہ وہ ان کے رگ وپے میں سرایت کرگیا اور ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوگیا۔ اور انھوں نے اس بات کا عزم مصمم کرلیا کہ زمانۂ جاہلیت میں جو موقف بھی انھوں نے اپنائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں جو اخراجات بھی اُنھوں نے کیے تھے، اُن سب کی چند در چند تلافی کر کے رہیں گے۔ اور واقعی انھوں نے اپنے اس عزم کو پورا کر کے دکھا دیا۔

• دارالندوہ ـــــ جس کی بڑی زبردست تاریخی اہمیت تھی، جس میں جاہلیت کے زمانے میں قریش اپنی مشاورتی مجلسیں منعقد کرتے تھے اور جس میں سردارانِ قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشیں کرنے کے لیے جمع ہوا کرتے تھے ـــــ اُن کی ملکیت میں آیا تو اُنھوں نے چاہا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ گویا وہ قابلِ نفرت اور گھناؤنے ماضی کو طاقِ نسیاں کے حوالے کردینا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کو ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا۔ اور جب ایک قریشی نوجوان نے ان سے کہا کہ چچا جان آپ نے قریش کی

قابلِ فخر یادگار کو بیچ دیا تو انھوں نے اس کو جواب دیا۔

"بیٹے! تمہاری اس بات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ فخر و مباہات کی ساری باتیں اب ختم ہو چکی ہیں۔ اب اگر کوئی چیز باقی رہ گئی ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ میں نے اس کو صرف اس لیے فروخت کیا ہے کہ اس کی قیمت سے جنّت میں ایک مکان خرید سکوں۔ تم سب لوگ گواہ رہنا کہ میں اسس کی قیمت خدائے عزّ وجلّ کی راہ میں صدقہ کر رہا ہوں۔"

حضرت حکیم بن حزام اسلام لانے کے بعد جب پہلی بار سفرِ حج پر گئے تو ان کے ساتھ قربانی کی ایک سو اُونٹنیاں تھیں جن کے اُوپر قیمتی کپڑوں کی خوبصورت جھولیں پڑی ہوئی تھیں۔ اور دوسرے حج میں وقوفِ عرفات کے موقع پر ان کے ساتھ ایک سو غلام تھے جن کی گردنوں میں چاندی کے پٹے پڑے تھے جن پر لکھا تھا عُتَقَاءُ لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ عَنْ حَکِیْم بْنِ حَزَام۔ اور تیسرے حج کے موقع پر قربانی کی ایک ہزار بکریاں لے گئے تھے۔ جی ہاں، ایک ہزار بکریاں۔ اور منیٰ میں ان سب کی قربانی کر کے ان کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا تھا۔

غزوۂ حنین کے موقع پر انھوں نے ایک دفعہ مالِ غنیمت میں سے مانگا تو آپؐ نے ان کو عنایت فرمایا۔ انھوں نے دوبارہ مانگا تو آپؐ نے پھر مرحمت فرمایا۔ اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک سو اونٹ دیدیے ـــ اس وقت وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے ـــ پھر آپؐ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"حکیم! یہ مال نفس کے لیے بڑا پُرکشش ہوتا ہے۔ جو شخص اسے قناعت کے ساتھ لیتا ہے اس کے لیے یہ بابرکت اور جو شخص حرص و طمع کے ساتھ لیتا

ہے، اس کے لیے نامبارک ثابت ہوتا ہے۔ اُوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔" حضرت حکیمؓ بن حزام نے یہ بات سُنی تو عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! قسم ہے اس ہستی کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کے بعد نہ میں کسی سے کچھ مانگوں گا نہ زندگی بھر کسی سے کچھ لُوں گا۔"

اور واقعی انھوں نے اپنی یہ قسم پوری کر دکھائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کو متعدد بار بلایا کہ اپنا وظیفہ بیت المال سے لے لیں مگر انھوں نے انکار کردیا۔ اور ان کے بعد جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو وہ بھی انھیں بلاتے رہے لیکن جب وہ کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے مجمع میں کھڑے ہوکر فرمایا۔

"مسلمانو! آپ سب لوگ اس بات کے گواہ رہیں کہ میں حکیمؓ بن حزام کو بیت المال سے اپنا حصّہ لینے کے لیے بُلاتا ہوں مگر وہ اس سے انکار کرتے ہیں۔"

اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے پوری زندگی اس طرح گزار دی کہ انھوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔

حضرت عبّاد بن بِشر رضی اللہ عنہ

"عباد بن بشر" دعوتِ محمّدیہ کی تاریخ میں ایک نہایت درخشاں اور تابندہ نام ہے۔ اگر آپ عبادت گزاروں کے درمیان تلاش کریں تو اُن کو صاحبِ تقویٰ، پاکیزہ خصلت اور خدائے عزوجل کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے والا پائیں گے۔ اور اگر بہادروں اور سورماؤں میں ڈھونڈیں تو اُن کو سرفروش، حامیٔ اسلام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے معرکوں میں گھسنے والا دیکھیں گے۔ اور اگر گورنروں اور والیوں میں دیکھیں تو یہ مسلمانوں کے مال کے محافظ اور امین نظر آئیں گے۔ یہاں تک کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اُن کے اور اُن کے قبیلے کے دو دوسرے حضرات کے متعلق فرمایا تھا کہ انصار میں تین آدمی ایسے ہیں کہ فضل و شرف میں کوئی اُن سے برتر نہیں ہے، ان تینوں کا تعلق بنی عبدالاشہل سے ہے۔ اور وہ ہیں سعد بن مُعاذ، اُسَید بن حُضَیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہم۔

اُس وقت جب اُفقِ یثرب پر آفتابِ اسلام کی شعاعیں ضَوفگن ہوئی تھیں، حضرت عباد بن بشر کی نوجوانی اور عُنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ اُن کے چہرے سے عفت و طہارت کی تازگی و شادابی ہُویدا تھی اور اُن کے رویّے اور طریقِ کار سے پختہ عمر والوں کی سی سنجیدگی اور متانت نمایاں تھی، حالانکہ

اس وقت ان کی عمر ابھی پچیس سال سے متجاوز نہیں تھی۔

جب نوجوان مکی داعیٔ اسلام، حضرت مُصعبؓ بن عمیر سے ان کی ملاقات ہوئی تو ایمانی روابط، کریمانہ عادات وخصائل اور شریفانہ اخلاق واطوار نے بہت جلد ان دونوں کے دلوں میں اُلفت ومحبت اور یک جہتی وہم آہنگی پیدا کر دی۔ اور جب انھوں نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اپنی بلند و پُرجوش آواز اور دلکش و پُرسوز لہجے میں قرآن کریم کی تلاوت کرتے سُنا تو کلامِ الٰہی کی محبت ان کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر گئی اور سُویدائے قلب کی لامحدود وسعتوں پر چھا گئی۔ اور انھوں نے قرآن کریم کی تلاوت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ رات ہو، دن ہو، سفر ہو، حضر ہو ہر وقت اور ہر جگہ اسے پڑھتے رہتے تھے، یہاں تک کہ صحابۂ کرام کے درمیان "امام" اور "صَدِیقِ قرآن" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

ایک رات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ عائشہ صدیقہؓ میں ــــ جو مسجد نبوی سے متصل تھا ــــ تہجد میں مصروف تھے۔ آپؐ نے حضرت عباد بن بشر کی آواز سُنی، جو اپنی نمناک اور لوچ دار آواز میں قرآنِ کریم کی قرأت اس طرح کر رہے تھے جیسا جبریلؑ نے آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل کیا تھا۔ تو حضرت صدیقہؓ کو متوجہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"عائشہ! یہ عباد بن بشر کی آواز ہے۔"

"ہاں، اے اللہ کے رسُولؐ!" انھوں نے جواب دیا۔

"اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ۔ خدایا! ان کی مغفرت فرما دے۔" آپؐ نے ان کے لیے دعا فرمائی۔

حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ تمام غزوات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے اور ہر ایک میں انھوں نے ایسے ایسے شاندار کارنامے

انجام دیے جو ایک حامل قرآن کے شایانِ شان تھے۔ انھیں میں سے ایک یہ ہے۔

غزوۂ ذات الرقاع سے فارغ ہونے کے بعد واپس لوٹتے ہوئے رات گزارنے کے لیے آپؐ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک گھاٹی میں قیام فرمایا ـــ اُس غزوے کے دوران کسی مسلمان نے ایک مشرک عورت کو اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں گرفتار کرلیا تھا۔ واپس آکر جب اس نے اپنی بیوی کو نہیں پایا تو لات و عزیٰ کی قسم کھاتے ہوئے کہا کہ میں محمدؐ اور ان کے اصحاب کا ضرور پیچھا کروں گا اور اُن کا خون بہائے بغیر واپس نہیں لوٹوں گا ـــ

جب مسلمان اپنی سواریوں کو بٹھا کر ان کے کجاوے اُتار چکے تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"آج رات ہماری پاسبانی کون کرے گا؟"

"اے اللہ کے رسول! یہ خدمت ہم انجام دیں گے" حضرت عبادؓ بن بشر اور حضرت عمارؓ بن یاسر نے کھڑے ہو کر کہا ـــ مہاجرین جب مدینہ آئے تھے تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن دونوں کے درمیان مواخاۃ قائم کی تھی ـــ جب یہ دونوں حضرات پہرہ دینے کے لیے گھاٹی کے دہانے پر پہنچے تو حضرت عبادؓ بن بشر نے اپنے بھائی عمارؓ بن یاسر سے پوچھا کہ آپ رات کے کس حصے میں آرام کرنا پسند کریں گے۔ نصف اول میں یا نصف آخر میں؟ تو حضرت عمارؓ نے جواب دیا کہ میں نصف اول میں آرام کروں گا۔ اور یہ کہہ کر وہ ان کے قریب ہی لیٹ گئے۔

رات سنسان، پُرسکون اور تاریک تھی۔ ہر طرف خاموشی کا پہرہ تھا۔ آسمان پر ستارے اور زمین پر شجر و حجر سب اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں مشغول تھے۔

اِس سناٹے کے عالم میں حضرت عبادؓ بن بشر کی طبیعت عبادت کی طرف مائل ہوئی اور ان کے دل میں تلاوتِ قرآن کا شوق پیدا ہوا۔ وہ قرآن کی شیرینی سے اُس وقت سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے تھے جب اُسے نماز میں ترتیل کے ساتھ پڑھ رہے ہوں۔ اس طرح وہ نماز اور تلاوت کے لطف کو یکجا کر لیا کرتے تھے۔ چنانچہ قبلہ رُو ہو کر اُنھوں نے نماز کی نیت باندھ لی اور اپنی پُرسوز، نمناک اور شیریں آواز میں سُورۂ کہف کی تلاوت شروع کر دی۔

وہ اُس تابندہ نورِ خداوندی میں تیر رہے تھے اور سر سے پیر تک اس کی روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ اسی دوران وہ بد تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا آ پہنچا۔ جب اُس نے دُور ہی سے حضرت عبادؓ بن بشرؓ کو گھاٹی کے دہانے میں کھڑا دیکھا تو سمجھ گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحابؓ گھاٹی کے اندر ہیں اور یہ ان کا پہریدار ہے۔ اُس نے اپنی کمان کی تانت چڑھائی، ترکش سے تیر نکالا اور چلّے پر رکھ کر ان کی طرف چلا دیا جو ان کے جسم میں پیوست ہو گیا۔ حضرت عبادؓ نے تیر کو اپنے بدن سے نکال کر پھینک دیا۔ اور اپنی تلاوت کے سلسلے کو اسی جوش و خروش کے ساتھ جاری رکھا اور نماز کے خشوع و خضوع میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اُس آدمی نے دوسرا تیر مارا جو ان کے بدن میں ترازو ہو گیا۔ حضرت عبادؓ نے پہلے کی طرح اس کو بھی نکال پھینکا۔ پھر اُس نے تیسرا تیر مارا، انھوں نے اس کو بھی اسی طرح نکال کر پھینک دیا جیسے پہلے دونوں کو نکالا تھا۔ اور وہ آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے اپنے ساتھی کے پاس پہنچے اور یہ کہتے ہوئے ان کو بیدار کیا۔

"اُٹھیے، زخموں نے مجھے نڈھال کر دیا ہے" — جب اُس آدمی نے ایک کے بجائے دو آدمیوں کو دیکھا تو دھیرے سے کھسک گیا — حضرت عمارؓ بن یاسر

کی توجہ ان کی طرف ہوئی تو ان کے تینوں زخموں سے تیزی کے ساتھ خون بہتا ہوا دیکھ کر بولے۔

"سبحان اللہ، آپ نے مجھے اُسی وقت کیوں نہیں جگا دیا جب اُس نے پہلا تیر مارا تھا؟"

تو حضرت عباد بن بشرؓ نے جواب دیا — "میں ایک سُورہ پڑھنے میں مصروف تھا اور اس کو اختتام تک پہنچائے بغیر درمیان میں منقطع کر دینا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ خدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میں اُس پاسبانی کے مقصد کو ضائع کر دوں گا، جس کا حکم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیا تھا تو میں قرأت کے سلسلے کو منقطع نہ کرتا چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔"

اور جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مرتدین کے خلاف جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا اور انھوں نے مسیلمہ کذاب کے فتنے کا سدباب کرنے، اس کے معاون و مددگار مرتدین کی قوت کو توڑنے اور انھیں دوبارہ دائرۂ اسلام میں واپس لانے کے لیے ایک زبردست فوج تیار کی تو حضرت عباد بن بشرؓ اس کے ہراول میں شامل تھے۔ جنگ کے دوران، جس میں مسلمان ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں حاصل کر سکے تھے، حضرت عبادؓ نے دیکھا کہ مہاجرین و انصار، دونوں فریق جنگ کو ایک دوسرے پر ٹال رہے ہیں تو اس صورتِ حال نے ان کے سینے کو رنج و غم سے بھر دیا۔ انھوں نے سُنا کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کو بزدلی اور کم ہمتی کے طعنے دے رہا ہے تو یہ باتیں ان کو سخت ناگوار گزریں اور ان کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ ان ہلاکت آفریں معرکوں میں مسلمانوں کی کامیابی کی اس کے سوا

دُوسری کوئی شکل نہیں ہے کہ مہاجرین اور انصار دونوں فریق ایک دوسرے سے الگ ہوکر لڑیں تاکہ ہرگروہ اپنی ذمہ داری کا خود جواب دہ ہو اور یہ بھی معلوم ہوجائے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں ڈٹ کر استقلال و پامردی کے ساتھ جہاد کا حق ادا کر رہے ہیں۔

آخری اور فیصلہ کن معرکے سے ایک رات پہلے حضرت عباد بن بشرؓ نے ایک خواب دیکھا۔ انھوں نے دیکھا کہ آسمان ان کے لیے شق ہوگیا۔ اور جب وہ اس میں داخل ہوگئے تو اُن کے پیچھے اس کا دروازہ بند ہوگیا۔ صبح کو انھوں نے اس کا ذکر حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے کیا اور پھر خود ہی کہا کہ ابوسعید! خُدا کی قسم، یہ شہادت ہے۔

دن کو جب از سرِ نو جنگ کا آغاز ہوا تو حضرت عباد بن بشرؓ نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہوکر بآوازِ بلند پکارنا شروع کیا۔

"اے گروہِ انصار! تم دوسرے لوگوں سے الگ ہوجاؤ، تلواروں کی میانیں توڑکر پھینک دو اور ہرگز اس بات کا موقع نہ دو کہ اسلام کو تمہاری جانب سے کوئی زک پہنچے۔"

اور وہ مسلسل یہ آواز لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے پاس تقریباً چار سو انصاری جاں باز جمع ہوگئے۔ جن کے سربراہ حضرت ثابت بن قیس، حضرت براء بن مالک اور حضرت ابودجانہ صاحب سیفِ رسول اللہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

حضرت عباد بن بشر اور ان کے یہ ساتھی اپنی تلواروں سے دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرتے اور اپنے سینوں سے موت کو ان کی طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ مسیلمہ اور اس کے حامیوں کا زور ٹوٹ گیا اور وہ حدیقۃ الموت میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ اور پھر وہیں، حدیقۃ الموت کی فصیلوں کے پاس حضرت عباد بن بشر شہید ہوکر گر پڑے اور اپنے خون میں نہا گئے۔ اُس وقت ان کے بدن پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے اتنے زخم تھے کہ ان کو بڑی مشکل سے ان کی بعض علامتوں کی مدد سے پہچانا جاسکا۔ ٭

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہٗ

اِس وقت ہم ہجرتِ نبویہ کے دوسرے سال میں ہیں۔ مدینۃ الرسولؐ میں ہرطرف بڑی گہما گہمی ہے ۔مسلمان پورے زور وشور کے ساتھ جنگِ بدر کی تیاریوں میں مصروف ہیں ۔تیاریاں مکمل ہوجانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس پہلے لشکر پر آخری نگاہیں ڈالتے ہیں جو روئے زمین پر اللہ کے دین کو قائم کرنے اوران کی زیرِقیادت جہاد فی سبیل اللہ کے لیے حرکت میں آنے کو بالکل تیار کھڑا ہے ۔ اور اسی موقع پر ایک کم سن بچّہ جس کی عمر تیرہ سال سے بھی کم معلوم ہوتی ہے ، جس کے چہرے پر ذہانت وفطانت کا جوہر نمایاں ہے اور جس کی پیشانی سے نجابت وحمیت کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں — سامنے آتا ہے ۔اس کے ہاتھ میں ایک تلوار ہے جو لمبائی میں اس کے قد کے برابر یا اس سے کچھ نکلتی ہوئی ہے ۔ وہ رسولؐ اللہ کے قریب پہنچ کر کہتا ہے ۔

"اے اللہ کے رسولؐ ! میں آپ پر قربان ، مجھے اپنے ساتھ شریک ہونے اور اپنے جھنڈے تلے اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیے!"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے اُوپر مسرت آمیز نگاہ ڈالتے ہیں ، تحسین آفریں انداز میں اس کے کندھے کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے اس کی دل دہی فرماتے اور کم سِنی کے باعث اسے واپس کردیتے ہیں ۔

بچّہ اپنی تلوار کو زمین پر گھسیٹتا ہوا نہایت رنجیدہ اور غمگین صورت بنائے
واپس لوٹ گیا۔ اُسے اس بات کا شدید احساس تھا کہ وہ پہلے غزوہ میں رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرکت کے شرف سے محروم رہ گیا۔ اس کے پیچھے
اس کی ماں نوار بنتِ مالک بھی واپس آ گئی۔ اُسے بھی اپنے بچے کی محرومی کا
غیر معمولی صدمہ تھا۔ اُسے اس بات کا بڑا ارمان تھا کہ وہ اپنے لختِ جگر کو
لوگوں کے ساتھ رسول اللہ کے جھنڈے کے نیچے جہاد کے لیے جاتا ہوا دیکھے۔
اُسے پوری اُمید تھی کہ اس کا نورِ نظر بارگاہِ رسالت میں وہ مقامِ بلند حاصل کرنے
میں کامیاب ہو جائے گا جو اس کا باپ اگر زندہ ہوتا تو حاصل کرتا۔

لیکن اس انصاری نونہال نے جب یہ دیکھا کہ وہ اپنی کم عمری کی وجہ سے
اس میدان میں رسول اللہ کا تقرب حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس
نے اپنی ذہانت سے کام لے کر اپنے لیے ایک ایسے میدان کا انتخاب کر لیا جو اُسے
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقرب بنا دے۔ جس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے
عمر کی قید یا شرط نہ تھی۔ اور وہ میدان تھا علم اور حفظ کا میدان۔

جب اس نے اس نئے خیال کا ذکر اپنی ماں کے سامنے کیا تو وہ بہت
خوش ہوئی اور اس کی حقیقت رسی پر باغ باغ ہو گئی۔ اُس نے اپنے قبیلے کے
کچھ لوگوں سے بچے کی دل چسپی اور اس کی سوچ کا ذکر کیا تو وہ لوگ اس کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور آپ سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! یہ ہمارا لڑکا زید بن ثابت ہے۔ اس کو کتاب اللہ
کی سترہ سورتیں بالکل اسی طرح صحت کے ساتھ یاد ہیں جس طرح آپ کے قلب
مبارک پر اُتری ہیں۔ اس کے علاوہ یہ لکھنے پڑھنے میں بھی کافی ہوشیار ہے۔
ان چیزوں کے ذریعے یہ آپ کا قرب حاصل کرنا اور آپ کی خدمت میں رہنا

چاہتا ہے ۔ اگر آپ چاہیں تو اس سے سن لیں ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت سے اس کی حفظ کی ہوئی سورتوں میں سے کچھ سنیں ۔ واقعی اس کی تلاوت نہایت خوبصورت اور ادائیگی بہت واضح تھی ۔ اس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر قرآن کریم کے الفاظ یوں جگمگا رہے تھے جیسے سطح آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں ۔ پھر اس کی تلاوت کا انداز بتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ تلاوت کر رہا ہے، اُس سے متاثر بھی ہو رہا ہے ۔ اور مناسب مقامات پر اس کا وقف کرنا اس بات کی دلالت کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اسے اچھی طرح سمجھ بھی رہا ہے ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کے قبیلے والوں کے بیان سے بڑھ کر پایا تو آپؐ بہت خوش ہوئے ۔ اور کتابت میں اس کی مہارت اور پختگی آپؐ کے لیے مزید وجہ مسرت ثابت ہوئی ۔

آپ نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ۔

" زید! تم میرے لیے یہودیوں کی کتابت (عبرانی) سیکھ لو، کیونکہ مجھے ان کے اُوپر اعتماد نہیں ہے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ وہی لکھتے ہیں ۔"

اور زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں فوراً عبرانی سیکھنے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے ۔ اور قلیل عرصے میں اس میں پوری مہارت پیدا کر لی ۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہودیوں کو کچھ لکھوانا چاہتے یا ان کی طرف سے کوئی تحریر آتی تو حضرت زید بن ثابتؓ اس کو لکھنے یا پڑھنے کی خدمت انجام دیتے تھے ۔ پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سُریانی زبان بھی سیکھ لی اور آپؐ کے ترجمان بن گئے ۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دانائی

امانت داری، باریک بینی اور فہم وفراست سے پورے طور پر مطمئن ہو گئے تو آپؐ نے آسمانی پیغام کی امانت ان کے سپرد کرتے ہوئے ان کو کتابتِ وحی کے منصب پر فائز کر دیا۔ جب بھی قرآن کا کوئی حصّہ آپؐ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوتا ان کو بلوا کر لکھوا لیتے۔ اس طرح حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ وقتاً فوقتاً براہِ راست رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم قرآن حاصل کریں اور ان کی زبانِ مبارک سے تازہ بہ تازہ اس کے نازل ہونے والے ہر حصّے کو اس کی شانِ نزول کے ساتھ اخذ کریں اور اس کی آیات کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتے رہیں اور ان کا نفس اس کی ہدایت کے انوار سے منور اور ان کی عقل اس کی شریعت کے اسرار سے روشن ہوتی چلی جائے۔

اور آخر کار یہ خوش قسمت نوجوان زیدؓ بن ثابت قرآن میں امتیازی خصوصیت کا حامل اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد قرآنی علوم میں اُمتتِ محمدیہ کا اولین مرجع بن گیا۔ چنانچہ وہ اس کمیٹی کا صدر تھا جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کے جمع و ترتیب کا کارنامہ انجام دیا اور اس مجلس کا سربراہ تھا جس نے حضرت عُثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مصاحفِ قرآن کو یکجا کرنے کی ذمہ داری ادا کی تھی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر قرآن کریم کا یہ خاص فضل ہی تھا کہ اُس نے ایسے ایسے پیچیدہ مسائل میں اور نازک مواقع پر ان کے سامنے صحیح راہ واضح کر دی جن میں بڑے بڑے ارباب عقل وفہم حیران وسرگرداں رہ جاتے تھے۔ چنانچہ سقیفۂ بنی ساعدہ کے موقع پر جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے مسئلے پر مسلمانوں میں زبردست اختلافِ رائے پیدا ہو گیا،

جب مہاجرین نے کہا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہمارے درمیان رہے گی اور ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ بعض انصار نے کہا کہ "خلافت ہمارے درمیان رہے گی، ہم اس کے زیادہ مستحق ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ "خلافت ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک رہے گی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ جب بھی وہ تم میں سے کسی کو کسی ذمہ داری پر متعین کرتے تو ہم میں سے بھی کسی کو اس کے ساتھ لگا دیتے تھے۔" اور اس معاملے میں صورتِ حال اتنی سنگین ہوگئی تھی کہ قریب تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے قبل ہی مسلمانوں کے اندر زبردست فتنہ پیدا ہوجاتے۔ اُس موقع پر ایک ایسے فیصلہ کن، برحق اور قرآنی ہدایت کے مطابق کلمے کی ضرورت تھی جو سر اُٹھانے سے پہلے ہی اس فتنے کا قلع قمع کر دیتا۔ اور وہ کلمہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زبان سے اُس وقت ادا ہوا جب انھوں نے اپنی قوم انصار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اے گروہِ انصار! رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین میں سے تھے اس لیے ان کا جانشین بھی انھیں کی طرح مہاجر ہونا چاہیے۔ اور ہم لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے انصار تھے لہذا ہم ان کے بعد بھی حق بات میں ان کے جانشین کے انصار و اعوان رہیں گے۔"

پھر یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنا ہاتھ حضرت ابوبکرؓ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ ہیں تمہارے خلیفہ ان کی بیعت کرلو۔"

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآن کی فضیلت، اس پر تدبّر و تفقہ اور عرصۂ دراز تک رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے فیض یابی کے باعث تمام مسلمانوں کے لیے مشعلِ نور بن گئے تھے۔ خلفاءِ راشدین پیچیدہ مسائل میں

ان سے مشورہ کرتے اور عام مسلمان اپنے مشکل معاملات میں ان سے فتویٰ پوچھتے تھے خصوصاً میراث میں توسب لوگ انھیں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ کیونکہ اُس وقت مسلمانوں میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں تھا جو میراث کے مسائل کا ان سے بڑا عالم اور اس کی تقسیم کا ان سے زیادہ ماہر ہو۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جابیہ کے مقام پر مسلمانوں کے درمیان تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"لوگو! جو شخص قرآن کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے وہ زیدؓ بن ثابت کی طرف رجوع کرے، جس کو فقہ کے متعلق کچھ پوچھنا ہو وہ معاذؓ بن جبل کے پاس جائے اور جو مال چاہتا ہو وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کا ذمہ دار اور تقسیم کنندہ بنایا ہے۔"

صحابۂ کرام اور تابعین عظام میں سے وہ لوگ جو علم کے طلب گار اور اس کے جویا تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ خوب اچھی طرح پہچانتے تھے۔ چنانچہ اُس علم کی وجہ سے جو ان کے سینے میں جاگزین تھا، وہ لوگ ان سے غیر معمولی تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتے تھے۔

وہ ہیں بحرِ علم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ۔ وہ دیکھتے ہیں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، اپنے گھوڑے پر سوار ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آگے بڑھ کر وہ اُن کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی رکاب اور گھوڑے کی لگام تھام لیتے ہیں۔ یہ دیکھ حضرت زیدؓ اُن سے کہتے ہیں۔

"اے ابنِ عمِ رسول اللہ! چھوڑ دیجیے"، تو وہ جواب دیتے ہیں۔

"ہم کو اپنے علماء کے ساتھ اسی طرح پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

تو حضرت زیدؓ اُن سے کہتے ہیں "ذرا اپنا ہاتھ تو مجھے دکھائیے۔"

اورجب حضرت ابن عباسؓ اپنا ہاتھ نکالتے ہیں تو حضرت زیدؓ جھک کر یہ کہتے ہوئے اس کو چوم لیتے ہیں۔

"ہم کو اپنے نبیؐ کے اہلِ بیت کے ساتھ ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔"

اورجب حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے تو مسلمان ان کی موت کی وجہ سے اس علم پر زار و قطار روئے جو ان کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس موقع پر کہا۔

"آج اس اُمت کا متبحّر عالم انتقال کر گیا۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ ابنِ عباسؓ کو ان کا جانشین بنا دے۔"

اور شاعرِ رسولؐ حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کا اور اپنا ایک ساتھ مرثیہ کہتے ہوئے کہا۔

فَمَنْ لِلْقَوَافِي بَعْدَ حَسَّانَ وَابْنِهِ
وَمَنْ لِلْمَعَانِي بَعْدَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ

نہ تو حسّان اور اس کے بیٹے کے بعد اشعار و قصائد کے لیے کوئی مرجع ہوگا، نہ زید بن ثابت کے بعد قرآن کے معانی و مطالب کے لیے کوئی مرجع رہ گیا ہے۔

حضرت ربیعہ بن کعب رضی اللہ عنہٗ

حضرت ربیعہ ابن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

اُس وقت ـــــ جب میری رُوح نورِ ایمان سے منوّر اور میری عقل معنئ اسلام سے آشنا ہوئی تھی ـــ میں ایک کم سن نوجوان تھا۔ جب پہلی بار میری آنکھیں دیدارِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف یاب ہوئیں تو آپؐ کی محبت میری رگ و پے میں سرایت کر گئی اور میرے پورے وجود پر حاوی ہو گئی۔ میں آپؐ کے اوپر اس طرح دل و جان سے فریفتہ ہو گیا کہ آپؐ کی محبت نے مجھے ہر چیز سے بے گانہ کر دیا۔ چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا۔

"ربیعہ! تمہارا بھلا ہو، تم خود کو ہر کام سے فارغ کر کے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے لیے وقف کیوں نہیں کر دیتے؟ ایسا کرو کہ اپنے آپ کو ان کی خدمت کے لیے پیش کر دو۔ اگر انھوں نے تمہاری خدمات کو قبول فرما لیا تو تم کو ان کی قربت و محبت کی سعادت سے بہرہ ور ہونے کا موقع نصیب ہو جائے گا اور تم دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

پھر کسی تاخیر کے بغیر میں نے اس اُمید کے ساتھ خود کو آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیا کہ آپؐ مجھے اپنی خدمت کے لیے قبول فرمالیں گے۔ اور واقعی

آپ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ بلکہ اپنی خدمت کا موقع دینے پر رضامند ہوگئے۔
اور اس روز سے میں سائے کی طرح آپؐ کے ساتھ رہنے لگا۔ میں ہر جگہ اور ہر وقت آپؐ کی خدمت میں حاضر رہتا۔ آپؐ جب بھی اپنی نگاہوں سے میری طرف کوئی اشارہ فرماتے، میں فوراً تعمیل ارشاد کے لیے حاضر ہو جاتا۔ آپؐ نے جب بھی کسی چیز کی ضرورت محسوس کی، مجھے اس کی تکمیل میں کبھی کوتاہ یا سست نہیں پایا۔ میں دن بھر آپؐ کی خدمت میں لگا رہتا۔ جب دن ختم ہو جاتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عشاء سے فارغ ہو کر اندرونِ خانہ تشریف لے جاتے تو میں بھی واپسی کا ارادہ کرتا۔ لیکن پھر میں اپنے دل میں سوچتا۔
"ربیعہ! کہاں جا رہے ہو؟ ممکن ہے رات میں کسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حاجت پیش آ جائے۔"
یہ سوچ کر میں وہیں آپ کے دروازے پر بیٹھ جاتا اور آپ کے گھر کی چوکھٹ چھوڑ کر کہیں جانا گوارا نہ کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راتیں کھڑے کھڑے نماز پڑھنے میں گزار دیتے تھے۔ بسا اوقات میں سنتا تھا کہ آپؐ سورہ فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ آپؐ اسے مسلسل اتنی دیر تک دہراتے رہتے کہ میں اکتا جاتا یا میرے اوپر نیند کا غلبہ ہو جاتا اور میں سو جاتا۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ آپؐ سمع اللہ لمن حمدہ کی تکرار سورۂ فاتحہ سے بھی زیادہ دیر تک کرتے رہتے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ کسی قسم کا احسان کر دیتا تو آپؐ اس سے بہتر طریقے سے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیتے تھے۔ اپنی اسی عادت کے مطابق آپ میری خدمات کا صلہ دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک روز مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔
"ربیعہ ابن کعب!"

"اے اللہ کے رسولؐ! میں بسر و چشم حاضرِ خدمت ہوں"، میں نے عرض کیا۔
"مجھ سے کچھ مانگو، میں تمہاری مانگ پوری کروں گا۔" رحمتِ مجسم نے فرمایا۔

میں نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "اللہ کے رسولؐ! مجھے مہلت دیجئے تاکہ میں سوچ لوں کہ مجھے آپ سے کیا مانگنا ہے پھر میں آپ کو بتا دوں گا۔"
"کوئی حرج نہیں، سوچ لو۔" آپؐ نے فرمایا۔
میں اس وقت ایک مفلس جوان تھا۔ نہ میرے پاس بیوی تھی نہ مال تھا نہ مکان۔ دوسرے غریب مسلمانوں کی طرح مسجد نبوی کا چبوترہ ہی میرا مسکن و ماویٰ تھا۔ لوگ ہمیں "مہمانانِ اسلام" کہہ کر پکارتے تھے۔ جب کوئی مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقے کی کوئی چیز لاتا تو آپؐ وہ سب ہم لوگوں کے پاس بھیج دیتے۔ اور جب کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپؐ اس میں سے کچھ اپنے پاس رکھ کر باقی ہم کو مرحمت فرما دیا کرتے تھے۔ اپنی اسی تنگ دستی اور پریشان حالی کی وجہ سے میرے دل نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیاوی ساز و سامان مانگ لوں تاکہ فقر و محتاجی سے نجات مل جائے اور دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی مال اور بیوی بچوں والا ہو جاؤں لیکن میرے دل نے پھر کہا۔
"ربیعہ ابن کعب! تمہارا برا ہو، یہ دنیا تو زوال پذیر ہے، ایک دن فنا ہو جائے گی۔ اس میں جس رزق کی کفالت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، وہ لازماً تم کو ملے گا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے نزدیک ایسے بلند مرتبے پر فائز ہیں کہ آپؐ کی کوئی مانگ نامنظور نہیں کی جا سکتی اس لیے تم ان سے یہ درخواست کرو کہ وہ تمہارے لیے اُخروی فائدے کی دُعا فرمائیں۔"

میں نے اس فیصلے پر اپنے دل میں نہایت اطمینان واستراحت کی کیفیت محسوس کی۔ پھر جب میں بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا۔

"ربیعہ! کیا کہتے ہو؟"

"اے اللہ کے رسولؐ! میں جنت میں آپ کی رفاقت کا آرزومند ہوں"۔

میں حرف آرزو زبان پر لایا "آپؐ اسی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں"۔

"تم کو یہ بات کس نے سُجھائی؟" آپؐ کا لہجہ تحسین آمیز تھا۔

"نہیں، خدا کی قسم یہ بات مجھے کسی اور نے نہیں بتائی ہے۔ بلکہ جس وقت آپؐ نے فرمایا تھا کہ 'مجھ سے کچھ مانگو، میں تمہاری مانگ پوری کروں گا' تو پہلے تو میرے جی میں آیا کہ میں آپ سے دنیاوی مال ومتاع مانگ لوں پھر من جانب اللہ مجھے دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کی نیک توفیق حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ آپ میرے لیے جنت میں اپنی رفاقت کی دعا فرمائیں"۔

پھر آپ نے ایک طویل خاموشی کے بعد فرمایا۔

"ربیعہ! کیا تم اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتے؟"

"نہیں، اے اللہ کے رسولؐ! جو چیز میں نے آپ سے مانگی ہے، دوسری کسی چیز کو میں اس کے برابر نہیں سمجھتا"۔ میں نے عرض کیا۔

"تب کثرتِ سجود سے میری مدد کرو"۔ آپ نے میری درخواست منظور کرتے ہوئے فرمایا۔

اس کے بعد میں پوری جان فشانی کے ساتھ عبادت میں مصروف ہوگیا تاکہ جس طرح دنیا میں آپ کی خدمت سے بہرہ ور ہوں اسی طرح آخرت میں بھی

آپ کی رفاقت سے محظوظ ہوسکوں۔ اس بات کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بلا کر پوچھا۔

"ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟"

"اے اللہ کے رسولؐ! میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی چیز مجھے آپ کی خدمت سے غافل کر دے۔ پھر میرے پاس بیوی کا مہر ادا کرنے اور اس کی ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے لیے مال بھی تو نہیں ہے۔" میں نے اپنی مجبوریاں آپ کے سامنے رکھ دیں لیکن آپ نے دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟"

میں نے آپؐ کو پھر وہی جواب دیا جو پہلے دے چکا تھا۔ لیکن جب میں نے تنہائی میں اس پر غور کیا تو مجھے اپنے اس جواب پر سخت ندامت و پشیمانی ہوئی اور میں نے اپنے دل میں کہا۔

"ربیعہ! تمہارا بھلا ہو، خدا کی قسم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے دینی و دنیاوی مصالح کو تم سے زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے ہیں۔ اور تمہارے پاس جو کچھ ہے اس کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بخدا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کبھی شادی کی پیش کش کی تو میں اس کو ضرور قبول کروں گا۔"

اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد آپؐ نے مجھ سے پھر کہا۔

"ربیعہ! کیا تم شادی نہیں کرو گے؟

"کیوں نہیں اے اللہ کے رسولؐ! لیکن میرے ساتھ کون شادی کرے گا جب کہ میں ایک تہی دست اور مفلس آدمی ہوں۔"

میرے اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فلاں کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنی فلاں لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔"

میں نے شرماتے ہوئے ان کے پاس جاکر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس حکم کے ساتھ آپ کے پاس بھیجا ہے کہ آپ اپنی فلاں لڑکی کا نکاح میرے ساتھ کر دیں۔"

"فلاں لڑکی کے ساتھ؟" انھوں نے پوچھا اور میرے مثبت جواب کے بعد انھوں نے کہا۔

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیغام کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد اپنے مقصد سے محروم واپس نہیں جائے گا۔"

اور پھر انھوں نے اپنی بیٹی کا نکاح میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے بعد میں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر بتایا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں بہترین لوگوں کے پاس سے آیا ہوں۔ انھوں نے میری بات کی تصدیق کی، مجھے خوش آمدید کہا اور اپنی لڑکی کا عقد میرے ساتھ کر دیا۔ اب میں ان کو مہر کی رقم کہاں سے ادا کروں؟

آپ نے بُریدہ ابن خُصَیبؓ کو —— جو میرے قبیلے، بنی اسلم کے ایک رئیس تھے —— بلا کر فرمایا کہ ربیعہ کے لیے ایک نواۃ کے بقدر سونے کا انتظام کر دو۔ اور حسبِ حکم انھوں نے سونے کی مطلوبہ مقدار میرے لیے فراہم کر دی تو آپؐ نے اس کو میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کو لے کر ان کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ یہ تمہاری بیٹی کا مہر ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے لے جاکر ان کے حوالے کر دیا جس کو انھوں نے قبول کر لیا اور اپنی رضامندی کا

اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کثیرٌ طیبٌ (کافی ہے اور عمدہ ہے)۔

میں نے واپس آکر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں نے ان سے زیادہ شریف لوگ نہیں دیکھے۔ میں نے جو کچھ ان کو دیا، قلیل ہونے کے باوجود نہ صرف یہ کہ انھوں نے برضا و رغبت اس کو قبول کرلیا بلکہ اظہار پسندیدگی کے طور پر یہ بھی کہا کہ کثیرٌ طیبٌ۔ اے اللہ کے رسُولؐ! اب مجھے ولیمہ کے لیے رقم کہاں سے ملے گی؟

آپؐ نے پھر بریدہ ابن خصیبؓ کو بلاکر کہا کہ ربیعہ کے لیے ایک مینڈھے کی قیمت اکٹھا کردو۔ چنانچہ انھوں نے رقم فراہم کرکے میرے لیے ایک موٹا تازہ مینڈھا خرید دیا۔ اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ عائشہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ جو جَو اُن کے پاس ہیں وہ تم کو دے دیں۔ اور جب میں نے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا تو انھوں نے ایک ٹوکرے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اُسے اٹھالو۔ اُس میں سات صاع جَو ہیں۔ خدا کی قسم ہمارے پاس اس کے علاوہ کھانے کی دوسری کوئی چیز نہیں ہے۔

میں وہ مینڈھا اور جَو اپنی بیوی کے گھر والوں کے پاس لے گیا۔ انھوں نے کہا کہ جَو سے تو ہم روٹیاں تیار کردیں گے البتہ مینڈھا تم واپس لے جاؤ اور اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اس کا گوشت تیار کردیں۔ میں مینڈھے کو لے آیا اور میں نے اور میرے قبیلے کے کچھ لوگوں نے مل کر اس کو ذبح کیا، اس کی کھال اُتاری اور اسے پکا کر تیار کردیا۔ اس طرح ہمارے پاس ولیمے کے لیے روٹی اور گوشت کا انتظام ہوگیا۔ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے ولیمہ پر بلایا اور آپؐ نے میری دعوت قبول فرمائی۔

بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

کی زمین سے متصل مجھے ایک زمین بھی عنایت فرمادی ۔ یوں مجھے دنیا بھی حاصل ہوگئی اور اس کی طلب بھی پیدا ہوگئی یہاں تک کہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھجور کے ایک درخت کے بارے میں اختلاف کر بیٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ میری زمین میں ہے اور ان کا کہنا تھا کہ میری زمین میں ہے ۔ آخر کار ہم دونوں کے درمیان بات بڑھ گئی اور انھوں نے مجھے ایک ناگوار بات کہہ دی۔ نکلنے کو تو وہ بات اچانک اُن کے منہ سے نکل گئی مگر فوراً ہی ان کو احساس ہوگیا ۔ اور اس پر اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا کہ ربیعہ ! جواب میں تم مجھ کو وہی جملہ کہہ کر اپنا بدلہ چکالو ۔ لیکن میں نے کہا کہ بخدا میں آپ سے بدلہ لینے کی جرأت نہیں کرسکتا ۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم مجھ سے بدلہ نہیں لوگے تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تمہاری شکایت کر دوں گا ۔ یہ کہہ کر وہ بارگاہِ رسالت کی طرف روانہ ہوگئے ۔ پیچھے پیچھے میں بھی چلا ۔ اور میرے قبیلے والے یہ کہتے ہوئے میرے ساتھ شامل ہوگئے کہ انھوں نے پہل بھی کی، تم کو بُرا بھلا بھی کہا پھر خود ہی تمہاری شکایت کرنے بھی جارہے ہیں ۔ میں نے ان لوگوں کی طرف مُڑتے ہوئے کہا ۔

" ارے تم لوگوں کا بُرا ہو ۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ کون ہیں؟ یہ صدیق ہیں، مسلمانوں کی بزرگ ترین ہستی ۔ تم لوگ واپس جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تم لوگوں کو دیکھ لیں اور ان کی خفگی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خفا ہوجائیں اور ان دونوں کی ناراضی اللہ تعالےٰ کے غضب کا سبب بن جائے اور ربیعہ ہلاک ہوجائے ۔" تب جاکر وہ لوگ واپس ہوئے ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر من وعن وہ واقعہ بیان کردیا ۔ تب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف سَر اُٹھا

کر پوچھا۔

"ربیعہ! تمہارا اور صدیق کا کیا معاملہ ہے ؟"

میں نے عرض کیا۔" اے اللہ کے رسولؐ! یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کو وہی بات کہہ دوں جو انھوں نے مجھے کہی تھی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"ہاں، تم نے ٹھیک کیا۔ تم ان کو ہرگز وہ بات نہ کہنا جو انھوں نے تم کو کہی تھی۔ بلکہ تم یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ ابوبکر کو معاف فرمائے۔" آپؐ نے میرے طرزِ عمل کو سراہا۔

تو میں نے کہا کہ" ابوبکرؓ! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔"

اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔

"ربیعہ! اللہ تعالیٰ تم کو میری طرف سے بہترین جزا دے.... ربیعہ! اللہ تعالیٰ، تم کو میری طرف سے بہترین...."

اور اس وقت ان کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔"

———٭———
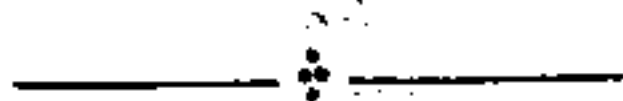
حضرت ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہٗ

ابوالعاص بن ربیع قبیلہ قریش کی شاخ بنی عبدشمس کے چشم و چراغ تھے۔ وہ بھرپور جوانی کے حامل اور ایک شاندار و دل کش شخصیت کے مالک تھے۔ دنیاوی مال و دولت اور خاندانی عزو شرف کے لحاظ سے بھی معاشرے میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ اپنی عظمت، خودداری اور مروت، ووفاداری جیسی ذاتی خوبیوں اور اپنے آباؤ اجداد کے قابل فخر موروثی و خاندانی کارناموں کے باعث عربی خصوصیات کی حامل ایک مثالی شخصیت بن گئے تھے۔

ابوالعاص کو تجارت کا شوق قریش سے وراثت میں ملا تھا ـــــ جس کے تجارتی قافلے سال میں دو بار، سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کے چکر لگایا کرتے تھے ـــــ مکہ اور شام کے درمیان ان کے تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت ہر وقت جاری رہتی تھی۔ ان کا ہر قافلہ ایک سو اونٹوں اور دو سو آدمیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ ان کی کاروباری مہارت اور صداقت و دیانت کی وجہ سے قریش کے لوگ اپنے اموالِ تجارت بھی ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔

ان کی خالہ اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجۂ محترمہ خدیجہ بنتِ خویلد ان کو وہی مقام دیتی تھیں جو ایک بیٹے کا اس کی ماں کے نزدیک ہوتا ہے۔ وہ ان کو اپنے دل کی پہنائیوں میں جگہ دیتیں اور ان کے دل کی طرح

ان کے گھر کی وسعتیں بھی خوشی اور محبت کے ساتھ ہر وقت ان کو خوش آمدید کہنے کو تیار رہتی تھیں۔ اور خدیجہ ہی کی طرح محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ابوالعاص کے ساتھ بے انتہا محبت رکھتے تھے۔

زمانے کے ماہ و سال محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اہل و عیال پر نہایت تیز رفتاری اور پھرتی کے ساتھ گزر گئے اور دیکھتے دیکھتے جب اُن کی سب سے بڑی بیٹی زینب جوانی کی سرحد میں داخل ہو گئی، اور ایک خوشبودار اور خوش رنگ کلی کی طرح کھل گئی تو بڑے بڑے سرداران قریش کے بیٹوں کے دلوں میں اس کے ساتھ شادی کی تمنا سر اُٹھانے لگی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ وہ قریش کی بیٹیوں میں حسب و نسب کے اعتبار سے شریف ترین، والدین کے لحاظ سے معزز ترین اور ذاتی اخلاق و کردار کی رُو سے پاکیزہ ترین بیٹی تھی۔ لیکن اُن کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کے خالہ زاد بھائی اور مکے کے سب سے بہترین نوجوان، ابوالعاص ابن ربیع کے سامنے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے۔

ابوالعاص ابن ربیع کے ساتھ زینب بنتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح کو ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ مکّے کی وادیاں نورِ خداوندی سے جگمگا اُٹھیں اور اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر منصبِ نبوت پر فائز کرتے ہوئے حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈراؤ۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں عورتوں میں سب سے پہلے ان کی بیوی حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اور صاحب زادیاں، حضرت زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضوان اللہ علیہن ان کے اوپر ایمان لائیں۔ حالانکہ حضرت فاطمہ رض اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ البتہ ان کے داماد ابوالعاص نے اپنے آباد اجداد کے دین کو ترک کرنا پسند نہ کیا اور اپنی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ

بے پناہ محبت اور مخلصانہ تعلق کے باوجود ان کے دین کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریشِ مکہ کے درمیان نزاع کافی شدت اختیار کرگئی تو قریش نے آپس میں کہا۔

"تمہارا بُرا ہو، تم لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نکاح کرکے اُن کے غموں کو اپنے اوپر لاد لیا ہے۔ اگر تم انھیں ان کے پاس واپس بھیج دو تو ان کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ کر اپنی لڑکیوں کی طرف مبذول ہو جائے گی۔"

انھوں نے اس رائے کو بہت پسند کیا اور ابو العاص کے یہاں جاکر اُن سے کہا کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو اور اسے اس کے باپ کے گھر بھیج دو۔ ہم قریش کی بہترین عورتوں میں سے جس سے چاہو گے تمہاری شادی کر دیں گے۔ مگر ابو العاص نے ان کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے کہا کہ خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا اور اس کے بدلے میں دنیا کی کسی عورت کو قبول نہیں کروں گا۔

البتہ آپ کی دو صاحب زادیوں ___ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما ___ کو طلاق دے کر آپؐ کے یہاں بھیج دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی واپسی سے خوشی ہوئی۔ آپ چاہتے تھے کہ کاش ابو العاص بھی وہی کرتے جو ان کے دونوں ساتھیوں نے کیا، لیکن آپؐ کے پاس اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ ان کو اس پر مجبور کرسکتے ___ اور ابھی مومنات کے ساتھ مشرکین کے نکاح کی حرمت کا حکم بھی نہیں آیا تھا ___

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے اور وہاں آپ کے قدم مضبوطی سے جم گئے اور قریش آپؐ سے بدر میں قتال کرنے کے لیے نکلے تو ابو العاص کو مجبور کیا گیا کہ وہ بھی ان کا ساتھ دیں، حالانکہ وہ اس جنگ

میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے اس لیے کہ ان کو مسلمانوں سے لڑنے یا انھیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے نہ کوئی دل چسپی تھی نہ وہ اس کی کوئی خواہش رکھتے تھے لیکن اپنی قوم کے اندر جو اونچا مقام ان کو حاصل تھا اس نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اس کا ساتھ دیں۔ اس جنگ کا خاتمہ قریش کی ایسی شکستِ فاش پر ہوا جس نے شرک کو قعرِ مذلت میں دھکیل دیا اور اس کے سرغنوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ چنانچہ ان میں سے کچھ مارے گئے، کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں حضرت زینبؓ کے شوہر ابوالعاص بن ربیع اسیرانِ جنگ میں شامل تھے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قیدیوں کی رہائی کے لیے ان کے اوپر فدیہ عائد کیا۔ فدیے کی یہ رقم قیدیوں کے معاشرتی مقام و مرتبہ اور ان کی مالی حیثیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک ہزار سے چار ہزار درہم تک مقرر کی گئی تھی۔ اس کے بعد مکّہ اور مدینہ کے درمیان صبح سے شام تک قاصدوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو اپنے قیدیوں کی رہائی کے لیے فدیے کی رقوم لے کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے شوہر ابوالعاص کا فدیہ اپنے قاصد کے ذریعے بھیجا۔ اس میں انھوں نے وہ ہار بھی بھیجا تھا جو اُن کی والدۂ مرحومہ ام المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا نے اُن کی رخصتی کے وقت دیا تھا۔ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہار کو دیکھا تو وفادار رفیقۂ حیات کی یاد نے تڑپا دیا اور لختِ جگر کی مجبوریوں نے بے حال کر دیا— اور قلبِ مبارک رنج و ملال سے بھر گیا جس کے آثار صاف طور پر چہرے سے نمایاں تھے اس موقع پر آپؐ نے صحابۂ کرامؓ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا۔

"زینبؓ نے یہ مال ابوالعاص کے فدیے کے واسطے بھیجا ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو اس کے اسیر کو رہا کر دو اور اس کا مال اُسے واپس کر دو"۔ اور صحابہؓ نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے آگے سرِتسلیم خم کردیا۔ اور ابوالعاص کسی فدیہ کے بغیر رہا کر دیے گئے۔ البتہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہائی سے پہلے ان کے اوپر یہ شرط ضرور عائد کی کہ وہ بلا تاخیر ان کی بیٹی حضرت زینبؓ کو مدینہ بھیج دیں گے۔

چنانچہ مکہ پہنچتے ہی ابوالعاص اپنے وعدے کی تکمیل میں لگ گئے۔ انھوں نے حضرت زینبؓ کو سفر کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد کے قاصد مکہ سے کچھ فاصلے پر ان کے منتظر ہیں۔ پھر انھوں نے ان کے لیے زادِ سفر اور سواری کا انتظام کرنے کے بعد اپنے بھائی عَمرو ابن ربیع کو بلا کر ہدایت کی کہ وہ حضرت زینبؓ کے ساتھ جائیں اور انھیں ان لوگوں کے سپرد کر دیں جو ان کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔

عَمرو ابن ربیع نے کمان اور ترکش کو کندھے پر ڈالا، حضرت زینبؓ کو ان کے محمل میں بٹھایا اور ان کو لے کر دن دہاڑے قریش کی آنکھوں کے سامنے مکہ سے روانہ ہو گئے۔ اس پر ان لوگوں میں زبردست ہیجان برپا ہو گیا، ان کے تعاقب میں چل پڑے اور تھوڑی دُور جاتے جاتے ان کو پکڑ لیا اور حضرت زینبؓ کو بُری طرح خوف زدہ کیا۔ اس وقت عَمرو نے کمان کے چلّے کو چڑھایا اور ترکش سے تیروں کو نکال کر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا ــ "خدا کی قسم جو شخص بھی اُن کے قریب جانے کی کوشش کرے گا میں اس کے سینے میں تیر پیوست کر دوں گا۔" ــ وہ بڑے زبردست تیرانداز تھے، ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا تھا ــ

اس وقت ابوسفیان بھی موقع پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے عَمرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "بھتیجے! ٹھہرو، تیر نہ چلانا، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" اور جب وہ رُک گئے، تو ابوسفیان نے کہا۔

تم نے یہ اچھا نہیں کیا کہ زینب کو علی الاعلان سب کے سامنے لیے جا رہے ہو جب کہ عرب کے لوگ اس بھاری مصیبت سے واقف ہو چکے ہیں جو میدانِ بدر میں اس کے باپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں ہمارے اوپر نازل ہو چکی ہے۔ اب اگر تم اس کو اس طرح کھلے عام لے کر نکل جاؤ گے تو عرب قبائل ہم کو بزدلی، کمزوری اور بے غیرتی کا طعنہ دیں گے۔ اگر میری مانو تو اس وقت اس کو واپس لے جاؤ اور چند روز اس کے شوہر کے گھر رکھو جب لوگ آپس میں یہ بات کر چکیں کہ "ہم نے اس کو واپس لوٹا دیا۔" تو تم چپکے سے اس کو اس کے باپ کے پاس بھیج دینا کیونکہ ہمیں اس کو روکنے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔"

عمرو نے ابوسفیان کی بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو لے کر واپس مکہ چلے آئے۔ پھر چند روز کے بعد ایک رات ان کو مکے سے نکال کر لے گئے اور اپنے بھائی کی ہدایت کے مطابق ان کے والد کے قاصدوں کے سپرد کر دیا۔

بیوی سے جدائی کے بعد ابوالعاص ایک مدت تک مکے میں قیام پذیر رہے یہاں تک کہ فتحِ مکہ سے کچھ عرصہ پہلے وہ ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں شام گئے۔ جب وہ اپنے قافلے کے ساتھ جس میں سامانِ تجارت سے لدے ہوئے ایک سو اونٹ اور ایک سو ستر سے زیادہ آدمی تھے، مکہ واپس آتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گزرے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فوجی دستے نے حملہ کر کے اونٹوں پر قبضہ کر لیا اور آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ لیکن ابوالعاص ان کے ہاتھ سے بچ نکلے، وہ لوگ ان کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جب رات نے ہر چیز کو اپنے سیاہ دامن میں چھپا لیا تو ابوالعاص نے مکہ کے بجائے مدینہ منورہ کا رخ کیا اور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر

ڈرتے ڈرتے اور خطرات کو ہر طرف سے بھانپتے ہوئے اس میں داخل ہو گئے اور سراغ لگاتے ہوئے حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے اور ان سے پناہ طلب کر لی۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز فجر کے لیے نکلے اور محراب میں کھڑے ہو کر تکبیرِ تحریمہ کہی اور ساتھ ہی تمام لوگوں نے بھی تکبیر کہہ کر نماز کی نیت باندھ لی تو عورتوں کی صف سے ایک آواز بلند ہوئی۔

"لوگو! میں زینب بنتِ محمدؐ ہوں میں نے ابوالعاص ابنِ ربیع کو پناہ دی ہے۔ لہذا آپ سب لوگ بھی ان کو پناہ دیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے پوچھا "جو کچھ میں نے سُنا ہے کیا تم لوگوں نے بھی اسے سُنا؟ تو لوگوں نے کہا کہ "ہاں، اے اللہ کے رسولؐ! وہ آواز ہم نے بھی سُنی ہے۔" تو آپؐ نے فرمایا۔

"قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس کے متعلق مجھے پہلے سے کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے۔" یہ کہہ کر آپ گھر لوٹ گئے اور صاحب زادی سے فرمایا کہ "بیٹی! ابوالعاص کی اچھی طرح خاطر تواضع کرنا مگر یہ جان لو کہ تم اس کے لیے حلال نہیں ہو۔" پھر آپؐ نے اس دستے کے آدمیوں کو بلا کر، جس نے ابوالعاص کے سامانِ تجارت پر قبضہ کیا تھا اور ان کے آدمیوں کو گرفتار کیا تھا ـــــ فرمایا کہ ہمارے نزدیک اس شخص کا کیا مقام و مرتبہ ہے، اس کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ تم نے اس کا جو مال لیا ہے اگر احسان کرتے ہوئے اُسے واپس کر دو تو یہ میرے نزدیک نہایت پسندیدہ بات ہو گی۔ اور اگر تم اسے واپس نہ کرنا چاہو تو بہرحال وہ اللہ کا مال ہے جو اس نے غنیمت کے طور پر تم کو دیا ہے اور تم اس کے زیادہ حقدار ہو"، صحابۂ کرامؓ نے یک زبان ہو کر کہا کہ

اے اللہ کے رسول ! ہم ان کا مال ان کو واپس کر دیں گے ۔ اور جب ابوالعاص اپنا مال لینے کے لیے ان کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا ۔

" ابوالعاص ! آپ قریش کے ایک معزز اور شریف فرد ہونے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابن عم اور ان کے داماد بھی ہیں ۔ تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ہم لوگ اس سارے مال سے آپ کے حق میں دست بردار ہو جائیں تاکہ آپ اہلِ مکہ کے ان اموال سے بھی استفادہ کریں اور یہیں مدینے میں رہ جائیں ۔"

لیکن ابوالعاص نے ان کی اس پیش کش کو رد کرتے ہوئے کہا کہ " بہت بُری ہے یہ بات جس کی طرف تم لوگ مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اپنے نئے دین کی ابتدا غداری اور بے وفائی سے کروں ۔"

اس کے بعد ابوالعاص سارا مال لے کر مکّہ چلے گئے ۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے تمام حقداروں کے حقوق ادا کرنے کے بعد کہا کہ قریش کے لوگو ! کیا تم میں سے کسی کا مال میرے ذمّے باقی رہ گیا ہے جو ابھی تک اس کو نہیں ملا ؟"

" نہیں ، اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزا دے ۔ ہم نے آپ کو حق ادا کرنے والا اور شریف پایا ۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا ۔

" اچھا ، تو جب میں تم سب لوگوں کے حقوق ادا کر چکا ہوں تو سُن لو ! میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسُول ہیں ۔ خُدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے اوپر اپنے مال کھا جانے کا الزام لگاؤ گے تو میں وہیں مدینے میں محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس مسلمان ہو گیا ہوتا ۔ اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب لوگوں کے حقوق ادا کرا دیے ، میں اپنے اسلام کا اعلان کرتا ہوں ۔"

اس کے بعد وہ مکّہ سے روانہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپؐ نے ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کے پہلے نکاح کو باقی رکھتے ہوئے ان کی بیوی اُنھیں واپس لوٹا دی۔ اور آپؐ اکثر ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔

"حَدَّثَنِیْ نَصَدَقَنِیْ، وَعَدَنِیْ فَوَفَالِیْ۔" "انھوں نے مجھ سے بات کی تو سچ بولے اور وعدہ کیا تو اسے پُورا کیا۔"
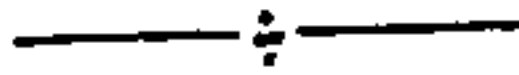
حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہٗ

میدانِ اُحد میں محمدؐ بن عبداللہ (فداہ ابی وامی) سے مقابلے کے لیے قریش بہت بڑی جمعیت کے ساتھ مکہ سے روانہ ہوئے۔ اس فوج میں جہاں ان کے بڑے بڑے سردار شامل تھے وہیں اس میں ان کے غلام بھی شریک تھے۔ اس وقت ان کے سینے بغض و کینہ سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے اپنے مقتولین کے انتقام کی آگ ان کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ اس مہم میں مردوں کے دوش بدوش قریش کے بڑے گھرانوں کی بہت سی شریف زادیاں اور معزز خواتین بھی شریک ہو گئی تھیں تاکہ وہ مردوں کو قتال پر برانگیختہ کریں۔ بہادروں کے دلوں میں غیرت و حمیت اور عصبیت کی آگ بھڑکائیں اور اگر کہیں ان کے اندر کمزوری اور پست ہمتی دیکھیں تو ان کی ہمت بندھائیں اور انھیں میدانِ کارزار میں ثابت قدم رکھیں۔

فوج کے ہمراہ جانے والی ان خواتین میں ابوسفیان کی زوجہ ہند بنت عتبہ، عمرو بن عاص کی بیوی ریطہ بنت منبہ اور سلافہ بنت سعد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلافہ بنت سعد کے ساتھ اس کا شوہر طلحہ اور اس کے تینوں بیٹے مسافع، جلاس اور کلاب بھی تھے۔

کوہ اُحد کے پاس جب دونوں فوجیں باہم متصادم ہوئیں اور جنگ کی آگ

بھڑک اُٹھی تو ہند بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتیں اُٹھیں اور صفوں کے پیچھے جا کھڑی ہوئیں ۔ وہ اپنے ہاتھوں میں دف تھامے انھیں بجا بجا کر گا رہی تھیں ؎

اِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقْ ۔ وَنَفْرِشُ النَّمَارِقْ
اَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقْ ۔ فِرَاقَ غَیْرِ وَامِقْ

اگر تم دشمن سے جنگ کے لیے آگے بڑھو گے تو ہم تمھیں گلے لگائیں گی اور تمہارے لیے آرام دہ بستر بچھائیں گی لیکن اگر تم نے پیٹھ پھیرلی تو ہم نفرت وحقارت کے ساتھ تمھیں چھوڑ دیں گی ۔

ان کا یہ ترانہ قریشی بہادروں کے سینوں میں غیرت وحمیت کے شعلۂ جوالہ کو ہوا دے رہا تھا ۔ اور ان کے شوہروں پر جادو کر رہا تھا ۔

پھر جنگ کا ہنگامہ فرد ہوا اور اس میں قریش کو مسلمانوں پر فتح حاصل ہوئی تو قریشی عورتیں جو نشۂ فتح وکامرانی میں چور تھیں ـــــ اُٹھ کھڑی ہوئیں ۔ وہ میدانِ جنگ میں زیرِ لب گنگناتی ہوئی مسلمان شہداء کی لاشوں کو بڑے انہماک کے ساتھ تلاش کرتی اور انھیں بُری طرح مسخ کرتی پھر رہی تھیں ۔ انھوں نے ان کے پیٹ چاک کر ڈالے ، آنکھیں پھوڑ دیں ، کان کاٹ لیے اور ناکیں تراش لیں ۔ اور ان میں سے ایک عورت کی آتشِ غیظ وغضب اس کے بعد بھی سرد نہ ہوئی تو اس نے ، ان کٹے ہوئے اعضاء سے ہار اور پازیب بنا کر انھیں اپنے گلے اور پاؤں کی زینت بنا لیا ۔ اور یہ سب کچھ اس نے اپنے باپ ، بھائی اور چچا کے انتقام میں کیا جو جنگ بدر میں قتل کیے گئے تھے ۔ مگر سلافہ بنت سعد کی شان اس کے ساتھ کی ان خواتین سے بالکل مختلف تھی ۔ وہ نہایت اضطراب وبے چینی کی کیفیت میں بتلا تھی اور انتہائی بے قراری کے ساتھ اپنے شوہر یا تینوں لڑکوں میں سے کسی ایک کی آمد کی منتظر تھی تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کی خیریت معلوم کر سکے اور پھر وہ بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر جشن فتح منائے ۔ لیکن اس کے

انتظار کی یہ گھڑیاں طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہ آیا۔ آخرکار وہ میدانِ جنگ میں گھس گئی۔ وہ مقتولین کے چہروں کو بغور دیکھتی پھر رہی تھی، اچانک اس کی نگاہ اپنے شوہر کے جسد بے رُوح پر پڑی جو اپنے خون میں لت پت زمین پر پڑا تھا۔ وہ کسی خوف زدہ شیرنی کی طرح پورے میدان میں تیزی سے اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ وہ اپنے بیٹوں مُسافع، کلاب اور جلاس کی تلاش میں ہر سمت اپنی نظریں دوڑاتی رہی اور آخرکار انھیں دیکھ ہی لیا۔ وہ کوہِ احد کی تلی میں زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے مسافع اور کلاب تو اپنا سفرِ حیات ختم کرچکے تھے البتہ جلاس کو اس نے اس حال میں پایا کہ اس کی زندگی کی آخری سانسیں ابھی باقی تھیں، سُلافہ اپنے بیٹے کے اُوپر جُھک گئی جو سکرات موت سے نبرد آزما تھا۔ اس نے جلاس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے مُنہ اور پیشانی سے خون صاف کرنے لگی۔ اس غم انگیز منظر کی ہولناکی سے آنسو اس کی آنکھوں سے خشک ہوچکے تھے۔ وہ جلاس کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئی بولی۔

"میرے لال! کس نے تجھے پچھاڑا ہے؟"

جلاس جواب دینا چاہتا تھا لیکن عالم نزع کی خرخراہٹ اس کے آڑے آگئی اور وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ سلافہ نے باربار اور اصرار کے ساتھ پوچھا تو اس نے بمشکل صرف اتنا کہا "مجھے عاصمؓ بن ثابت نے پچھاڑا ہے۔ اور . . . . اور میرے بھائی مسافع کو بھی۔ اور . . ." اور جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی اس نے آخری ہچکی لی اور اس کا جسم بے جان ہوگیا۔

سلافہ بنت سعد اس صورت حال کو دیکھ کر دیوانی ہوگئی۔ وہ بآواز بلند چیخ چیخ کر رونے لگی اور اس نے لات و عزیٰ کی قسم کھا کر کہا۔

"جب تک قریش اس کے لیے عاصمؓ بن ثابت سے انتقام نہ لے لیں اور اس کو شراب پینے کے لیے عاصم کی کھوپڑی نہ دے دیں، نہ اس کی بے قراری کو قرار نصیب ہوگا، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو خشک ہوں گے۔ پھر اس نے نذر مانی کہ

"جو شخص عاصم بن ثابت کو زندہ گرفتار کر کے لائے گا یا قتل کر کے اس کا سر پیش کرے گا وہ اسے مالا مال کر دے گی۔"

اس کی یہ نذر قریش میں مشہور ہو گئی اور مکہ کے ہر جیالے اور قسمت آزما نوجوان کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لینے لگی کہ کاش وہ عاصم بن ثابت کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا یا اس کا سر سُلافہ کے سامنے پیش کر کے اس کے اعلان کردہ انعام کا مستحق قرار پاتا۔

جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد مسلمان مدینہ واپس لوٹ آئے۔ وہ جنگ اور اس میں پیش آنے والے واقعات کا آپس میں ذکر کرتے، ان بہادروں کے لیے اظہار ہمدردی وغم گساری کرتے جو جنگ میں جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اور ان لوگوں کے حق میں تعریفی کلمات کہتے جنھوں نے غیر معمولی جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کیا اور شمشیر زنی کے جوہر دکھائے۔ وہ خاص طور سے حضرت عاصم ابن ثابت رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے اور اس بات پر اظہار حیرت کرتے کہ "ان کے لیے کس طرح یہ ممکن ہوا کہ انھوں نے ایک ہی گھر کے تین حقیقی بھائیوں کو خاک وخون میں لٹایا اور ان کے علاوہ بھی کئی ایک کو موت کے گھاٹ اُتارا۔"

یہ سُن کر انھیں میں سے کسی نے کہا:۔

اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ کیا آپ لوگوں کو یہ بات یاد نہیں ہے کہ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے کچھ پہلے ہم لوگوں سے دریافت فرمایا تھا کہ "تم لوگ قتال کس طرح کرو گے؟ تو اس وقت عاصمؓ بن ثابت نے کمان ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا:

"جب دشمن ہم سے سو ہاتھ کے فاصلے پہ ہوگا تو ہم تیراندازی سے کام لیں گے اور جب وہ قریب آجائیں گے اور ہمارے نیزوں کی پہنچ کے دائرے میں

ہوں گے تو نیزہ بازی ہوگی حتیٰ کہ نیزے ٹوٹ جائیں گے، اور جب نیزے ٹوٹ جائیں گے تو ہم انھیں پھینک کر اپنی تلواریں بے نیام کریں گے اور پھر شمشیر زنی کے ہاتھ دکھائیں گے۔" تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"هٰكَذَا الْحَرْبُ ..... مَنْ قَاتَلَ فَلْيُقَاتِلْ كَمَا يُقَاتِلُ عَاصِمُ بْنُ ثَابِتٍ." یہ ہے جنگ کا صحیح طریقہ۔ جس کو قتال کرنا ہو وہ عاصمؓ بن ثابت کی طرح قتال کرے۔

جنگ اُحد کے کچھ دنوں بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص مہم پر بھیجنے کے لیے چھ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کو طلب فرمایا اور حضرت عاصمؓ بن ثابت کو ان کا امیر مقرر کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں پاک نفس انسانوں کی یہ مختصر سی جماعت روانہ ہوگئی۔ وہ اپنے اس سفر کے دوران مکہ کے قریب ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ قبیلۂ بنو ہذیل کے کچھ لوگوں کو ان کی خبر ہوگئی۔ خبر ملتے ہی وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف دوڑ پڑے اور انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور محاصرین سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ بنو ہذیل نے کہا کہ " تم لوگ ہم سے مقابلہ نہیں کر سکو گے اور نہ ہم سے لڑ کر اپنی جانیں ہی بچا سکو گے تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ تم اپنے ہتھیار رکھ دو۔ واللہ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، ہم اپنے اس عہد پر خدا کو گواہ بناتے ہیں۔"

اصحاب رسولؐ نے یہ سن کر ایک دوسرے کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا تب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"خدا کی قسم میں تو کسی مشرک کے عہد و پیمان پر اعتماد کرکے خود کو اس کے

حوالے نہیں کرسکتا پھر انہوں نے دل ہی دل میں سلافہ بنت سعد کی نذر کو یاد کیا اور یہ کہتے ہوئے تلوار سونت لی۔

"اللھم انی احمی لدینک وادافع عنہ فاحم لحمی وعظمی ولا تظفر بہما احدا من اعداء اللہ....."

"خدایا! میں تیرے دین کی حمایت میں کھڑا ہوں اور اس کی طرف سے مدافعت کر رہا ہوں۔ خدایا! میرے گوشت اور ہڈی کو دشمنان خدا سے محفوظ رکھنا اور ان پر کسی کو قابو نہ دینا۔"

پھر وہ بنو ہذیل پر ٹوٹ پڑے۔ اس حملے میں ان کے دو ساتھیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ لوگ دشمن سے برابر لڑتے رہے اور ایک ایک کرکے تینوں شہید ہوگئے۔ ان کے باقی ساتھیوں نے اپنے آپ کو دشمنوں کے حوالے کر دیا لیکن انھوں نے اپنے عہد و پیمان کو پورا نہ کیا اور ان کے ساتھ بدترین قسم کی غداری اور بدعہدی کے ساتھ پیش آئے۔

ہذیل والوں کو پہلے یہ بات معلوم نہ تھی کہ ان کے ہاتھوں قتل ہونے والوں میں سے ایک عاصمؓ بن ثابت بھی ہیں۔ بعد میں جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس کے بدلے وہ ایک بڑا انعام حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے کیونکہ سلافہ بنت سعد نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر وہ عاصم بن ثابت پر قابو پا جائے گی تو اس کے کاسۂ سر میں شراب پیے گی اور اس نے عاصم کو زندہ یا مُردہ کسی حالت میں اپنے سامنے پیش کرنے والے کو منہ مانگا انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند گھنٹوں کے اندر اندر قریش کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ کیونکہ ہذیل کا قبیلہ مکہ کے قریب ہی آباد تھا۔ یہ خبر ملتے ہی سرداران قریش نے قاتلین عاصم کے پاس ان کا سر لانے

کے لیے ایک قاصد بھیجا تاکہ سلافہ بنت سعد کی آتشِ انتقام کو فرو کرسکیں اس کی نذر پوری کرسکیں اور اس کے تینوں بیٹوں کا غم کچھ ہلکا کرسکیں جن کو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا، انھوں نے چلتے ہوئے قاصد کو ایک بڑی رقم دیتے ہوئے اُسے اس بات کی تاکید کی تھی کہ وہ بے دریغ مال خرچ کرکے ہر قیمت پر بنو ہذیل سے عاصمؓ بن ثابت کا سَر حاصل کرے۔

بنو ہذیل جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کا سر جسم سے جُدا کرنے کے لیے ان کی لاش کے پاس پہنچے تو یکایک وہ شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کے ایک جھنڈ کا سامنا کر رہے تھے جو ہر طرف سے اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ یہ لوگ جب بھی لاش کے قریب آنے کی کوشش کرتے وہ مکھیاں اور بھڑیں اڑ کر ان کے چہروں، آنکھوں اور جسم کے مختلف حصّوں پر ڈنک مارتیں اور انھیں وہاں سے دُور بھاگ جانے پر مجبور کردیتیں۔ کئی بار کی پیہم کوشش کے باوجود جب وہ لوگ اس لاش کے قریب پہنچنے سے مایوس ہوگئے تو اُنھوں نے آپس میں کہا کہ فی الحال اسے یونہی چھوڑ دو اور رات کا اندھیرا پھیل جانے دو۔ رات کی تاریکی میں یہ بھڑیں خود ہی اس کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ اور اُس وقت ہم بآسانی اپنا مقصد حاصل کرلیں گے۔ چنانچہ وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ کر شب کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

دن ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور رات کی آمد میں ابھی دیر تھی کہ دیکھتے دیکھتے آسمان پر گھنگھور گھٹاؤں کی دبیز چادر تن گئی، فضا گہری تاریکی میں ڈوب گئی اور ماحول بجلی کی زوردار اور پیہم گرج سے لرزنے لگا۔ اور پھر موسلادھار بارش کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوگیا جیسے آسمان کے بند ٹوٹ گئے۔ ہوں، نالوں میں پانی تیزی کے ساتھ بہنے لگا، وادیاں اور گھاٹیاں سب جل تھل

ہوگئیں اور پانی کا ریلا سیلِ عرم کی طرح زمین پر پڑی ہوئی ہر چیز کو اپنے ساتھ بہائے لیے چلا گیا۔

صبح کو بنو ہذیل حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی لاش کو ہر طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے مگر انھیں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سیلاب کی موجیں اسے دور بہت دور نہ جانے کہاں بہا کر لے گئیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کی دعا کو شرف قبولیت سے نوازا اور ان کے جسد اطہر کو مسخ ہونے سے بچالیا اور ان کے سر مبارک کو اس بات سے محفوظ رکھا کہ ان کی کھوپڑی میں شراب پی جائے، اور اس نے مشرکوں کو مسلمانوں پر غالب آنے کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا

یہ کون انتہائی صائب الرائے، سنجیدہ و باوقار اور معزز خاتون ہیں جو ہزاروں مردوں پر بھاری ہیں؟ یہ کون شیر دل صحابیہ ہیں جنھوں نے اسلام میں سب سے پہلے کسی مشرک کو قتل کیا؟ یہ کون دُور اندیش خاتون ہیں جن کے ہاتھوں اس اولین شہسوار کی نشو و نما ہوئی جس نے اللہ کی راہ میں اپنی تلوار کو بے نیام کیا؟

یہ ہیں رسول اللہ ؐ کی پھوپی، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا۔

مجد و شرف نے ہر طرف سے ان کا احاطہ کر رکھا تھا۔ ان کے والد تھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جدّ محترم، قریش کے لیڈر اور اس کے ہر دل عزیز سردار عبدالمطلب بن ہاشم، ان کی والدہ تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہالہ بنت وہب اور ان کے پہلے شوہر تھے ابوسفیان بن حرب کے بھائی، حارث بن حرب، جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے دوسرے شوہر تھے دورِ جاہلیت میں عرب خواتین کی سردار اور پہلی اُم المومنین حضرت خدیجہ بنت خویلد کے بھائی عوّام بن خویلد اور ان کے بیٹے تھے حواری رسولؐ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ۔ اس کے بعد شرفِ ایمان کے علاوہ مجد و شرف کا اور کون سا درجہ باقی رہ جاتا ہے جس کے حصول کی تمنا کسی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔

ان کے شوہر عوّام بن خویلد کی وفات کے وقت ان کے صاحب زادے

"زبیر" ایک کم سن بچے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد زبیر کی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داری ان کی ماں حضرت صفیہؓ کے اوپر آن پڑی۔ اور انھوں نے ان کی تعلیم و تربیت میں اُن خطوط کو اپنے سامنے رکھا جن پر آگے چل کر ان کے اندر سخت کوشی، جفاکشی اور شہ زوری و شہسواری کی صلاحیتوں کا ارتقا ہو۔ چنانچہ دوسرے بچکانہ کھیلوں کے بجائے وہ اُن کو تیر اندازی اور کمانوں کی مرمت کا کھیل کھلایا کرتی تھیں۔ وہ ان کی تربیت کے معاملے میں اپنا رویہ نہایت سخت رکھتیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کی نرمی کو راہ دینے کی روادار نہ تھیں۔ وہ برابر ان کو خوف ناک اور پُرخطر جگہوں میں داخل کرتیں اور جب ان کے اندر کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھجک محسوس کرتیں تو بڑی سخت مار مارتی تھیں یہاں تک کہ ایک دفعہ زبیر کے ایک چچا نے اپنی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت صفیہ سے کہا کہ بچوں کو اِس طرح بے دردی کے ساتھ نہیں مارا جاتا۔ تم تو بچے کو اس طرح مارتی ہو جس سے ماں کی ممتا اور پیار کے بجائے غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس احتجاج کو رد کرتے ہوئے کہا۔

مَنْ قَالَ قَدْ اَبْغَضْتُهُ فَقَدْ كَذَبْ وَإِنَّمَا اَضْرِبُهُ لِكَیْ یَلِبْ وَیَهْزِمَ الْجَیْشَ وَیَاْتِیْ بِالسَّلَبْ۔

جس نے کہا کہ میں اس کے اوپر اپنے غصے کا اظہار کرتی ہوں، اس نے غلط کہا۔ میں تو اس کو صرف اس لیے مارتی ہوں کہ یہ چالاک اور ہوشیار ہو جائے۔ اور لشکر کو شکست دے کر مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق و ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، ان کو لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اور ان کو اپنے اعزہ واقربا سے اپنی دعوتی سرگرمیوں کا آغاز کرنے کا حکم دیا تو آپؐ نے بنی عبدالمطلب کے

سارے مردوں، عورتوں، بڑوں اور چھوٹوں کو جمع کرکے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"یَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ، یَا صَفِیَّۃُ بِنْتُ عَبْدِالمُطَّلِب، یَا بَنِی عَبْدِ المُطَّلِبِ اِنِّی لَا اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللہِ شَیْئًا۔"

"اے فاطمہ بنت محمدؐ! اے صفیہ بنت عبدالمطلب! اے آلِ عبدالمطلب! میں خدائے تعالیٰ کے سامنے تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا۔"

پھر آپؐ نے ان کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کی دعوت دی تو کچھ لوگوں نے اس نورِ خداوندی کو قبول کرلیا اور کچھ لوگوں نے اس سے اعراض کیا حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تصدیق کرنے والے اہلِ ایمان کے پہلے گروہ میں شامل تھیں۔ اور اس وقت انھوں نے مجد و شرف کو ہر طرف سے سمیٹ لیا۔ ان کو نسبی شرافت کے ساتھ اسلام کا اعزاز بھی حاصل ہوگیا۔

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا اور ان کے نوجوان صاحبزادے حضرت زبیرؓ بن عوام نکہت و نور کے اس قافلے میں شریک ہوگئے اور ان تمام شدائد و مصائب کا سامنا کیا جو کفارِ قریش کے ہاتھوں السابقون الاولون کو برداشت کرنے پڑرہے تھے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو ہجرت مدینہ کی اجازت دی تو دودمانِ ہاشم کی اس معزز خاتون نے مکہ کی اپنی تمام خوبصورت یادوں اور خاندانی و موروثی شرافتوں اور قابلِ فخر یادگاروں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور خدا و رسول کے لیے ہجرت کی نیت سے صرف اپنے دین کو لے کر مدینہ کی جانب روانہ ہوگئیں۔

اس وقت حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے جہاد کے مختلف میدانوں میں ایسے ایسے عظیم الشان

کارنامے انجام دیے جن کا ذکر اسلامی تاریخ ہمیشہ حیرت کے ساتھ کرتی رہے گی اور ان کی تعریف میں ہمارے مورخین برابر رطب اللسان رہیں گے۔ ہمارے لیے یہاں اُن میں سے صرف دو کارناموں کا ذکر کافی ہے۔ ان میں سے پہلے کا تعلق غزوۂ اُحد اور دوسرے کا تعلق جنگِ خندق سے ہے۔

غزوہ اُحد کے موقع پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا مسلمان خواتین کی ایک ٹولی میں شامل ہو کر مجاہدین کے لشکر کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکلیں۔ اس موقع پر وہ پیاسوں کو پانی پلانے کے علاوہ تیروں کی درستی اور کمانوں کی اصلاح و مرمت کی خدمت بھی انجام دے رہی تھیں اس کے علاوہ ان کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ وہ تمام جنگی کارروائیوں کا بچشم خود مشاہدہ کر سکیں۔ اور اس میں تعجب کی کوئی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ خود ان کے بھتیجے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بھائی حضرت حمزہ ابن عبد المطلبؓ اور بیٹے حضرت زبیرؓ بن عوام حواریِ رسولؐ بھی اس جنگ میں شریک تھے۔ اور ان تمام باتوں سے بڑھ کر اور ہر چیز سے پہلے اس معرکے سے اس اسلام کا مستقبل وابستہ تھا جس کو انھوں نے بہ رضا و رغبت قبول کیا تھا۔

جب انھوں نے دیکھا کہ ایک قلیل تعداد کے علاوہ سارے مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور قریب تھا کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر آپ کی زندگی کی شمع کو گل کر دیں تو انھوں نے اپنا مشکیزہ زمین پر پھینک دیا اور اُس بپھری ہوئی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑیں جس کے بچوں پر حملہ کر دیا گیا ہو۔ انھوں نے ایک بھاگتے ہوئے مسلمان کے ہاتھ سے اس کا نیزہ چھینا اور دشمن کی صفوں کو چیرتی، نیزے سے حملہ کرتی اور گرج کر یہ کہتی ہوئی آگے بڑھیں۔

"وَيحَكُمْ اِنهَزَمتُم عَن رَسُولِ اللّٰهِ؟" "تمہارا بُرا ہو، کیا تم لوگ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہو؟"

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آگے بڑھتے دیکھا تو آپ کو اس بات کا اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان کی نگاہیں اپنے بھائی حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی لاش پر نہ پڑ جائیں جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور مشرکین نے مثلہ کرکے اس کی شکل بُری طرح بگاڑ دی تھی۔ اس لیے ان کے بیٹے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"زبیر! اپنی ماں کو روکو، اُن کو ادھر نہ آنے دو۔" تو انھوں نے آگے بڑھ کر ان کو روکتے ہوئے کہا۔

"امّی! پیچھے ہٹیے، ادھر نہ آئیے۔" مگر انھوں نے ان کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"پرے ہٹ جا۔" تو حضرت زبیرؓ نے کہا۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ آپ واپس لوٹ جائیں۔"

"مگر کیوں؟ مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ میرے بھائی کی لاش کا مثلہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ تو خدا کی راہ میں ہوا ہے۔" انھوں نے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ان کا راستہ چھوڑ دو۔" اور وہ ان کے راستے سے ہٹ گئے۔

جنگ کے خاتمے پر جب انھوں نے اپنے بھائی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش پر کھڑے ہو کر دیکھا کہ اُن کا پیٹ چاک کرکے ان کا کلیجہ نکال لیا گیا ہے، کان اور ناک کاٹ لیے گئے ہیں اور چہرہ مسخ کر دیا گیا ہے تو ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، میں اس کے فیصلے پر راضی ہوں۔ خدا

کی قسم میں صبر کروں گی اور اسی سے اجر کی اُمید رکھوں گی۔"

یہ تھا حضرت صفیہ بنتِ عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کا وہ رول جو انھوں نے غزوۂ احد میں ادا کیا۔ اور جو کردار انھوں نے جنگِ خندق کے موقع پر پیش کیا تھا اس کی داستان بھی نہایت جرأت آفریں اور حیرت انگیز ہے جس کا تانا بانا ذہانت و ہوشمندی اور شجاعت و دور اندیشی نے مل کر تیار کیا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو اس اندیشے سے کہ کہیں کوئی غدار ان کے محافظوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر غداری پر آمادہ نہ ہوجائے، عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ قلعے میں رکھ دیتے تھے۔ چنانچہ حسبِ معمول غزوۂ خندق کے موقع پر بھی آپؐ نے اپنی ازواج، اپنی پھوپھی اور کچھ دوسری مسلمان خواتین کو ان کی حفاظت کے پیشِ نظر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ایک قلعے میں ــــ جو اُن کے آبا و اجداد سے وراثت میں ان کو ملا تھا اور مدینے کے قلعوں میں سب سے محفوظ اور دشمن کی پہنچ سے بہت دور تھا ــــ بھیج دیا۔

اس اثنا میں کہ مسلمان، قریش اور اس کے حلیف قبائل کے مقابلے میں خندق کے اطراف پہرہ دینے اور دشمن کے ساتھ جنگی مصروفیات کی وجہ سے عورتوں اور بچوں کی حفاظت سے غافل ہو گئے تھے، حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے رات کے پچھلے پہر کی تاریکی میں ایک انسانی وجود کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے اس کی طرف اپنے کان لگائے اور اسے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی یہودی ہے جو قلعے کی طرف آرہا ہے۔ وہ قلعے کے حالات معلوم کرنے اور اس کے اندر موجود لوگوں کی ٹوہ لینے کے لیے اس کے گرد چکر لگانے لگا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا فوراً سمجھ گئیں کہ یہ اپنی قوم کا جاسوس ہے اور

یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ آیا قلعے میں صرف عورتیں اور بچے ہی ہیں یا ان کی حفاظت کے لیے کچھ مرد بھی موجود ہیں۔ اس حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے دل میں کہا۔

"بنو قریظہ کے یہودی یقیناً اس عہد کو توڑ کر، جو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان تھا، مسلمانوں کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں کی مدد پر آمادہ ہو چکے ہیں۔ اور ہمارے اور ان غداروں کے درمیان ایک بھی مسلمان نہیں ہے جو ان کے مقابلے میں ہماری مدافعت کر سکے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہل ایمان دشمن کے سامنے سینہ سپر ہیں۔ ایسی صورت میں اگر یہ اللہ کا دشمن ہماری صحیح صورت حال اپنی قوم کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو یہودی مسلمان عورتوں کو گرفتار کر لیں گے اور بچوں کو غلام بنا لیں گے اور یہ مسلمانوں کے لیے بہت بڑی مصیبت ہو گی۔"

اس وقت انھوں نے اپنے دوپٹے کو اچھی طرح سر پر لپیٹا، کپڑوں کو کمر سے کس کر باندھا، کندھے پر خیمے کا ایک ستون رکھا اور قلعے کے دروازے کی طرف اتر گئیں۔ پھر نہایت آہستگی اور پوری احتیاط کے ساتھ اسے کھولا اور ہوشیاری کے ساتھ دروازے کے شگاف سے اس کا انتظار کرنے لگیں۔ جب وہ ایسی پوزیشن میں آگیا جہاں ان کے لیے اس پر قابو پا لینے کا پختہ یقین ہو گیا تو انھوں نے پوری ہوشیاری کے ساتھ اس کے اوپر حملہ کیا اور اس کے سر پر ستون سے ایک بھرپور وار کر کے اسے زمین بوس کر دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے مسلسل کئی ضربیں لگا کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔ پھر خنجر نکال کر اس کے سر کو تن سے جدا کیا اور اس کو بلندی سے نیچے پھینک دیا جو قلعے کے دامن میں لڑھکتا ہوا ان یہودیوں کے سامنے جا کر رک گیا جو نیچے اس کا انتظار کر رہے

تھے۔ جب انھوں نے اپنے ساتھی کے کٹے ہوئے سر کو دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا۔

"ہم جانتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عورتوں اور بچوں کو ان کے محافظوں کے بغیر چھوڑنے والے نہیں ہیں۔"

پھر وہ واپس لوٹ گئے۔

اللہ تعالیٰ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب سے راضی ہو۔ انھوں نے مسلمان عورتوں کے لیے انوکھی مثالیں قائم کی ہیں۔ انھوں نے اکلوتے بیٹے کی بہترین تربیت کی، اپنے حقیقی بھائی کی موت کا صدمہ بڑی خندہ پیشانی اور صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور شدائد و آلام نے بار بار ان کی آزمائش کی مگر ہر بار انھیں ایک دور اندیش، عقل مند اور بہادر عورت پایا۔ پھر تاریخ نے اپنے بہترین صفحات میں ان کے متعلق لکھا۔

"اِنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ كَانَتْ اَوَّلَ اِمْرَأَةٍ قَتَلَتْ مُشْرِكًا فِي الْاِسْلَامِ۔"

"حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا اسلام کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے ایک مشرک کو قتل کیا۔"

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہٗ

امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نماز عشاء سے فارغ ہو کر اپنی خواب گاہ میں تشریف لائے۔ وہ تھوڑی دیر آرام کر لینا چاہتے تھے تاکہ رات کو گشت کرنے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔ لیکن نیند اس وقت خلیفہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کیونکہ قاصد ان کے پاس یہ خبر لے کر آیا تھا کہ مسلمانوں کے سامنے سے شکست کھا کر راہ فرار اختیار کرنے والی ایرانی فوج پر اسلامی لشکر جب بھی کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتا ہے۔ اُس کے پاس اِدھر اُدھر سے کمک پہنچ جاتی ہے جس سے اس کی کھوئی ہوئی قوت بحال ہو جاتی ہے اور وہ از سرِ نو قتال شروع کر دیتی ہے۔ خلیفہ کو یہ بات بھی بتائی گئی کہ شہر اُبلہ کا شمار ان اہم ترین مراکز میں ہوتا ہے جہاں سے ایرانیوں کے ہزیمت خوردہ لشکر کو مالی اور افرادی قوت فراہم کی جاتی ہے۔

اِس صورت حال سے نمٹنے کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابلہ کی فتح اور ایرانی فوج کو ملنے والی مدد کے سلسلے کو منقطع کرنے کے لیے ایک فوج بھیجنا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت ان کے پاس لڑنے کے قابل آدمیوں کی سخت کمی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت مختلف علاقوں

میں جہاد کے لیے جا چکی تھی۔ اس وجہ سے ان کے پاس مدینے میں قابل جنگ مسلمانوں کی بہت ہی قلیل تعداد باقی رہ گئی تھی۔ اس لیے انھوں نے ایسی حکمت عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جس کے لیے وہ معروف تھے۔ یعنی " قائد لشکر کی قوت کے ذریعہ قلّتِ فوج کی تلافی کرنا" چنانچہ انھوں نے اپنے ترکش کے تمام تیروں کو اپنے سامنے بکھیر دیا اور ایک ایک کر کے ہر ایک کو آزمانے لگے۔ آخر کار تھوڑی دیر کے بعد پکار اُٹھے۔

" میں اُس کو پا گیا۔ ہاں میں نے اُسے پالیا "

پھر وہ زیر لب یہ کہتے ہوئے اپنے بستر کی طرف چلے گئے۔

" وہ ایسا مرد مجاہد ہے جس کی شجاعت و بسالت اور جرأت و مردانگی کے گواہ بدر و اُحد اور خندق و یمامہ کے میدانہائے کارزار ہیں۔ نہ اس کی تلوار کا وار کبھی چوکا نہ اس کے تیر کا نشانہ کبھی خطا ہوا۔ پھر یہ کہ اس نے دو ہجرتیں کیں اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والوں میں وہ ساتواں شخص ہے۔"

صبح کو انھوں نے حضرت عُتبہؓ ابن غزوان کو بلا بھیجا۔ جب حضرت عتبہؓ بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے تو امیرالمومنین نے ایک مختصر سی فوج کی قیادت ان کے سپرد فرمائی جس کی تعداد تین سو سے کچھ زیادہ تھی اور وعدہ فرمایا کہ وہ بعد میں مزید کچھ آدمی ان کی مدد کے لیے بھیجتے رہیں گے۔

جب اس چھوٹے سے لشکر نے روانگی کا قصد کیا تو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کے قائد حضرت عتبہ ابن غزوانؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

" عتبہ! میں تم کو سرزمین اُبلہ کی طرف روانہ کر رہا ہوں۔ اُبلہ دشمن کے محفوظ ترین شہروں میں سے ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی فتح میں تمہیں اپنی نصرت سے نوازے گا۔ جب تم وہاں پہنچنا تو پہلے اس کے باشندوں کو خدا کے

دین کی طرف دعوت دینا۔ ان میں سے جو بھی تمہاری دعوت پر لبیک کہے اسے قبول کرلینا اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کرے اس سے ذلّت و رسوائی کے ساتھ جزیہ وصول کرنا۔ لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہ ہوں تو اُن سے قتال کرنا۔ اور اس میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی سے کام نہ لینا" حضرت عمرؓ نے نصیحت کے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا۔

"عتبہ! تم اپنی قائدانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اور اس بات سے ہمیشہ ہوشیار رہنا کہ کہیں تمہارا نفس تم کو کبر و غرور میں مبتلا کرکے تمہاری آخرت کو تباہ نہ کردے۔ تمہیں اس بات کا ہمیشہ احساس رہنا چاہیے کہ تم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے سرفراز ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ذلت کو عزت اور تمہاری کمزوری کو طاقت میں بدل دیا۔ یہاں تک کہ تم ایک بااختیار امیر اور ایک قابلِ اطاعت قائد بن گئے کہ جب تم کوئی بات کہتے ہو تو وہ بغور سُنی جاتی ہے اور کوئی حکم دیتے ہو تو اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ بشرطیکہ تم کو غرور اور فریب نفس میں مبتلا کرکے جہنم میں نہ جھونک دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو اس سے محفوظ رکھے۔"

حضرت عتبہؓ اپنی مختصر فوج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کی اہلیہ اور بعض دوسرے مجاہدین کی بیویاں اور بہنیں بھی تھیں جن کی تعداد پانچ تھی۔ ان لوگوں نے ایک ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں نرکل کے بہت زیادہ پودے تھے۔ یہ جگہ شہر اُبلہ سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اُس وقت ان لوگوں کے پاس کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ جب یہ لوگ بھوک سے بے تاب ہوگئے تو حضرت عتبہؓ نے چند آدمیوں سے کہا کہ وہ اُس سرزمین میں کوئی ایسی چیز تلاش کریں جس کو ہم کھا سکیں۔ تو وہ لوگ اُٹھے اور خوراک کی تلاش میں نکل پڑے۔ اس تلاش و جستجو اور

حصولِ غذا کی کہانی ان میں سے ایک مجاہد نے یوں بیان کی ہے ۔

" دریں اثنا کہ ہم لوگ کسی قابلِ خوراک چیز کی تلاش میں پھر رہے تھے ۔ایک جھاڑی میں گھس گئے ۔اس جھاڑی میں ہم کو دو بورے ملے ۔ ان میں سے ایک بورے میں کھجوریں تھی اور دوسرے بورے میں سفید سفید چھوٹے چھوٹے دانے تھے ۔ جو زرد رنگ کے چھلکوں سے ڈھکے ہوئے تھے ۔ ہم ان دونوں بوروں کو کھینچتے ہوئے لشکر کے قریب لائے ، ہمارے ایک فوجی نے جب اس بورے کو دیکھا جس میں دانے تھے تو بولا کہ یہ کوئی زہریلی چیز ہے جس کو دشمنوں نے ہمارے لیے رکھا ہے ۔اس کے قریب نہ جانا ۔ ہم لوگ اس کو چھوڑ کر کھجور پر ٹوٹ پڑے اور اس کو کھانے میں مشغول ہو گئے ۔ابھی ہم کھجوروں کو کھا ہی رہے تھے کہ ایک گھوڑا اپنی رسی تڑا کر اس بورے کے پاس پہنچ گیا اور اس میں سے کھانے لگا ۔ ہم نے چاہا کہ مرنے سے پہلے اس کو ذبح کر دیں تاکہ اس کا گوشت ہمارے کھانے کے کام آجائے ۔ مگر اس گھوڑے کے مالک نے کہا کہ اسے چھوڑ دو ۔ میں رات میں اس کی نگرانی کرتا رہوں گا ۔ اگر مجھے اس کے مرنے کا اندیشہ ہوا تو اسے ذبح کر دوں گا ۔ صبح کو ہم نے دیکھا کہ گھوڑا بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست ہے ۔ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے ۔

میری بہن نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان ! میں نے ابا کو یہ کہتے سُنا ہے کہ اگر زہریلی چیز کو آگ پر رکھ کر پکا دیا جائے تو وہ نقصان نہیں پہنچاتی ۔ پھر اس نے تھوڑے سے دانے لیے اور انھیں ایک دیگچی میں رکھ کر اس کے نیچے آگ جلا دی ۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ پکار اُٹھی ۔ " ادھر آؤ " دیکھو کس طرح اس کا رنگ سُرخ ہوا ۔ پھر اس کا چھلکا پھٹا اور اس میں سے سفید دانہ نکل آیا ۔" پھر جب کھانے کے لیے ہم نے اس کو ایک طشت میں رکھا تو عتبہؓ نے ہم سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر کھاؤ ۔ ہم نے اس کو کھایا ۔ وہ نہایت لذیذ اور مزیدار تھا ۔ پھر بعد میں ہم کو معلوم ہوا کہ اُس دانے کا

نام دھان ہے۔"

اُبلہ جس کو فتح کرنے کے لیے حضرت عتبہؓ اپنی فوج کے ساتھ آئے تھے، ایک مضبوط اور مستحکم شہر تھا جو دریائے دجلہ کے کنارے آباد تھا۔ اہل فارس نے اس کو اپنے اسلحوں کی ذخیرہ گاہ بنا رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کی نگرانی کے لیے اس کی فصیلوں پر بُرجیاں بنا رکھی تھیں، جہاں سے وہ حملہ آوروں پر دور ہی سے نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن مقابلین کی قلتِ تعداد اور سامانِ حرب کی کمی کے باوجود یہ سارے انتظامات حضرت عتبہؓ کو ان کے اوپر حملہ کرنے سے نہ روک سکے۔ اُس وقت حضرت عتبہؓ کے پاس لڑنے والوں کی تعداد چھ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ اور اُن میں چند عورتیں بھی شامل تھیں۔ ان کے پاس تلواروں اور نیزوں کے علاوہ دوسرے اسلحے بھی نہیں تھے۔ اس لیے اس کی تلافی کے لیے ان کو اپنی ذہانت اور فوجی سوجھ بوجھ کا استعمال ناگزیر تھا۔

اُنھوں نے کچھ جھنڈے بنائے اور انھیں نیزوں پر لگا کر عورتوں کے حوالے کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ ان جھنڈوں کو لے کر فوج کے پیچھے پیچھے چلیں۔ اور ان کو اس بات کی ہدایت کی کہ جب ہم لوگ شہر کے قریب پہنچ جائیں تو وہ ہمارے پیچھے خوب گرد وغبار اُڑائیں۔ اتنی کہ اس سے پوری فضا ڈھک جائے۔ پھر جب یہ لوگ شہر کے قریب پہنچے تو ایرانی دروازہ کھول کر شہر سے باہر نکلے اور انھیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ لیکن جب انھوں نے ان جھنڈوں کو ان کے پیچھے حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور فضا کو گرد وغبار سے اٹا ہوا پایا تو باہم ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ فوج کا ہراول دستہ ہے۔ اس کے پیچھے ایک لشکرِ جرار ہے جو گرد وغبار اڑاتا چلا آرہا ہے۔ اور ہم لوگ تعداد میں بہت کم ہیں۔ ان کے دلوں میں بزدلی سرایت کر گئی اور ان کے اوپر خوف وہراس مسلط ہو گیا۔ پھر تو وہ اپنے ہلکے پھلکے

اور بیش قیمت سامان سمیٹ کر ان کشتیوں کی طرف تیزی سے لپکے جو دریائے دجلہ کے ساحل پر کھڑی تھیں۔ اور ان پر سوار ہو کر انھوں نے راہِ فرار اختیار کرلی۔ اور حضرت عتبہؓ کسی جنگ و جدال کے بغیر اُبلہ پر قابض ہو گئے اور انھیں اپنا ایک آدمی بھی ضائع نہیں کرنا پڑا۔ پھر اُس کے اردگرد کے شہروں اور آبادیوں کو فتح کرلیا۔ اس موقع پر بے شمار و بے اندازہ مالِ غنیمت ان کے ہاتھ آیا۔ ان فوجیوں میں سے ایک شخص جب مدینے واپس آیا اور لوگوں نے اس سے دریافت کیا کہ اُبلہ میں مُسلمانوں کا کیا حال ہے؟ تو اُس نے کہا کہ تم کس کے متعلق پوچھ رہے ہو؟ خدا کی قسم میں ان کو اس حال میں چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ لوگ سونے اور چاندی کے وزن کرنے کے بجائے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ یہ سُن کر لوگوں نے اپنی سواریوں کے رُخ ابلہ کی طرف کر دیے۔

اُس وقت حضرت عتبہ ابن غزوانؓ نے محسوس کیا کہ اگر ان کے فوجی ان مفتوحہ علاقوں میں سکونت پذیر ہو گئے تو یہ آرام طلبی اور تن آسانی کے عادی ہو جائیں گے اور یہاں کے باشندوں کے طور اختیار کر کے رُوحِ جہاد سے یکسر عاری ہو جائیں گے اور ان کے اندر حرب و ضرب اور قتال و جہاد کے جذبات کمزور پڑ جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے خط لکھ کر امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ سے شہر بصرہ کی تعمیر کی اجازت طلب کی۔ اور جس جگہ پر وہ اس شہر کو بسانا چاہتے تھے اس کے بارے میں مفصل معلومات خلیفہؓ کو فراہم کیں تو خلیفہ نے ان کو اس کی اجازت مرحمت فرما دی۔

حضرت عتبہؓ نے نئے شہر کی پلاننگ کی اور سب سے پہلے اس کی عظیم الشان مسجد کی تعمیر کی۔ اور اس میں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اور ان کے ساتھی راہ خدا میں جہاد کرنے کے لیے مسجد ہی کے واسطے تو نکلے تھے۔ اور اسی مسجد ہی کی وجہ سے تو ان کو اور ان کے ساتھیوں کو دشمنانِ خدا پر فتح و

کامرانی حاصل ہوئی تھی۔

پھر لوگ زمین کے پلاٹوں کے حصول اور مکانات کی تعمیر میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ لیکن خود حضرت عتبہؓ نے اپنے واسطے کوئی مکان نہیں بنوایا۔ وہ مستقل طور پر کمبلوں سے بنے ہوئے ایک خیمے میں سکونت پذیر رہے۔ کیونکہ وہ اپنے دل میں پہلے ہی سے کوئی بات طے کر چکے تھے........

حضرت عتبہؓ نے دیکھا کہ بصرہ میں مسلمانوں کو وہ عیش و آرام اور دنیاوی سازوسامان حاصل ہوگیا جس کی وجہ سے آدمی از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اصل حیثیت اور حقیقی ذمہ داریوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ان کے ساتھی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہی لوگ جو کچھ دنوں پہلے چاول سے زیادہ لذیذ ترکسی کھانے سے ناواقف تھے۔ اب نفیس ترین ایرانی کھانے، فالودہ اور لوزینہ وغیرہ مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ ایسی حالت میں حضرت عتبہؓ کو دنیاوی عیش و آرام کے مقابلے میں اپنے دین کی حفاظت اور دنیا کے فوری اور عارضی فوائد کے بالمقابل آخرت میں حاصل ہونے والے دائمی اور لازوال منافع کو طلب کرنے کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ انھوں نے لوگوں کو بصرہ کی جامع مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر فرمائی۔

"لوگو! یہ دنیا اپنے سفر کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اور تم اسے چھوڑ کر ایک ایسے گھر کی طرف منتقل ہونے والے ہو جو لازوال اور ابدی ہے۔ تو تم اپنے بہترین اعمال کو ساتھ لے کر اس میں منتقل ہونے کی فکر کرو۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف سات آدمی ایمان لاتے تھے۔ اس وقت درختوں کی پتیوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہم کو کھانے کے لیے میسر نہ تھی۔ ان پتیوں کو کھانے کی وجہ سے ہماری.

باچھیں زخمی ہوگئی تھیں۔ایک دن مجھے کہیں سے ایک چادر مل گئی۔اُسے میں نے اپنے اور سعد ابن ابی وقاصؓ کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کردی۔آدھی چادر میں نے اوڑھی آدھی سعدؓ نے۔اور آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی شہر کا امیر اور حاکم نہ ہو۔میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں اپنے آپ کو عظیم سمجھوں لیکن خدا کے یہاں صغیر و حقیر بن جاؤں۔"

اس کے بعد حضرت عتبہؓ نے ان میں سے ایک شخص کو اپنا قائم مقام بنایا اور ان سے رخصت ہوکر مدینہ کا رُخ کیا۔اور بارگاہِ خلافت میں پہنچ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں گورنری سے اپنا استعفاء پیش کردیا۔مگر حضرت عمرؓ نے ان کا استعفاء نامنظور فرماتے ہوئے انھیں اپنی ذمہ داری سنبھالنے کی تاکید کی۔ حضرت عتبہؓ استعفاء کی منظوری کے لیے اصرار کرتے رہے، لیکن خلیفہؓ نے ان کی ایک نہ سُنی اور انھیں بصرہ واپس جانے کا حکم دیا۔آخر کار بادل ناخواستہ وہ اس کے لیے تیار ہوتے اور یہ کہتے ہوئے اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے۔

"خدایا! مجھے اب وہاں واپس نہ لے جا۔خدایا! ...."

اور ان کی یہ دعاء بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت سے ہم کنار ہوئی۔ ابھی وہ مدینے سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک ان کی اونٹنی کا پاؤں پھسلا، حضرت عتبہؓ نیچے گرے اور زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کرلیا۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت نُعَیم بن مسعود رضی اللہ عنہ

نُعَیم بن مسعود ایک ایسے بیدار مغز، تیز فہم، ذہین وفطین اور چست و چالاک شخص تھے جن کی راہ میں نہ تو کوئی پیچیدہ مسئلہ حائل ہو سکتا تھا نہ ہی وہ کسی مشکل معاملے کو حل کرنے میں ناکام ہو سکتے تھے۔ صحرا کا یہ سپوت اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی غیر معمولی صلاحیتوں ـــ صحتِ فراست، سُرعتِ ذہن اور تیزیٔ عقل ـــ کے باعث ایک بے مثال شخصیت کا حامل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بڑا رنگین مزاج، رنگ رلیوں کا دلدادہ اور گانے بجانے کا شوقین بھی تھا۔ ان دلچسپیوں اور خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ اکثر و بیشتر یثرب کے یہودیوں کے یہاں جاتا رہتا تھا۔ چنانچہ جب بھی اس کا دل کسی مُغنّیہ کے لیے بے چین ہوتا یا اس کے کان بربط و رُباب کے تاروں سے نکلنے والے دل کش اور مسحور کن نغموں کے لیے بے قرار ہوتے تو وہ نجد سے ـــ جہاں اس کا قبیلہ آباد تھا ـــ سیدھا مدینے پہنچتا اور وہاں یہودیوں پر دل کھول کر مال و دولت لُٹاتا تاکہ وہ اس کی دل چسپیوں اور عیاشیوں کا بھرپور انتظام کریں۔ اسی وجہ سے نُعَیم بن مسعود اکثر یثرب آتا جاتا رہتا اور یہودیوں، خصوصاً یہودِ بنی قریظہ کے ساتھ اس کے بڑے گہرے اور مضبوط روابط تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو اپنے کرم سے نوازتے ہوئے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور مکے کی وادیاں

آفتاب اسلام کی تابانیوں سے جگمگا اٹھیں، نُعیم بن مسعود خواہشات کی باگ اپنے نفس کے ہاتھ میں ڈھیلی چھوڑ کر پیہم ان کی پیروی میں منہمک تھا اور اس نے اس نئے دین سے صرف اس اندیشے کے تحت سختی کے ساتھ اعراض کیا کہ کہیں یہ دین اس کی لذت کوشیوں اور رنگ رلیوں پر قدغن لگا کر اس کی زندگی کا سارا مزہ کرکرا نہ کر دے۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسلام کے بدترین دشمنوں کی صف میں شامل ہو کر اس نے اپنی تلوار اس کے مقابلے کے لیے بے نیام کر لی۔

لیکن غزوۂ احزاب کے موقع پر نعیم بن مسعود نے دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور اس باب میں انھوں نے اپنے ہاتھ سے وہ داستان رقم کی جو جنگی چالوں پر مشتمل داستانوں میں سب سے زیادہ حیرت آفریں اور تعجب انگیز داستان ہے۔ ایک ایسی داستان جس کے محکم اجزاء اور اس کے عاقل و دانا ہیرو کا تذکرہ مورخ کا قلم ہمیشہ حیرت و استعجاب کے ساتھ کرتا رہے گا۔

نُعیم بن مسعود کی اس نرالی داستان سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا سا پیچھے کی طرف لوٹنا ہوگا۔ غزوۂ احزاب سے کچھ عرصہ پہلے یثرب کے یہودیوں کی ایک ٹولی جس کا تعلق بنو نضیر سے تھا، حرکت میں آئی اور اس کے لیڈروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کرنے اور ان کے دین پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے مختلف قبیلوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلے وہ قریشِ مکہ کے پاس پہنچے اور ان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اُبھارا اور ان سے اس بات کا مضبوط عہد و پیمان کیا کہ جب تم لوگ فوج لے کر مدینہ پہنچو گے تو ہم بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ پھر ان کو چھوڑ کر وہ لوگ نجد میں بنو

غطفان کے پاس گئے اور انھیں بھی اسلام اور اس کے نبی کے خلاف خوب بھڑکایا، اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی دعوت دی اور وہ ساری باتیں تفصیل سے ان کو بتائیں جو قریش اور ان کے درمیان طے ہوئی تھیں پھر ان کے ساتھ بھی انہیں شرائط پر معاہدہ کیا اور طے شدہ وقت سے آگاہ کر کے واپس چلے آئے۔

اِدھر قریش ایک لشکرِ جرار کے ساتھ جس میں ان کے پیدل اور گھڑسوار دستے شامل تھے، اپنے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کی قیادت میں اور اُدھر غطفان پورے جنگی سازو سامان اور جمعیتِ کثیر کے ساتھ اپنے قائد عُیَینہ ابن حِصن غطفانی کی سرکردگی میں مدینہ کی طرف چل پڑے۔ ہماری اس داستان کا ہیرو نعیم ابن مسعود بھی اپنے قبیلے بنو غطفان کے ہراول دستے میں شامل تھا۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی روانگی کی خبر ملی تو آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو جمع کر اس معاملے میں ان کی رائیں طلب کیں۔ آخر باہمی مشورے سے یہ بات طے ہوئی کہ مدینہ کے اِردگرد ایک خندق کھود لی جائے تاکہ وہ خندق اس لشکر کے سامنے حائل ہو جائے اور ہم اس کے حملے سے اپنا تحفظ کر سکیں جس سے کھُلے میدان میں مقابلہ کرنے کی ہمارے پاس طاقت نہیں ہے۔

جب مکہ اور نجد سے پیش قدمی کرنے والے یہ دونوں لشکر مدینہ کی سطح مرتفع کے قریب پہنچے تو بنو نُضَیر کے یہودی زُعماء مدینہ میں بنو قریظہ کے یہودی سرداروں کے پاس پہنچے اور ان کے اوپر اس سلسلے میں کافی دباؤ ڈالا کہ وہ اس جنگ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مکہ اور نجد سے آنے والی فوجوں کا ساتھ دیں۔ مگر بنو قریظہ کے سرداروں نے اُن سے کہا کہ یہ چیز جس کی طرف تم ہم کو دعوت دے رہے ہو، اگرچہ ہماری مطلوبہ اور پسندیدہ چیز ہے لیکن تم کو معلوم ہے کہ ہمارے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان اس شرط پر ایک معاہدہ

ہوچکا ہے کہ ہم آپس میں صلح و آشتی کے ساتھ رہیں گے تاکہ دونوں فریق مدینہ میں امن و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ ابھی اس معاہدے کی روشنائی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں اس بات کا سخت اندیشہ ہے اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس جنگ میں فتحیاب ہوئے تو معاہدے کی خلاف ورزی کے جُرم میں وہ ہم پر سخت گرفت کریں گے اور ہمیں مدینے سے نیست و نابود کرکے دم لیں گے۔ لیکن بنو نضیر کے سردار اُن کو برابر نقضِ عہد پر ابھارتے، اس کو مزین کرکے ان کے سامنے پیش کرتے اور ان کو سبز باغ دکھاتے رہے کہ اب کی بار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زبردست تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آخر کار بنو قریظہ کے یہودی ان کے سامنے ڈھیلے پڑ گئے اور انھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیے ہوتے اپنے معاہدے کو توڑ دیا اور صلحنامے کی دستاویز کو پھاڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش و غطفان کی متحدہ فوج کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں کے اُوپر اس کا ایسا اثر ہوا جیسے ان کے اوپر بجلی گر پڑی ہو۔

دشمن کی فوجوں نے ہر طرف سے مدینہ کا محاصرہ کر کے خوراک اور ضروریاتِ زندگی کی رسد منقطع کر دی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دشمن کے دونوں جبڑوں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔ کیوں کہ ایک طرف قریش اور غطفان کے لشکر مدینہ کے باہر مسلمانوں کے سامنے خیمہ زن تھے اور دوسری طرف اندرونِ شہر بنو قریظہ کے یہودی مسلمانوں کے پیچھے گھات لگاتے ان کے اُوپر حملہ کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پھر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض تھا، اپنے سینوں میں پوشیدہ خباثتوں کا اظہار کرنے پر تل گئے

تھے۔ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کا وعدہ کر رہے تھے اور آج ہماری بے کسی اور مجبوری کی یہ حالت ہے کہ ہم اپنی جان کے خوف سے رفع حاجت کے لیے بیت الخلا تک جانے کی سکت نہیں رکھتے۔ پھر ان کی ٹولیاں یکے بعد دیگرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر کھسکنے لگیں۔ بہانہ یہ تھا کہ ہمیں بنو قریظہ کی طرف سے اس بات کا ڈر ہے کہ جب لڑائی شروع ہو جائے گی تو وہ اچانک ہماری عورتوں، بچّوں اور گھروں پر حملہ کر دیں گے۔ یہاں تک کہ چند سو مخلص مسلمانوں کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی نہیں بچا تھا۔ محاصرے کی راتوں میں سے ایک رات کو جس کا سلسلہ تقریباً بیس دن سے جاری تھا ۔۔۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کی بارگاہ میں انتہائی گریہ وزاری کے ساتھ بار بار یہ دُعا کر رہے تھے۔

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ عَھْدَکَ وَوَعْدَکَ ۔۔۔۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَنْشُدُکَ عَھْدَکَ وَوَعْدَکَ۔" "خدایا! میں تجھے تیرا عہد اور تیرا وعدہ یاد دلا رہا ہوں ۔۔۔۔ خدایا! میں تجھے تیرا عہد اور تیرا وعدہ یاد دلا رہا ہوں۔"

اس رات نعیم بن مسعود بے خوابی کی وجہ سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ان کی پلکیں جھپکنے کا نام نہیں لیتی تھیں جیسے ان میں کیلیں جڑ دی گئی ہوں۔ وہ آنکھیں کھولے صاف ستھرے آسمان کی سطح پر تیرتے ہوئے ستاروں کو ایک ٹک دیکھے چلے جا رہے تھے۔ وہ بڑی دیر تک بحرِ تفکر میں غوطہ زن رہے۔ اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا دل ان سے سوال کر رہا ہے۔

"نعیم! تمہارا بُرا ہو آخر وہ کون سی چیز ہے جو تم کو اس "مردِ صالح" کے مقابلے میں اپنی تلوار بے نیام کرنے پر اکسا رہی ہے؟ جو اپنے متبعین کو عدل و احسان

اور رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے ؟ اور کیا چیز ہے جو تم کو اس بات پر اُکسا رہی ہے کہ اپنا نیزہ اس کے ان ساتھیوں کے خون سے رنگین کرو جنھوں نے اس کی لائی ہوئی ہدایت اور حق کی پیروی اختیار کی ہے ؟ "

نعیم بن مسعود اور ان کے دل کے مابین ہونے والی اس گفتگو کو اُس دُور اندیشانہ عزم نے منقطع کیا جس کو رُو بہ عمل لانے کے لیے وہ اسی وقت اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں اپنے قبیلے کے کیمپ سے دبے پاؤں نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوتے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے چل پڑے۔ جب آپؐ نے ان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو فرمایا۔

" نعیم بن مسعود ؟"

" اس وقت کس ضرورت سے آئے ہو؟" آپؐ نے دریافت فرمایا۔

" اس وقت اس لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں کہ اس بات کی گواہی دُوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسُول ہیں اور جو دین آپ لاتے ہیں وہ برحق ہے " سلسلۂ کلام کو مزید آگے بڑھاتے ہوتے انھوں نے کہا۔

" اے اللہ کے رسولؐ ! میں اسلام قبول کر چکا ہوں مگر میرے قبیلے کے لوگ ابھی اس بات سے بے خبر ہیں۔ تو آپؐ مجھے جو حکم دینا چاہیں، دیں۔ میں اس کی تعمیل کروں گا۔"

" تم ہمارے اندر وہ واحد شخص ہو، جو اس کام کو کر سکتا ہے۔ تم اپنے قبیلے والوں کے پاس جاؤ اور ہو سکے تو ان کو اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ ہمارے خلاف جنگ سے ہاتھ کھینچ لیں اور قریش سے کنارہ کش ہو جائیں۔ جنگ میں حکمت سے کام لینا اس کا ایک زبردست حربہ ہے۔" آپؐ نے فرمایا۔

"ہاں، اے اللہ کے رسول انشاء اللہ آپ عنقریب ایسی بات دیکھیں گے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور آپ کا جی خوش ہو جائے گا۔" انھوں نے جواب دیا۔

حضرت نعیمؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت سے روانہ ہوکر اسی وقت بنو قریظہ کے پاس پہنچے ـــــ وہ پہلے سے ان کے دوست اور ہم نشین تھے ـــــ اور ان سے کہا۔

"بنو قریظہ! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارا کتنا سچا دوست اور مخلص خیر خواہ ہوں!"

"ہاں، تمہاری دوستی اور خیر خواہی ہر شبہے سے بالاتر ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"اس جنگ میں قریش اور غطفان کا معاملہ تمہارے معاملے سے سراسر مختلف ہے۔" حضرت نعیمؓ نے کہا۔

"وہ کیسے؟" بنو قریظہ نے پوچھا۔

"وہ ایسے۔" انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کہ یہ شہر تمہارا شہر ہے۔ تمہارے بال بچے اور تمہارے اموال اسی شہر میں ہیں۔ تمہارے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اسے چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جاؤ۔ رہا قریش اور غطفان کا معاملہ تو ان کے اموال، ان کے بچے اور ان کی عورتیں دوسرے شہر میں ہیں۔ وہ یہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کرنے آئے اور انھوں نے تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے توڑ ڈالنے اور ان کے خلاف اپنی مدد کی دعوت دی، جس کو تم قبول کر چکے ہو۔ اب اگر وہ اس جنگ میں کامیاب ہوتے ہیں تو اسے غنیمت سمجھیں گے، لیکن اگر وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مغلوب کرنے میں

ناکام ہوئے تو تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے بدترین انتقام لیں گے۔ اور تم خوب جانتے ہو کہ تنہا ان کا مقابلہ کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

بنو قریظہ نے یہ سن کر کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن اس معاملے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے اس کے بارے میں یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اشراف اور سربرآوردہ لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد بطور یرغمال تمہارے پاس نہیں رکھ دیتے، تم ان کے ساتھ جنگ میں شرکت کرنے سے انکار کر دو۔ اس طرح تم ان کو اس بات پر مجبور کر سکو گے کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر آخر دم تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کریں۔ پھر یا تو تمہیں غلبہ وکامرانی نصیب ہو جائے یا تمہارا اور ان کا آخری آدمی تک میدانِ جنگ میں کام آجائے۔" حضرت نعیمؓ نے ان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا یہ مشورہ واقعی نہایت خیرخواہانہ ہے۔" بنو قریظہ نے کہا۔

وہاں سے اپنا کام ختم کر کے حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ قریش کے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کے پاس پہنچے اور اس سے اور اس کے ساتھیوں سے کہا۔

"اے گروہِ قریش! یہ بات تمہارے اوپر مخفی نہیں ہے کہ مجھے تم سے کتنی گہری محبت ، اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کیسی سخت عداوت ہے۔ مجھے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوئی ہے اور تمہاری خیرخواہی کا تقاضا سمجھ کر میں یہ بات تمہارے گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس بات کو راز رکھو، کسی کے سامنے ظاہر نہ کرو۔" جب قریش نے رازداری کا

وعدہ کرلیا تو انھوں نے کہا۔

"بنو قریظہ کے یہودی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ دشمنی مول لے کر اب بہت پچھتا رہے ہیں۔ اس کی تلافی کے لیے انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہاں یہ کہلا بھیجا ہے کہ" ہم اپنے کیے پر سخت نادم ہیں۔ اور آپ کے ساتھ صلحنامے کی تجدید کرنا چاہتے ہیں۔ تو کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ ہم قریش اور غطفان سے ان کے سرداروں کی ایک کثیر تعداد بطور یرغمال لے کر آپ کے حوالے کردیں کہ آپ ان کی گردنیں ماردیں۔ پھر جنگ میں ہم اُن کے بجائے آپ کا ساتھ دیں اور آپ ان کے اُوپر آخری اور فیصلہ کُن وار کرسکیں۔" اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی اس پیشکش کو قبول کرلیا ہے۔ تو اگر یہودی تم سے یرغمال کے طور پر کچھ آدمیوں کا مطالبہ کریں تو تم ایک آدمی بھی ان کے حوالے نہ کرنا

"تم ہمارے بہترین حلیف ہو، اللہ تعالےٰ تم کو بہترین جزا دے۔" ابوسفیان نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ ابوسفیان کے یہاں سے نکل کر اپنے قبیلے بنو غطفان کے پاس پہنچے اور ان سے بھی وہی ساری باتیں کہیں جو ابوسفیان سے کہہ چکے تھے اور اس خطرے سے انھیں بھی چوکنا رہنے کی تاکید کی جس سے ابوسفیان کو آگاہ کرچکے تھے۔

ابوسفیان نے بنو قریظہ کو آزمانے کے لیے اُن کے پاس اپنے بیٹے کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ میرے والد نے تم کو سلام کہا ہے اور تمہارے پاس یہ پیغام بھیجا ہے کہ" ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے اصحاب کے خلاف اس محاصرے کی طوالت سے تنگ آچکے ہیں اور جلد از جلد ان کے ساتھ جنگ شروع کرکے اس قضیے کو نمٹا دینے کا حتمی فیصلہ کرچکے ہیں اس لیے تم بھی کل ان کے خلاف اپنی

کارروائیوں کا آغاز کر دو۔" تو انھوں نے جواب دیا کہ "کل تو سنیچر کا دن ہے۔ اس روز ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنے اور بنو غطفان کے ستر سربرآوردہ اشخاص کو یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے نہیں کر دیتے۔ اس لیے کہ ہم کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ جب جنگ شدت اختیار کر جائے گی تو تم ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مقابلے میں تنہا چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف بھاگ جاؤ گے اور تم جانتے ہو کہ ہم تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

جب ابوسفیان کے لڑکے نے واپس جا کر اپنے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو اس نے بنو قریظہ سے سنی تھیں تو سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"بڑے ملعون ہیں یہ بندروں اور خنزیروں کی اولاد۔ خدا کی قسم اگر یہ ہم سے یرغمال کے طور پر ایک بکری بھی مانگیں تو ہم انہیں نہیں دے سکتے۔"

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے منصوبے کے مطابق متحدہ جماعتوں کی صفوں کو پراگندہ کرنے اور ان کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے قریش اور ان کے حلیفوں کے اوپر تیز اور سرکش آندھی کے جھکڑ بھیج دیے جن کی زد میں آ کر ان کے خیمے اکھڑ گئے، دیگیں الٹ گئیں اور چولھے بجھ گئے۔ تیز ہوائیں ان کے چہروں پر طمانچے لگاتی اور آنکھوں میں مٹی ڈال رہی تھیں۔ اب سوائے اس کے کہ وہ یہاں سے کوچ کر جائیں اس مصیبت سے نجات کی کوئی دوسری راہ انھیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ راتوں رات وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ جب صبح کو مسلمانوں نے دیکھا کہ ان دشمنانِ خدا کے وجود سے پورا میدان صاف ہو چکا ہے اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے ہیں تو خوشی سے چلا اٹھے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی نَصَرَ عَبْدَہٗ وَ اَعَزَّ جُنْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ۔"	"شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے بندے کی مدد فرمائی، اپنے لشکر کی مدد کی اور تنہا متحدہ فوجوں کا منہ پھیر دیا۔"

اُس روز کے بعد سے حضرت نُعیم بن مسعودؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قابلِ اعتماد لوگوں کی صف میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ آپؐ نے ان کو والی بھی بنایا اور فوجی دستوں کی قیادت بھی ان کے سپرد کی۔

فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان لشکرِ مجاہدین کے مختلف دستوں کو یکے بعد دیگرے اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے قبیلہ غطفان کے عَلَم بردار کو دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔

"یہ کون ہے؟"

"یہ نعیم بن مسعود ہیں"، اس کے ساتھیوں نے بتایا۔

"اس نے جنگِ احزاب کے موقع پر ہمارے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ خدا کی قسم یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے کٹّر دشمن تھا اور یہ دیکھو آج یہ اپنے قبیلے کا جھنڈا اٹھائے ان کے آگے آگے چل رہا ہے اور ان کی ماتحتی میں ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے جا رہا ہے" ابوسفیان نے کہا۔

حضرت خبّاب بن اَرَت رضی اللہ عنہٗ

ام انمار خزاعیہ ایک روز مکے میں واقع بردہ فروشوں کے بازار میں پہنچی۔ وہ
ک غلام خریدنا چاہتی تھی تاکہ اس سے خدمت لے اور اس کی کمائی سے فائدہ
صل کرے۔ وہ فروخت کے لیے آئے ہوئے ایک ایک غلام کے چہرے کو بغور
یکھتی پھر رہی تھی۔ آخر اس کی نگاہِ انتخاب ایک لڑکے پر جا کر ٹک گئی جو ابھی سنِ
وغ کو نہیں پہنچا تھا۔ اس لڑکے کی جسمانی صحت اور اس کے چہرے سے ظاہر
ونے والے ذہانت و فطانت کے آثار نے ام انمار کو اس کی خریداری پر آمادہ کیا
اس نے قیمت ادا کر کے اسے خرید لیا۔ گھر جاتے ہوئے ام انمار نے راستے
ں اس سے پوچھا۔

"بچے! تمہارا کیا نام ہے؟"

"خباب!"

"اور تمہارے والد کا؟"

"ارت"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"نجد کا"

"تب تو تم عربی النسل ہو۔"
"ہاں، اور میرا تعلق بنو تمیم سے ہے۔"
"تم ان بردہ فروشوں کے ہاتھ کیسے لگ گئے۔"
"ایک قبیلے کے لوگوں نے ہماری بستی پر اچانک چھاپہ مار کر ہمارے جانوروں کو چھین لیا، عورتوں کو گرفتار کر لیا اور بچوں کو پکڑ لیا، پکڑے جانے والے بچوں میں میں بھی تھا۔ پھر میں یکے بعد دیگرے مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہاں مکہ پہنچ گیا اور اب آپ کے ہاتھ میں ہوں۔"

ام انمار نے اپنے اس غلام کو مکے کے ایک آہن گر کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اس سے اسلحہ سازی کا ہنر سیکھے اس نے بہت جلد اس فن میں مہارت حاصل کر لی اور اس میں طاق ہو گیا اور جب اس کے بازو خوب قوی ہو گئے اور وہ جسمانی طور پر کافی مضبوط ہو گیا تو ام انمار نے ایک دکان کرائے پر لی اور اسلحہ سازی کے لیے ضروری اوزار اور سامان خرید کر غلام کے حوالے کیا اور اس کی مہارت فن کے ذریعے خوب مالی فوائد حاصل کرنے لگی۔ چند ہی دنوں میں خباب کی فنی مہارت کی شہرت مکے کی پوری آبادی میں پھیل گئی، اور لوگ کثرت سے ان کے پاس تلواریں خریدنے کے لیے آنے لگے، کیونکہ وہ ایک بہترین کاریگر ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دیانت دار اور صادق القول شخص تھا۔

خباب اپنی کم سنی اور نوجوانی کے باوجود نہایت صاحب فہم و فراست اور زیور عقل و دانش سے پورے طور پر آراستہ تھے، جب وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر تنہائی میں ہوتے تو اکثر اس جاہلی معاشرہ کے متعلق سوچا کرتے جو ایڑی سے چوٹی تک فساد اور بگاڑ کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا۔ اور یہ دیکھ دیکھ کر کہ اہل عرب کی زندگی پر شدید قسم کی جہالت اور اندھی گمراہی مسلط ہے

جس کا ایک شکار وہ خود بھی ہیں۔ سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہو جایا کرتے تھے اور بے ساختہ پکار اٹھتے کہ "ایک نہ ایک دن اس تاریک رات کا خاتمہ ہو کر رہے گا" اور دل ہی دل میں اپنے لیے درازیِ عمر کی تمنا کرتے تاکہ اپنی آنکھوں سے جہالت و گمراہی کی اس تاریکی کو چھٹتے اور علم و ہدایت کی روشنی کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھ لیں۔

اور خباب کو اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ان کی آرزو بہت جلد پوری ہوگئی۔ ان کے علم میں یہ بات آگئی کہ نورِ ہدایت کی شعاعیں بنی ہاشم کے ایک فرد محمدؐ بن عبداللہ (فداہ ابی و امی) کے منہ سے نکل کر گرد و پیش کے تیرہ و تار ماحول کو منور کرنا شروع کر چکی ہیں۔ وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے۔ ان کا پیغام سنا اور اس پیغام کے نور سے ان کا مکمل وجود از سر تا پا جگمگا اٹھا۔ انھوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس بات کی شہادت دی کہ "خدائے واحد کے سوا کوئی دوسرا لائقِ پرستش و عبادت نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں" اور اس طرح وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے چھٹے شخص بن گئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ پر ایک ایسا وقت بھی گزرا کہ وہ اسلام کا چھٹا حصہ تھے۔

حضرت خبابؓ نے اپنے اسلام کو کسی سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے ام انمار کو ان کے مسلمان ہونے کی خبر بہت جلد معلوم ہوگئی، اس خبر کو سنتے ہی اس کے غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے بھائی سباع عبدالعزیٰ کو ساتھ لیا۔ قبیلہ بنو خزاعہ کے کچھ اور نوجوان بھی اس کے ہمراہ ہوگئے۔ یہ سب لوگ حضرت خبابؓ کے یہاں پہنچے۔ اس وقت وہ اپنے کام میں مشغول تھے۔ سباع نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "خباب تمہارے متعلق ہم کو ایک ایسی خبر ملی ہے جس پر یقین کرنا ہمارے لیے آسان نہیں ہے"۔

"کون سی خبر؟" انھوں نے پوچھا۔

" یہ بات ہر طرف مشہور ہو رہی ہے کہ تم بے دین ہو گئے ہو، اور اپنے آباد اجداد کے دین کو ترک کر کے بنی ہاشم کے اس " لونڈے " کی پیروی کرنے لگے ہو" سباع نے غصّے سے تیز ہوتے ہوئے کہا۔

" میں بے دین نہیں ہوا ہوں۔ میں تو اس اللہ واحد پر ایمان لایا ہوں جس کا کوئی شریک و سہیم نہیں اور میں نے تمہارے بتوں کی پرستش چھوڑ دی ہے اور اس بات کی گواہی دی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ حضرت خبابؓ نے نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

حضرت خبابؓ کے یہ الفاظ جیسے ہی سباع اور اس کے ساتھیوں کے کانوں میں پڑے ۔ وہ یکایک ان پر پل پڑے اور ان کے اوپر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ اور جس کے ہاتھ میں جو چیز آ گئی اسی سے مارنے لگا، چاہے وہ ہتھوڑا ہو یا لوہے کا ٹکڑا ۔ وہ ان کو مارتے رہے یہاں تک کہ وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئے، اور ان کے جسم سے خون بہنے لگا۔

حضرت خبابؓ اور ام انمار کے مابین پیش آنے والے اس واقعے کی خبر پورے مکے میں جنگل کی آگ کی طرح بڑی سرعت کے ساتھ پھیل گئی اور لوگ ان کی اس غیر معمولی جرأت پر دنگ ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ اس سے پہلے انھوں نے پیروان محمدؐ میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں سنا تھا، کہ اس نے قبول اسلام کے بعد لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اس طرح صراحت اور چیلنج کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کیا ہو۔ سردارانِ قریش ان کی اس غیر معمولی جرأتِ اقدام پر سخت برہم ہوئے، کبھی ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ام انمار کے اس غلام کی طرح کا کوئی غلام جس کا نہ کوئی خاندان ہو، جو اس کی حمایت پر کمربستہ

ہو اور نہ اس کا کوئی طرف دار ہو جو اس کو حفاظت اور پناہ فراہم کرے؛ اس حد تک جرأت کا مظاہرہ کرے گا کہ اس کے قابو سے باہر ہو کر بر ملا اس کے معبودوں کی توہین کرے اور اس کے آبا و اجداد کے دین کو سفاہت و گمرہی قرار دے۔ اس واقعے نے قریش کو اس بات کا یقین دلایا کہ یہ ان کی زندگی کا بدترین دن ہے، اور ان کا یہ یقین کچھ غلط بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت خبابؓ کی اس جرأت سے ان کے ساتھیوں کے اندر بھی اس بات کا حوصلہ پیدا ہو گیا کہ وہ کھل کر اپنے اسلام کا اعلان کریں۔ چنانچہ انھوں نے یکے بعد دیگرے کلمۂ حق کا علی الاعلان اظہار کرنا شروع کر دیا۔

ایک روز ابوسفیان بن حرب، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام اور دوسرے بہت سے شیوخ قریش بیت اللہ کے پاس ایک مجلس میں یکجا تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور ان کا پیغام ان کا موضوع گفتگو تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت روز بروز بڑھتی اور پھیلتی جا رہی ہے اور ان کی مقبولیت میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے طے کیا کہ مرض کے بڑھنے سے پہلے ہی اس کا استیصال ناگزیر ہے اور وہ متفقہ طور پر اس بات کا فیصلہ کر کے اس مجلس سے اٹھے کہ ہر شخص اپنے قبیلے کے ان افراد کو جنہوں نے محمدؐ کی پیروی اختیار کی ہے، ایسی دردناک اور عبرت انگیز سزا دے کہ یا تو وہ اپنے اس نئے دین کو ترک کر کے پرانے دین کی طرف پلٹ آئیں یا موت ان کی زندگی کا چراغ گل کر دے۔

اس فیصلے کی رو سے حضرت خبابؓ کو ستانے کی ذمہ داری سباع بن عبدالعزیٰ اور اس کے قبیلے بنو خزاعہ پر عائد ہوئی۔ چنانچہ عین دوپہر میں جب دھوپ کی تمازت اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ اور زمین پر سورج کی تیز اور گرم کرنوں سے تپ کر توا

جاتی ہے، یہ لوگ حضرت خبابؓ کو مکے سے باہر سنگلاخ میدان میں نکال کر لے جاتے، ان کے جسم سے کپڑے اُتار کر انھیں لوہے کی زرہ پہنا دیتے اور تیز چلچلاتی دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر کھڑا کر دیتے۔ مزید برآں ان پر پانی بھی بند کر دیتے۔ یہاں تک کہ جب ان کی تکلیف اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تو اُن سے پوچھتے۔

"محمدؐ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟"

"وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تشریف لائے ہیں تاکہ ہم لوگوں کو کفر و شرک کی ظلمت سے نکال کر ایمان و ہدایت کی روشنی میں داخل کریں"، حضرت خبابؓ ان کو جواب دیتے۔ یہ سنتے ہی وہ لوگ بے تحاشا ان کو لاتوں اور مکّوں سے مارنے لگتے اور پھر پوچھتے۔

"اور لات و عزیٰ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"دو بت ہیں جو کسی کی بات سُننے اور اس کا جواب دینے سے قاصر ہیں، نہ کسی کو کوئی نقصان پہنچاتے ہیں نہ اس کو کوئی فائدہ دے سکتے ..... "

اتنا سُنتے ہی وہ آس پاس پڑے ہوئے گرم گرم پتھر اُٹھا لاتے اور ان پتھروں کو ان کی پیٹھ سے چپکا دیتے۔ اور انھیں چپکائے رہتے یہاں تک کہ ان کے کندھے سے چربی پگھل کر بہنے لگتی۔

اور اُمِ انمار حضرت خبابؓ کے لیے اپنے بھائی سباع سے کچھ کم سنگ دل نہ تھی۔ ایک روز اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خبابؓ کی دکان کی طرف سے گزرتے اور ان سے بات کرتے دیکھ لیا وہ غصّے سے دیوانی ہوگئی۔ اب وہ روزانہ اُن کے یہاں آتی اور بھٹی میں سے دہکتا ہوا لوہا ان کے سر پر رکھ دیتی۔ ان کا سر جلنے لگتا اور وہ بیہوش ہو کر گر جاتے اور افاقہ ہونے پر اس کے اور اس کے بھائی کے حق میں بد دُعا کرتے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو ہجرت مدینہ کی اجازت مرحمت فرمائی تو حضرت خبابؓ نے بھی اس کی تیاری کر لی۔ لیکن انھوں نے مکہ کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اللہ تعالیٰ نے اُمِ انمار کے حق میں ان کی بددعا کو قبول نہیں کرلیا۔ وہ شدید قسم کے درد سر میں مبتلا ہوگئی۔ ایسے درد میں جس کی تکلیف ناقابل برداشت تھی اور جس کی مثال کبھی سُننے میں نہیں آئی تھی۔ وہ شدتِ درد کے مارے کتے کی طرح چیختی تھی۔ اس کے لڑکے مختلف جگہوں پر اس کا علاج کراتے پھرے، مگر کہیں افاقے کی کوئی صورت نہیں نظر آئی۔ اُن سے بتایا کہ اس درد سے نجات کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ اس کے سر کو برابر آگ سے داغا جاتا رہے۔ اطباء کی ہدایت کے مطابق اُس کے سر کو گرم لوہے سے داغا جانے لگا۔ اس سے اس کو اتنی شدید قسم کی تکلیف ہوتی کہ وہ اپنے درد سر کی تکلیف کو بھول جاتی۔

مدینہ میں انصار کی مہمان نوازی اور ان کے لطف و کرم سے حضرت خبابؓ نے اس سکون و راحت کا مزہ چکھا جس سے وہ مدتِ دراز تک محروم رہے۔ یہاں آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب و دیدار سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اور اب ان کے سکون کو پراگندہ اور ان کے اطمینان کو منتشر کرنے والی کوئی چیز نہ تھی، وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معرکۂ بدر میں شریک ہوئے اور ان کے زیر عَلَم انھوں نے مشرکین کے ساتھ قتال میں حصہ لیا۔ نیز انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جنگ اُحد میں بھی شرکت کی اور وہاں ام انمار کے بھائی سباع بن عبد العزیٰ کو شیر خدا حضرت حمزہ ابن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں زمین پر پچھڑا ہوا اور خون میں لت پت دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔

حضرت خبابؓ نے طویل عمر پائی۔ انھوں نے چاروں خلفاء راشدین کا مبارک اور مثالی زمانہ دیکھا اور ان کے زیر سایہ عزت و شہرت کی زندگی گزاری۔ ایک

دن وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ان کے پاس پہنچے تو خلیفہؓ نے ان کے ساتھ نہایت عزت واحترام کا برتاؤ کیا۔ ان کو اونچی جگہ پر بٹھایا اور ان سے فرمایا :

"بلال کے سوا اس جگہ پر بیٹھنے کا مستحق تم سے زیادہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔"

پھر اُن سے مشرکین کے ہاتھوں جھیلی ہوئی سب سے زیادہ دردناک اور تکلیف دہ اذیت کے بارے میں دریافت کیا۔ پہلے تو وہ جواب دینے سے ہچکچائے مگر حضرت عمرؓ کے شدید اصرار پر انھوں نے اپنی پیٹھ سے چادر سرکا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر چونک اُٹھے اور بولے، یہ کیسے ہوا؟ تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ "ایک دن مشرکین نے آگ جلا کر انگارے تیار کیے، پھر انھوں نے میرے جسم سے کپڑے اُتار دیے اور مجھے اُن انگاروں پر لٹا کر گھسیٹتے رہے یہاں تک کہ میری پیٹھ کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو گیا اور جسم سے نکلی ہوئی چربی نے ان انگاروں کو سرد کر دیا۔"

حضرت خبابؓ نے پہلے افلاس اور تنگدستی کی زندگی گزاری تھی لیکن اپنی عمر کے آخری نصف حصے میں وہ کافی مالدار ہو گئے تھے۔ وہ اس قدر سیم وزر اور مال و دولت کے مالک تھے کہ شاید اس کا تصور انھوں نے خواب وخیال میں بھی نہ کیا ہوگا۔ لیکن انھوں نے اس مال میں اس طرح تصرف کیا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ انھوں نے اپنی دولت گھر کے ایک حصے میں رکھ دی تھی جس کو تمام حاجتمند اور سارے فقراء ومساکین جانتے تھے۔ انھوں نے نہ تو اس مال کی حفاظت ونگرانی کا کوئی نظم رکھا نہ اس پر تالا لگایا۔ ضرورتمند اس میں سے جتنا چاہتے لے جاتے، اس کے باوجود وہ ہمیشہ اس اندیشے میں مبتلا اور اس بات سے خوفزدہ رہتے کہ ان سے اس مال کا حساب لیا جائے گا اور اس کے سبب سے ان کو عذاب دیا جائے گا۔

ان کے ساتھیوں کا بیان ہے کہ ہم لوگ خبابؓ کے مرض الموت میں ان کی عیادت کے لیے گئے، تو انھوں نے کہا کہ اس جگہ اسی ہزار درہم ہیں ۔ اور خدا کی قسم نہ تو میں نے اس پر کبھی کوئی روک ٹوک کی نہ کبھی کسی کو اس میں سے لینے سے منع کیا، اتنا کہہ کر وہ رونے لگے۔ جب ہم نے ان سے رونے کا سبب دریافت کیا تو بولے کہ "میرے بہت سے ساتھی اس طرح دنیا سے گزر گئے کہ انھوں نے اپنے اعمال کا کوئی دنیاوی فائدہ نہیں حاصل کیا۔ لیکن میں زندہ رہا اور اس قدر دولت وجائداد میرے ہاتھ آئی کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ میرے اعمال کا اجر نہ ہو۔"

جب حضرت خبابؓ کا انتقال ہوگیا۔ اور وہ اپنے رب رحیم وکریم کے جوار رحمت میں پہنچ گئے تو امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ان کی قبر پر کھڑے ہوکر فرمایا:

"رَحِمَ اللهُ خَبَّابًا ۔ فَقَدْ اَسْلَمَ رَاغِبًا وَهَاجَرَ طَائِعًا وَعَاشَ مُجَاهِدًا وَلَنْ يُضِيعَ اللهُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۔"

"اللہ تعالیٰ خبابؓ پر رحم فرمائے ۔ انھوں نے بہ رضا ورغبت اسلام قبول کیا، اپنی خوشی سے ہجرت کی اور ایک مجاہد کی زندگی گزاری ۔ اور اللہ تعالیٰ اچھا عمل کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

حضرت ربیع بن زیاد حارثی رضی اللہ عنہٗ

ایک طرف تو شہر رسُول مدینۃ منورہ، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے
انتقالِ پُرملال پر اپنے مسلسل بہتے ہوئے اشکہائے غم کو پونچھنے میں مصروف تھا۔
دوسری طرف مختلف علاقوں کے وفود اُن کے جانشین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ
کے ہاتھ پر بخوشی و رضا ہر حال میں بیعتِ خلافت کرنے کے لیے پے در پے مدینہ پہنچ
رہے تھے۔

ایک صبح کو اہل بحرین کا وفد بعض دوسرے قبائل کے وفود کے ساتھ بارگاہِ خلافت
میں بیعت کے لیے حاضر ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ارکان وفد کے ساتھ
گفتگو کے بیحد مشتاق رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے ان کی گفتگو میں انہیں
کوئی عمدہ نصیحت کوئی مفید مشورہ، کوئی فکر انگیز گوشہ یا اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب اور
تمام مسلمانوں کے خیر و فلاح اور ہمدردی کی کوئی بات مل جاتے۔ چنانچہ انھوں
نے حاضرین میں سے متعدد لوگوں کو گفتگو کے لیے اپنے پاس بلایا۔ لیکن ان میں
سے کسی نے بھی کوئی خاص اور اہم بات نہیں کہی۔ تب وہ ایک ایسے شخص کی
طرف متوجہ ہوئے جس کے چہرے بشرے سے وہ پہلے ہی اندازہ کر چکے تھے کہ
اس سے ضرور کوئی مفید اور قیمتی بات مل سکے گی۔ آپ نے اشارے سے اپنے پاس بُلایا
اور اُس سے گفتگو کا آغاز کرنے کی فرمائش کی۔ خلیفہؓ کی اجازت پاکر اُس شخص نے

پہلے خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر اپنی گفتگو ان الفاظ سے شروع کی۔

" امیرالمومنین! امّت کے معاملات کی ذمہ داری سپرد کرکے خدائے عزّو جل نے آپ کو ایک زبردست آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ تو آپ خلافت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہمیشہ اُس سے ڈرتے رہیے۔ اور یہ جان لیجیے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے بھی کوئی ایک بکری ضائع ہوگئی تو قیامت کے دن اس کے متعلق آپ سے بازپرس کی جائے گی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس شخص کی یہ بات سُن کر رو پڑے۔ ان کی آواز بلند ہوگئی اور پھر اُس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد سے اب تک کسی نے مجھ سے ایسی سچی بات نہیں کہی جیسی کہ تم نے کہی ہے۔"

" تم کون ہو؟"

"میں ربیع بن زیاد حارثی ہوں۔" اُس شخص نے جواب دیا۔

" مہاجرؓ بن زیاد کے بھائی؟" خلیفہؓ نے دریافت کیا۔

" جی ہاں" حضرت ربیعؓ نے کہا۔

اس کے بعد جب مجلس برخاست ہوئی تو خلیفہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ اور ان سے تاکید کرتے ہوئے فرمایا کہ

" ربیع بن زیاد کے حالات کی پوری تفتیش کرو۔ اگر یہ اپنی اس بات میں مخلص اور بے لوث ہیں جو انھوں نے مجھ سے کہی ہے تو یہ بڑی خوبیوں کے مالک اور بڑے کام کے آدمی ہیں اور امورِ خلافت کی ادائیگی کے سلسلے میں ہمیں ان سے بہت زیادہ تعاون و امداد کی توقع ہے۔ تم کوئی ذمہ داری ان کے سپرد کرکے

ان کے حالات سے مجھے برابر آگاہ کرتے رہنا۔"

اس کے چند ہی دنوں کے بعد حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کی ایما پر صوبۂ اہواز میں واقع شہر "مناذر" کی فتح کے لیے ایک فوج ترتیب دی اور اس میں حضرت ربیعؓ اور ان کے بھائی مہاجرؓ کو بھی شامل کرلیا۔ حضرت ابو موسیٰؓ فوج لے کر روانہ ہوئے اور آگے بڑھ کر انھوں نے مناذر کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرے کے دوران اُس کے باشندوں کے ساتھ متعدد ایسی زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں جن کی نظیر جنگوں کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی پیش آئی ہوگی۔ ان لڑائیوں میں ایک طرف تو مشرکین نے بے مثال اور غیر معمولی جرأت و مردانگی اور ناقابلِ تصور استقلال و ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن دوسری طرف بے اندازہ اور کثیر تعداد میں مسلمان سپاہی شہید ہوتے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور مسلمان روزہ رکھ کر جنگ میں شریک تھے۔ حضرت ربیعؓ کے بھائی حضرت مہاجرؓ بن زیاد نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی طرف سے کثیر تعداد میں سپاہی قتل ہوچکے ہیں تو انھوں نے خدا کی رضا کی طلب میں اپنی جان نثار کردینے کی قسم کھائی۔ پھر انھوں نے اپنے جسم پر حنوط ملا، کفن پہنا اور اپنے بھائی کو وصیت کی ...... یہ دیکھ کر حضرت ربیع بن زیادؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا۔

"مہاجرؓ حالتِ صوم ہی میں اپنی جان راہِ خدا میں نثار کرنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ اور مسلمانوں کے اُوپر جنگ اور روزے کی دوہری سختیاں جمع ہوگئی ہیں، جن کی وجہ سے ان کے عزائم کمزور پڑگئے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہوگئے ہیں لیکن اس حالت میں بھی وہ روزہ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تو آپ اس سلسلہ میں سوچ سمجھ کر کوئی مناسب قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیجیے۔"

یہ سن کر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے فوج سے پکار کر کہا۔ "مسلمانو! میں ہر روزہ دار کو قسم دلاتا ہوں کہ یا تو وہ روزہ چھوڑ دے یا جنگ سے الگ ہو جائے۔"

پھر انھوں نے خود لوٹے سے (جو ان کے پاس تھا) پانی پی کر اپنا روزہ افطار کر لیا تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کو پانی پیتے دیکھ کر اپنے روزے چھوڑ دیں۔ جب حضرت مہاجرؓ نے ان کا یہ اعلان سنا تو انھوں نے ایک گھونٹ پانی پی کر کہا۔

"خدا کی قسم میں نے پیاس کے مارے پانی نہیں پیا ہے بلکہ اپنے امیر کی قسم پوری کی ہے۔"

پھر انھوں نے اپنی تلوار بے نیام کی اور بے خوف و خطر دشمن پر پل پڑے اور اس کی صفوں کو چیرتے اور آدمیوں کو پچھاڑتے چلے گئے۔ جب وہ دشمن کی فوج میں کافی اندر تک گھس گئے تو انھوں نے ہر طرف سے ان کو گھیر لیا اور آگے پیچھے ہر طرف سے ان کے اوپر تلواروں کی بارش کر دی، جس سے وہ زخمی ہو کر گر پڑے۔ پھر دشمن نے ان کا سر تن سے جدا کیا اور اُسے لے جا کر میدانِ جنگ میں ایک اونچے ٹیلے پر گاڑ دیا۔ حضرت ربیع بن زیادؓ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کتنے سعادت مند اور قابلِ فخر ہیں آپ اور کتنا عمدہ ٹھکانا ہے آپ کا خدا کی قسم اگر اللہ نے چاہا تو میں آپ کا اور تمام مسلمان شہداء کا انتقام لے کے رہوں گا۔"

جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اپنے بھائی کے غم میں حضرت ربیع بن زیادؓ کی اس بے قراری اور ان کے اضطراب کی کیفیت کو دیکھا اور دشمن کے خلاف ان کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتشِ غیظ و غضب کا انھیں احساس ہوا تو وہ فوج کی قیادت سے دست بردار ہو گئے اور اس کی کمان حضرت ربیعؓ

بن زیادؓ کو سونپ کر خود "سوس" فتح کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

حضرت ربیعؓ اپنی فوج کو لے کر مشرکین پر آندھی اور سیلاب بن کر ٹوٹ پڑے۔ دشمن ان کے حملے کی تاب نہ لا سکا، اس کی صفیں درہم برہم ہو گئیں اور اس کی قوت مقاومت جواب دے گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو "مناذر" پر زبردست فتح عنایت فرمائی۔ انھوں نے لڑنے والوں کو قتل کر دیا اور عورتوں، بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنا لیا۔ اس جنگ میں بے شمار مالِ غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔

معرکہ "مناذر" کے بعد حضرت ربیعؓ کا ستارۂ اقبال پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا اٹھا۔ اور ہر طرف ان کا شہرہ پھیل گیا۔ وہ اُن نامور قائدین میں شمار ہونے لگے جن کے ناموں کے ساتھ عظیم الشان کارنامے وابستہ ہیں۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے سیستان فتح کرنے کا ارادہ کیا تو اس فوج کی قیادت انھیں کے سپرد کی گئی۔ سب کو اس بات کی توقع تھی کہ فتح و کامرانی ان کے ہم رکاب ہو گی۔

حضرت ربیع بن زیادؓ غازیانِ فی سبیل اللہ کا لشکر لیے ہوئے سیستان کی طرف روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر انھیں دو سو پچیس میل لمبے اس دشوار گزار اور پُرخطر صحرا کو عبور کرنا پڑا جس کو پار کرنے سے صحرا کے باسی، وحشی درندے بھی عاجز تھے۔ اس خوفناک اور بھیانک صحرا کو عبور کرنے کے بعد حدود سجستان پر سب سے پہلا شہر جو اُن کے سامنے آیا وہ "رستاقِ زالق" تھا۔ اس کی آبادی عالی شان محلات و قصور پر مشتمل تھی۔ پورا شہر چاروں طرف سے بلند اور مضبوط و مستحکم فصیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں غلوں، پھلوں اور مال و دولت کی بے حد فراوانی تھی۔

ذہین اور دانا قائد حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ نے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی رستاق زالق میں اپنے جاسوس پھیلا دیے تھے ان جاسوسوں کے

ذریعے ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لوگ اپنی عید" مہرجان" کے موقع پر عنقریب ایک محفل میں جمع ہونے والے ہیں۔ حضرت ربیعؓ اس مناسب موقع کے منتظر رہے اور آخر کار عید" مہرجان" کی رات میں اچانک بے خبری کی حالت میں حملہ کرکے انھیں تلواروں کی دھار پر رکھ لیا اور بزورِ شمشیر" رستاقِ زالق" پر قابض ہو گئے۔ اس موقع پر ان میں سے بیس ہزار آدمیوں کو گرفتار کرکے انھیں لونڈی، غلام بنالیا۔ اور ان کے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ قیدیوں میں کسی زمیندار کا ایک غلام بھی تھا۔ مسلمانوں نے اس کو اس حال میں گرفتار کیا تھا کہ اس نے اپنے آقا کے پاس لے جانے کے لیے تین لاکھ کی خطیر رقم جمع کر رکھی تھی۔ حضرت ربیعؓ نے اس سے پوچھا کہ،

"اتنا سارا مال تم نے کہاں سے جمع کیا؟"

"اپنے آقا کے صرف ایک گاؤں سے۔" غلام نے جواب دیا۔

"صرف ایک گاؤں سے اتنی ساری آمدنی ہوتی ہے؟" حضرت ربیعؓ نے دوبارہ سوال کیا۔

"ہاں" غلام نے جواب میں کہا۔

"وہ کس طرح؟" حضرت ربیعؓ نے پھر دریافت کیا۔

"ہماری کلہاڑیوں، ہماری درانتیوں اور ہماری محنتوں کی بدولت۔" غلام نے جواباً عرض کیا۔ جب جنگ ختم ہوگئی اور زمیندار اپنا اور اپنے اہل و عیال کا فدیہ ادا کرنے کے لیے حضرت ربیعؓ کی خدمت میں باریاب ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ "اگر تم مسلمانوں کے لیے کسی بڑی رقم کی پیش کش کرو تو میں تمہارا فدیہ قبول کرسکتا ہوں۔"

اس نے پوچھا "آپ کتنی رقم چاہتے ہیں؟"

"میں یہ نیزہ زمین میں گاڑ دیتا ہوں۔ تم اس کو سونے چاندی سے ڈھک دو۔"
حضرت ربیعؓ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔
"آپ کی یہ شرط مجھے منظور ہے۔" زمیندار نے اپنی رضا مندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے خزانے سے سونے، چاندی کے ڈھیر نکالے اور اس نیزے پر ڈالتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ چھپ گیا۔

حضرت ربیعؓ بن زیاد اپنی فوج کے ساتھ سرزمین سجستان میں کافی دور تک اندر گھستے چلے گئے اور ہر جگہ فتح و کامرانی نے آن کا استقبال کیا۔ دشمن کے قلعے ان کے گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے اس طرح گرتے چلے گئے جیسے بادِ خزاں کے جھونکوں سے درختوں کے سوکھے پتے گرتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ ان کے سامنے تلواریں بے نیام ہوں، شہروں اور دیہاتوں کے باشندوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ جلد از جلد اپنے لیے امان حاصل کریں۔ اس طرح حضرت ربیعؓ علاقوں پر علاقے فتح کرتے اور کامرانی و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے سجستان کے پایۂ تخت "زرنگ" تک جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ دشمن ان سے مقابلہ کرنے کے لیے پورے ساز و سامان کے ساتھ تیار اور زبردست جمعیت فراہم کر کے پیش قدمی کرنے پر آمادہ ہے اور اس بات کا عزم بالجزم کر رکھا ہے کہ انہیں اس بڑے شہر سے مار بھگائے گا اور ان کی فوج کو سجستان سے واپس جانے پر مجبور کر دے گا، خواہ اس کے لیے اس کو کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔

پھر ان کے اور ان کے دشمنوں کے درمیان ایسی خوں ریز اور ہلاکت آفریں معرکہ آرائی ہوئی جس نے فریقین کو پیس کر رکھ دیا۔ اس جنگ میں جانبین میں سے کسی نے بھی اپنے آدمیوں کی قربانی دینے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا۔

لیکن پھر جنگ کا پانسہ پلٹا اور جب مسلمانوں کی فتح کے ابتدائی آثار ظاہر ہوئے تو ایرانی سپہ سالار "پرویز" نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ جب تک اس کے پاس طاقت بچی ہوئی ہے، حضرت ربیعؓ کے ساتھ صلح کی کوشش شروع کردے، ممکن ہے کہ وہ اپنے اور اپنی قوم کے لیے بہتر شرائط پر صلح کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ چنانچہ اس نے اپنا ایک قاصد حضرت ربیعؓ بن زیاد کے پاس بھیجا اور ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سے ملاقات کے لیے کسی مناسب جگہ اور وقت کا تعین فرمادیں تاکہ وہ اُن سے صلح کی بات چیت کرسکے۔ حضرت ربیعؓ نے اس کی یہ بات منظور فرمالی۔ قاصد کے واپس جانے کے بعد انھوں نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ "پرویز" کے استقبال کے لیے ایک موزوں جگہ کا انتخاب کریں۔ اور ان سے یہ بھی کہا کہ اُن کی نشست گاہ کے چاروں طرف ایرانی مقتولین کی لاشوں کے ڈھیر لگادیں اور اس کی گزرگاہ کے دونوں جانب اس کے فوجیوں کی لاشیں غیر مرتب طور پر بکھیر دیں۔

حضرت ربیعؓ نہایت بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا قد لمبا، سر بڑا، رنگ گندمی اور ڈیل ڈول ایسا زبردست تھا کہ دیکھنے والا ان سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جب "پرویز" صلح کی گفتگو کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچا تو مرعوبیت کی وجہ سے تھر تھر کانپنے لگا اور لاشوں کے اس منظر کو دیکھ کر خوف و ہراس کے مارے اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اُوپر اس طرح خوف مسلط ہوگیا کہ وہ حضرت ربیعؓ کے قریب آنے اور آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ دُور ہی کھڑے ہوکر ہکلاتے ہوئے اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے خوشامدانہ انداز میں ان سے بات کی اور اس شرط پر صلح کی خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن کو ایک ہزار غلام پیش کرے گا جن میں سے ہر ایک کے سر پر ایک

سنہرا جام ہوگا۔ حضرت ربیعؓ نے اس کی یہ پیش کش قبول فرماکر اس کے ساتھ صلح کرلی۔ اور دوسرے دن وہ اس شان سے شہر میں داخل ہوئے کہ غلاموں کی جماعت ان کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھی اور پوری فضا مسلمانوں کی تہلیل و تکبیر کے فلک بوس نعروں سے گونج رہی تھی۔

حضرت ربیع بن زیاد رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک شمشیر برہنہ تھے جس سے وہ دشمنانِ خدا پر حملہ آور ہوتے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے بہت سے علاقے فتح کیے اور مختلف صوبوں کی گورنری کے فرائض انجام دیے، یہاں تک کہ جب بنوامیہ کی حکومت کا دور آیا تو حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے انھیں خراسان کا گورنر بنا دیا۔ حالانکہ وہ دل سے اس ذمہ داری کو انجام دینے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کی کراہت و ناپسندیدگی میں اس بات نے مزید اضافہ کر دیا کہ بنوامیہ کی حکومت کے ایک نہایت اہم اور ذمہ دار رکن "زیاد بن ابیہ" نے جب ان کو لکھا کہ

"امیر المومنین حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کا حکم ہے کہ جنگ میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت میں سے سونے اور چاندی کو مرکزی بیت المال کے لیے مخصوص کردو۔ اور ان کے علاوہ باقی چیزیں مجاہدین میں تقسیم کرو۔"

تو انھوں نے اس کے جواب میں تحریر کیا کہ،

"تم نے امیر المومنین کی طرف سے جو بات لکھی ہے۔ کتاب اللہ کا حکم اس کے خلاف ہے۔" پھر انھوں نے فوج میں اعلان کروادیا کہ سب لوگ آکر مالِ غنیمت میں سے اپنے حصّے لے جائیں۔" اس کے بعد انھوں نے خمس دارالخلافہ "دمشق" بھجوادیا۔

اس خط کے موصول ہونے کے اگلے دن جمعہ تھا۔ حضرت ربیعؓ نے

سفید کپڑے پہنے، نماز جمعہ کے لیے مسجد تشریف لائے جمعہ کا خطبہ دیا اور خطبہ کے بعد فرمایا کہ

" لوگو! اب میں زندگی سے بے زار ہو چکا ہوں۔ میں ایک دُعا کرتا ہوں۔ آپ سب لوگ میری اس دعا پر آمین کہیں"۔ پھر انھوں نے دعا کی "خدایا! اگر تو میرے حق میں کسی خیر کا ارادہ رکھتا ہے تو مجھے جلد از جلد اپنے پاس بُلالے"۔ حاضرین مجلس نے آمین کہی، اور اُس روز کا سورج ابھی آسمان میں غروب نہیں ہوا تھا کہ جرأت و شجاعت اور عزم و حوصلہ کا یہ نیرّ تاباں سرزمین خراسان میں روپوش ہو چکا تھا۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

حُصَین بن سلام مدینے کے ایک بڑے یہودی عالم، ادیان و ملل میں اختلاف کے باوجود تمام باشندگانِ مدینہ کے نزدیک قابلِ احترام، لوگوں میں اپنی پرہیزگاری اور صالحیت کی وجہ سے معروف اور اپنی راست روی اور راست گوئی کے سبب اچھی شہرت کے حامل تھے۔ وہ ایک خاموش طبع شخص تھے اور نہایت پُرسکون، مطمئن اور سنجیدہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی نیکیوں میں سرگرم اور لوگوں کی نفع رسانی کے لیے وقف تھی۔ انھوں نے اپنے اوقات کو تین حصّوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک حصّہ کلیسا میں وعظ و نصیحت اور عبادت کے لیے، ایک حصّہ اپنے باغ میں درختوں کی کاٹ چھانٹ اور ان کی پیوندکاری کے لیے اور ایک حصّہ توراۃ کے مطالعہ اور تفقہ فی الدین کے لیے۔ وہ جب بھی توراۃ کا مطالعہ کرنے بیٹھتے تو ان مقامات پر رُک کر دیر تک غور و فکر کرتے جہاں مکّے میں مبعوث ہونے والے اس نبی کی بشارت ہوتی جو انبیاء سابقین کے پیغامات کی تکمیل اور ان کے سلسلے کو ختم کرنے والا تھا۔ وہ اس آنے والے نبیؐ کے اوصاف اور اس کی علامات کی چھان بین کرتے اور اس بات پر خوشی سے جھوم اُٹھتے کہ وہ اپنے شہر سے ہجرت کرکے یثرب کو اپنا مستقر بنائے گا۔ وہ توراۃ میں جب بھی ان خبروں

کو پڑھتے یا ان کا خیال دل میں گزرتا تو یہی دُعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ انھیں عمر کی اتنی مہلت عطا فرمائے کہ وہ اُس نبیِ منتظَر کے ظہور کا مشاہدہ کر سکیں، اس کی ملاقات کی سعادت سے بہرہ در ہو سکیں اور اس پر ایمان لانے والوں کے پہلے زُمرے میں شامل ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے حُصَین بن سلام کی اِس دعا کو شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے ان کی عمر کو نبیٔ رحمت کی بعثت تک دراز کر دیا اور ان کے مقدر میں یہ بات لکھ دی گئی کہ وہ اس کی ملاقات اور صحبت سے بہرہ مند ہوں اور اس حق پر ایمان لائیں جو اس پر نازل کیا گیا تھا۔ ہم یہ بات حصین ابن سلام ہی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنے ایمان لانے کا قصّہ خود ہی بیان کریں کیونکہ وہی اس کو زیادہ بہتر انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔

"جب میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر سنی تو ان کے نام و نسب، ان کی صفات اور ان کے زمانۂ ظہور اور مقامِ بعثت کا موازنہ ان باتوں سے کیا جو ہماری کتاب توراۃ میں ان کے متعلق درج تھیں۔ نتیجتہً مجھے ان کی نبوت کا یقین ہو گیا اور ان کی دعوت کی صداقت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے میں نے اپنی زبان کو سختی کے ساتھ بند رکھا، یہاں تک کہ وہ دن آ گیا جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ کو چھوڑ کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب آپؐ نے یثرب پہنچ کر قُبا میں قیام فرمایا تو وہاں سے ایک آدمی ہماری طرف آیا جو آپؐ کی تشریف آوری کا اعلان کر رہا تھا۔ اس وقت میں کھجور کے ایک درخت پر چڑھا ہوا کچھ کام کر رہا تھا۔ اور میری پھوپھی خالدہ بنتِ حارث اس کے نیچے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے یہ خبر سنتے ہی زور زور سے اللہ اکبر۔۔ اللہ اکبر

کی صدا بلند کی ۔ پھوپھی نے میری تکبیر کی آواز سُن کر کہا ۔
" اللہ تجھے نامراد کرے ؛ اگر تو موسیٰ ابن عمران کی آمد کی خبر سُنتا تو اِس سے زیادہ کچھ نہ کرتا ۔"

میں نے اُن سے کہا " پھوپھی جان ! خدا کی قسم یہ موسیٰ ابنِ عمران کے بھائی اور انھیں کے دین پر ہیں ، یہ بھی وہی دین لے کر آئے ہیں جس کو وہ لائے تھے ۔"

انھوں نے کہا " کیا یہ وہی نبی ہیں جن کے بارے میں تم ہمیں بتایا کرتے تھے کہ وہ اپنے سے پہلے انبیاء کی تصدیق اور اپنے رب کے پیغامات کی تکمیل کرنے کے لیے مبعوث ہوں گے ؟"

" ہاں " میں نے جواب دیا ۔

" تب ٹھیک ہے " انھوں نے کہا ۔

پھر میں کسی تاخیر کے بغیر اسی دم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چل پڑا ۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے دروازے پر جمع ہے ۔ میں اس ہجوم میں شامل ہو کر آپ کے قریب پہنچا تو سب سے پہلی بات جو میں نے آپ کی زبانِ مبارک سے سُنی وہ یہ تھی ۔

" اَیُّھَا النَّاسُ ! اِفْشُوا السَّلَام ، وَ اَطْعِمُوا الطَّعَام ، صَلُّوا بِاللَّیْلِ وَ النَّاسُ نِیَامٌ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِسَلَامٍ ۔"

" لوگو ! سلام کو عام کرو ، بھوکوں کو کھانا کھلاؤ ، رات کو نماز پڑھو جب کہ لوگ سو رہے ہوں ، سلامتی کے ساتھ جنّت میں داخل ہو جاؤ گے ۔"

میں نے آپ کے چہرے پر تجسّس بھری نظر ڈالی اور دیر تک اسے دیکھتا رہا ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کا چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے ۔ پھر

جب میں نے قریب جاکر کلمۂ توحید و رسالت کی گواہی دی تو آپؐ نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"حُصین بن سلام" میں نے جواب دیا۔

"نہیں، بلکہ تم عبداللہ بن سلام ہو" آپؐ نے فرمایا۔

میں نے کہا "ہاں، عبداللہ بن سلام، قسم اُس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے، میں پسند نہیں کرتا کہ آج کے بعد اس کے سوا میرا کوئی دُوسرا نام رہے۔"

پھر میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے واپس جاکر گھر میں اپنے بیوی بچّوں اور دیگر افرادِ خانہ کو اسلام کی دعوت دی اور سب نے اسے قبول کرلیا۔ ان کے ساتھ میری پھوپھی بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئیں جو اس وقت کافی ضعیف العمر تھیں۔ پھر میں نے سب کو تاکید کردی کہ جب تک میں اجازت نہ دوں، میرے اور اپنے قبولِ اسلام کی خبر کو یہودیوں سے پوشیدہ رکھنا۔ اس کے بعد میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچ کر ان سے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ یہودی بڑے بُہتان طراز اور باطل پرست لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کے سرداروں اور رئیسوں کو اپنے پاس بُلائیں اور مجھے اپنے کسی حجرے میں چُھپادیں اور ان سے دریافت فرمائیں کہ ان کے نزدیک میرا کیا مقام و مرتبہ ہے۔ پھر قبل اس کے کہ ان کو میرے مسلمان ہونے کی خبر معلوم ہو، انھیں اسلام کی دعوت دیں۔ کیونکہ اگر ان کو اس بات کا علم ہوگیا کہ میں مسلمان ہوچکا ہوں تو وہ میرے اُوپر طرح طرح کے

عیب لگائیں گے ، ہر قسم کی کوتاہیوں کو میری طرف منسوب کریں گے اور الزام تراشی سے کام لیں گے ۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو ایک حجرے میں چھپانے کے بعد ان کو اپنے پاس بلوایا اور انھیں اسلام قبول کرنے پر ابھارا ، ایمان کی رغبت دلائی اور ان تمام باتوں کی یاددہانی کرائی جن کو وہ اپنی کتابوں کے ذریعے جانتے تھے ۔ لیکن انھوں نے آپ کی بات مان کر نہ دی بلکہ الٹا حق کے معاملے میں باطل طریقے سے آپ کے ساتھ جھگڑنے لگے ۔ میں حجرے میں بیٹھا اُن کی وہ ساری باتیں سن رہا تھا ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے قبولِ اسلام سے مایوس ہو گئے تو آپ نے ان سے پوچھا ۔

"حصین بن سلام کا تمہارے یہاں کیا مقام و مرتبہ ہے ؟"

وہ بولے " وہ ہمارے سردار ، پیشوا اور عالم ہیں ۔ وہ ہمارے سردار ، پیشوا اور عالم کے بیٹے ہیں ۔"

"اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو تمہارا کیا خیال ہے ، تم بھی اس کو قبول کرلو گے ؟" آپ نے ان سے دریافت فرمایا ۔

" حاشا و کلا ۔ بھلا وہ کیوں اسلام قبول کرنے لگے ۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس بات سے پناہ میں رکھے کہ وہ اسلام کو اختیار کریں ۔" انھوں نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا ۔

ان کی یہ بات سن کر میں حجرے سے باہر نکلا اور ان سے کہا ۔

" اے گروہِ یہود ! اللہ سے ڈرو اور اس حق کو تسلیم کرلو جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں ۔ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ یہ اللہ کے رسول ہیں ۔ تم ان کے نام اور ان کے اوصاف کو توراۃ میں لکھا ہوا پاتے

ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، میں ان کے اُوپر ایمان لاتا ہوں، ان کی تصدیق کرتا ہوں اور ان کو خوب اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔"

مگر انھوں نے کہا۔" تم نے جھوٹ کہا۔ خُدا کی قسم تم ہم میں سب سے زیادہ بُرے، سب سے بُرے آدمی کے بیٹے اور سب سے زیادہ جاہل شخص کے لڑکے ہو۔" اُنھوں نے کوئی ایسا عیب نہیں چھوڑا جس کا الزام میرے اُوپر نہ لگایا ہو۔ تب میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا۔

"میں نے آپ سے عرض نہیں کیا تھا کہ یہ یہودی بڑے بُہتان طراز، باطل پرست اور غدار وفاجر لوگ ہیں۔"

حضرت عبداللہؓ بن سلام اسلام کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے جیسے کوئی تشنہ لب بڑی بے تابی کے ساتھ چشمۂ آب کی طرف لپکتا ہے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کو اپنے اوپر اس طرح لازم کر لیا کہ کبھی اس سے جُدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ قرآن کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ ان کی زبان ہر وقت اس کی آیاتِ بیّنات کی تلاوت سے تر رہتی تھی۔ اور انھوں نے اپنے آپ کو جنّت میں لے جانے والے اعمال کے واسطے یُوں وقف کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنّت کی بشارت دیدی۔ ایک ایسی بشارت جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں مشہور ہو گئی۔ اس بشارت کے پس منظر میں ایک قصّہ ہے جس کو قیس بن عبادہ وغیرہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ایک دفعہ میں مدینۂ منورہ میں مسجد نبوی کے اندر ایک علمی مجلس میں شریک تھا۔ اس مجلس میں ایک بزرگ بھی بیٹھے ہوئے تھے جن کو دیکھنے

ے رُوح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ وہ لوگوں سے نہایت شیریں اور موثر باتیں کر رہے تھے۔ جب مجلس برخاست ہوئی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو اہلِ مجلس نے کہا۔

"جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہو، وہ انھیں دیکھ لے۔"

میں نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں تو ان لوگوں نے بتایا کہ یہ عبداللہؓ بن سلام ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ان کے پیچھے پیچھے جاؤں گا۔ چنانچہ میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ وہ چلتے رہے یہاں تک کہ شہر کے آخری سرے پر پہنچ کر اپنے گھر میں داخل ہوگئے۔ میں نے ان سے اندر آنے کی اجازت طلب کی، جو مجھے مل گئی۔ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"بھتیجے! تمہاری کیا ضرورت ہے؟"

"جب آپ مسجد سے نکلے تو میں نے لوگوں کو آپ کے متعلق یہ کہتے سنا کہ "جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے وہ ان کو دیکھ لے"، اس لیے میں آپ کے ساتھ آیا ہوں کہ آپ کے حالات سے واقفیت حاصل کروں اور یہ معلوم کر سکوں کہ لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ اہلِ جنت میں سے ہیں۔" میں نے اپنی غرض بتائی۔

"بیٹے! یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جنتی کون ہے؟" انھوں نے ارشاد فرمایا۔

"ہاں، یہ بات تو صحیح ہے لیکن لوگوں نے جو کچھ کہا، اس کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔" میں نے عرض کیا۔

"میں تم کو اس کا سبب بتاتا ہوں۔" انھوں نے فرمایا۔

"ارشاد فرمائیے، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔" میں نے اپنے شوق کا

اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کی بات ہے۔" انھوں نے بیان شروع کیا "کہ میں ایک رات کو سویا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک آدمی نے آکر مجھ سے کہا کہ اُٹھو۔ چنانچہ میں اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے اپنے ساتھ لے کر چل پڑا چلتے چلتے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں بائیں جانب ایک راستہ جارہا تھا۔ جب میں نے اس راستے کی طرف مُڑنا چاہا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ اسے چھوڑو۔ یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔ پھر میں نے آگے دیکھا تو داہنی سمت میں ایک نہایت واضح اور صاف راستہ نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا اس راستے سے آگے چلو۔ میں اس راستے پر ہولیا اور آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ایک باغ میں جا پہنچا۔ وہ باغ نہایت وسیع و عریض، سرسبز و شاداب اور دلکش و خوشنما تھا۔ اس میں ہر طرف طائرانِ خوش الحان نغمہ ریز تھے۔ اس باغ کے بیچوں بیچ لوہے کا ایک ستون نصب تھا جس کی جڑ زمین میں پیوست تھی اور اس کا سر آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے اُوپر سونے کا ایک حلقہ تھا۔ اس آدمی نے مجھ سے کہا کہ اس پر چڑھ جاؤ۔ میں نے کہا میں نہیں چڑھ سکوں گا۔ تب میرے پاس ایک خادم آیا۔ اس نے مجھے اُوپر اُٹھایا اور میں اُس کی مدد سے اس پر چڑھتا ہوا آخری سرے تک پہنچ گیا اور حلقے کو اپنے دونو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور صبح تک اسے پکڑے رہا۔"

سویرے جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا یہ خواب بیان کیا تو آپؐ نے فرمایا۔

"جو راستہ تم نے بائیں طرف دیکھا تھا، وہ اصحاب الشمال (اہلِ دوزخ)

کاراستہ تھا۔ اور جو راستہ تم کو داہنی جانب نظر آیا تھا وہ اصحاب الیمین (اہلِ جنّت) کا راستہ تھا۔ اور وہ باغ جس کی شادابی اور رونق تم کو دلکش معلوم ہوئی، وہ اسلام تھا۔ اور اس کے وسط میں جو ستون تھا وہ دین کا ستون تھا۔ اور اس کے اُوپر جو حلقہ تھا وہ عُروۃُ الوُثقیٰ (مضبوط حلقہ) تھا۔ اور تم اس حلقے کو زندگی کی آخری سانس تک مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے"

حضرت سُراقہ بن مالک رضی اللہ عنہٗ

ایک صبح قریشِ مکہ خوف و دہشت کے مارے ہڑبڑا کر نیند سے بیدار ہوئے کیونکہ ان کی تمام مجالس میں یہ خبر گشت کر رہی تھی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کی تاریکی میں مکہ چھوڑ کر چپکے سے کہیں چلے گئے، لیکن قریش کے سردار کسی قیمت پر اس خبر کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ بنی ہاشم اور اصحاب محمدؐ کے ایک ایک گھر میں ان کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ جب وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کی تلاشی لینے پہنچے اور ان کی صاحب زادی "اسماء" گھر سے نکل کر ان کے سامنے آئیں تو ابو جہل نے ان سے پوچھا۔

"لڑکی تیرا باپ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہیں" انھوں نے جواب دیا۔

ان کے اس جواب پر وہ آگ بگولہ ہوگیا اور ہاتھ اٹھا کر ان کے چہرے پر ایسا زور دار تھپڑ مارا کہ ان کی بالی کان سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

جب قریش کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی مکہ چھوڑ کر نکل گئے ہیں تو ان کا جنون اپنی تمام حدوں کو پار کر گیا۔ اور انھوں نے کھوجیوں اور سراغ رسانوں کو اس راستے کی نشان دہی کے کام پر لگا دیا جس سے

وہ گزرے ہیں۔ وہ خود بھی ان کے ساتھ تلاش میں نکل پڑے۔ تلاش کرتے کرتے جب وہ غارِ ثور تک پہنچے تو سُراغ رسانوں نے کہا کہ تمھارا مطلوبہ شخص اس غار سے آگے نہیں بڑھا ہے۔ اور ان کی یہ بات غلط بھی نہیں تھی۔ کیونکہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیقِ سفر واقعی اسی غار کے اندر تھے اور قریش ان کے سَروں پر کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب ان کے قدموں کو غار کے اُوپر حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اُوپر ایک عتاب آمیز اور محبت بھری نگاہ ڈالی تو انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"خدا کی قسم، میں اپنی جان کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ مجھے اس خوف سے رونا آرہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔"

"ابوبکر! گھبراؤ نہیں، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" آپؐ نے پورے اطمینان کے ساتھ کہا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے صدیقِ اکبرؓ کے دل پر اطمینان وسکون نازل کر دیا۔ اور وہ قریش کے قدموں کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسُولؐ! اگر ان میں سے کسی کی نظر اپنے پاؤں پر پڑ گئی تو وہ ہم کو ضرور دیکھ لے گا۔"

"ابوبکر! ان دو شخصوں کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہو۔" آپؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

اور اسی وقت انھوں نے ایک قریشی نوجوان کو یہ کہتے ہوئے سُنا: "آؤ چلیں، غار کے اندر چل کر دیکھیں۔ لیکن اُمیّۃ ابنِ خَلَف نے اس کی بات کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا تم اس مکڑی کو نہیں دیکھ رہے ہو جس نے غار کے مُنہ پر جالا تان رکھا ہے؟ خدا کی قسم یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش سے بھی پُرانا ہے۔" البتہ اس وقت ابوجہل نے کہا۔

"لات وعزیٰ کی قسم، میرا خیال ہے کہ وہ یہیں، کہیں ہم سے قریب ہی موجود ہیں۔ وہ ہماری سب باتیں سُن رہے ہیں اور ہماری ساری کارروائیاں دیکھ رہے ہیں لیکن ان کے جادو نے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔"

تاہم قریش کے لوگ نہ تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش سے دست بردار ہوئے نہ ان کا تعاقب کرنے کے ارادے سے باز آئے۔ چنانچہ انھوں نے مکّہ اور مدینہ کے درمیان طویل راستوں پر پھیلے ہوئے قبائل میں یہ اعلان کرا دیا کہ "جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مُردہ یا زندہ کسی حالت میں ان کے سامنے پیش کرے گا، اس کو انعام کے طور پر ایک سو بہترین اُونٹ دیے جائیں گے۔"

سُراقہ ابنِ مالک مُدلجی مکہ کے قریب "قُدَید" کے مقام پر اپنے قبیلے کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسی دوران قریش کا ایک قاصد وہاں پہنچا اور اس نے ان کے سامنے اس بڑے انعام کا اعلان کیا جس کو قریش نے اس شخص کے لیے رکھا تھا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندہ یا مُردہ کسی حالت میں ان کے سامنے پیش کرے۔ انعام کے سُو اونٹوں کا یہ اعلان سُنتے ہی سراقہ کے دل میں حرص نے سر اُٹھایا اور اس کو انھیں حاصل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اس کے متعلق ایک لفظ بھی اپنی زبان پر نہیں آنے دیا کہ کہیں دُوسرے لوگوں کے دل میں بھی اس کا خیال نہ پیدا ہو جائے۔ اور قبل اس کے کہ سراقہ اس مجلس سے اُٹھتا اس کے قبیلے کے ایک

شخص نے آکر اطلاع دی کہ "خدا کی قسم! ابھی میرے سامنے سے تین آدمی گزرے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ابوبکر اور ان کا راہبر ہیں"۔ مگر سراقہ نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں، وہ فلاں قبیلے کے لوگ ہیں جو اپنی ایک گم شدہ اونٹنی کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"شاید وہی ہوں"۔ اتنا کہہ کر وہ شخص خاموش ہوگیا۔

پھر سُراقہ اس خیال سے کچھ دیر تک وہاں ٹھہرا رہا کہ کہیں اس کے اُٹھنے سے اہلِ مجلس کو کوئی شُبہ نہ پیدا ہو جائے۔ جب لوگ دُوسرے موضوع پر گفتگو کرنے میں مصروف ہوگئے تو وہ دھیرے سے وہاں سے کھسک آیا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے چپکے سے اپنی لونڈی سے کہا کہ وہ اس کے گھوڑے کو لوگوں کی نظروں سے بچا کر لے جائے اور اسے وادی کے نشیبی حصّے میں باندھ دے۔ اور اپنے غلام کو حکم دیا کہ وہ اس کے ہتھیار گھر کے پیچھے سے نکال کر لے جائے تاکہ کوئی دیکھ نہ سکے اور انھیں گھوڑے کے قریب ہی کہیں رکھ دے۔

سراقہ نے اپنی زرہ پہنی، بدن پر ہتھیار سجائے اور گھوڑے پر سوار ہوکر اسے سرپٹ چھوڑ دیا تاکہ قبل اس کے کوئی دُوسرا شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے قریش کا مقرر کردہ انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ خُود ان کو پکڑ لے۔

سُراقہ اپنے قبیلے کے معدودے چند ماہر شہسواروں اور مشہور بہادروں میں تھا۔ اس کا قد لمبا اور سر کافی بڑا تھا۔ وہ ایک تجربہ کار سُراغ رساں،

کامیاب قیافہ شناس، خطرات کے بالمقابل ثابت قدم رہنے والا، نہایت ہوشیار و عقل مند اور ایک اچھا شاعر تھا۔ اور اس کا گھوڑا بہت عمدہ نسل کا تھا۔ وہ تیز رفتاری کے ساتھ قطعِ مسافت کرتا ہوا اپنی دھن میں مگن منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ اس کی پشت سے نیچے آ رہا۔ اُس نے اسے بدشگونی پر محمول کیا اور دل میں کہا "یہ کیا ہے" اور گھوڑے کو بُرا بھلا کہتا ہوا اس پر سوار ہو گیا۔ تھوڑی دور جاتے جاتے گھوڑے کو دوبارہ ٹھوکر لگی۔ اس نے اور زیادہ بدشگونی محسوس کی اور واپسی کا ارادہ کرنے لگا لیکن سو اونٹوں کی لالچ نے اس کو اس ارادے سے باز رکھا۔

سُراقہ اس جگہ سے ــــ جہاں اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی تھی ــــ ابھی زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ اس کی نگاہیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی پر جا پڑیں۔ اس نے اپنا ہاتھ کمان کی طرف بڑھایا لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔ کیونکہ اس نے دیکھا کہ اس کے گھوڑے کی ٹانگیں زمین میں دھنس رہی ہیں اور سامنے سے دُھواں اُٹھ کر اس کی اور گھوڑے کی آنکھوں کے سامنے حائل ہو رہا ہے۔ اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی مگر اس کے پاؤں اس طرح مضبوطی کے ساتھ زمین میں پیوست ہو گئے تھے جیسے ان میں لوہے کی میخیں ٹھونک دی گئی ہوں۔ تب اس نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفیق کی طرف متوجہ ہو کر عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"میری بات سُنیئے۔ آپ دونوں اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ میرے گھوڑے کی ٹانگیں زمین سے نکال دے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے تعاقب سے باز آ جاؤں گا۔"

اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دُعا کر دی اور اللہ تعالیٰ

نے اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین سے نکال دیے۔ لیکن اس کا لالچ از سرِ نو حرکت میں آگیا اور اس نے گھوڑے کو جوں ہی ان کی طرف بڑھایا، اس کی ٹانگیں اب کی بار پہلے سے زیادہ دھنس گئیں۔ اس نے پھر ان دونوں کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے کہا۔

"آپ میرا زادِ راہ، سامان واسباب اور میرے اسلحے لے لیں۔ میں خدا کو گواہ بناکر اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ اپنے پیچھے آپ کے تعاقب میں آنے والوں کو واپس کر دوں گا۔" لیکن ان لوگوں نے جواب دیا۔

"ہمیں تمہارے زادِ راہ اور سامان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف ہمارا پیچھا کرنے والوں کو لوٹا لے جانا۔"

پھر آپ نے اس کے لیے دُعا کی اور گھوڑے کی ٹانگیں آزاد ہوگئیں۔ سراقہ نے واپسی سے پہلے ان لوگوں کو پکار کر کہا۔

"ذرا رکیے، مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ خدا کی قسم میری طرف سے اب کوئی ایسی حرکت نہیں صادر ہوگی جو آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔"

"تم ہم سے کیا کہنا چاہتے ہو؟" انھوں نے رکتے ہوئے کہا۔

"محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم)، بخدا میں جانتا ہوں کہ دین اور اقتدار قائم ہو کر رہے گا۔ آپ مجھ سے اس بات کا عہد کیجیے کہ اُس وقت جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو آپ مجھے عزت بخشیں گے۔ اور اس کے لیے مجھے ایک تحریر دید یجیے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا اور انھوں نے ایک چوڑی ہڈی پر یہ تحریر لکھ کر اس کے حوالے کر دی۔ اور جب

وہ واپس جانے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"سُراقہ! اس وقت تم کیسا محسوس کرو گے جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے؟"

"کسریٰ ابن ہرمز کے؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں، ہاں، کسریٰ ابن ہرمز کے۔" آپؐ نے جواب دیا۔

اس کے بعد سراقہ اپنے قبیلے میں لوٹ آیا۔ اس نے دیکھا کہ لوگ بڑی سرگرمی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں مصروف ہیں تو ان سے کہا۔

"واپس لوٹ چلو۔ میں نے ان کی تلاش میں زمین کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ اور تم لوگ سُراغ رسانی میں میری مہارت سے ناواقف نہیں ہو۔" اور وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اس نے رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ اپنی اس ملاقات اور باہم طے ہونے والے عہد و پیمان کو پوشیدہ رکھا۔ جب اس کو یقین ہوگیا کہ وہ لوگ قریش کی دسترس سے بچ کر اپنے محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں تب اس کا انکشاف کیا۔ جب ابوجہل نے یہ خبر سُنی اور اس کے عدم تعاون، بزدلی اور اتنا زرّیں موقع ضائع کر دینے پر اس کی ملامت کی تو اس کا جواب دیتے ہوئے سُراقہ نے کہا۔

أَبَا حَكَمٍ وَاللّٰهِ لَوْ كُنْتَ شَاهِداً	"ابوالحکم! اگر تم اُس واقعے کو دیکھتے جو میرے
لِأَمْرِ جَوَادِيْ إِذْ تَسُوْخُ	گھوڑے کے ساتھ پیش آیا تھا، جب اس کے
قَوَائِمُهُ عَلِمْتَ وَلَمْ	پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے، تو تم کسی
تَشْكُكْ بِأَنَّ مُحَمَّداً	ریب و شک کے بغیر یہ جان لیتے کہ محمد
رَسُوْلٌ بِبُرْهَانٍ فَمَنْ ذَا	(صلی اللہ علیہ وسلم) دلیل و بُرہان کے ساتھ

یُقَادِمُہٗ۔ اللہ کے رسول ہیں پھر ایسی صورت میں کون ہے
جو ان کے سامنے تابِ مقاومت رکھتا ہے۔"

زمانہ اپنی معمول کی رفتار سے گردش کرتا رہا۔ سورج مشرق سے طلوع ہوتا اور مغرب میں ڈوبتا رہا۔ دن، مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب وہی محمدؐ —— جو بے یار و مددگار، بے کسی اور لاچاری کی حالت میں رات کی تاریکی میں چھپ کر مکے سے نکلے تھے —— ہزاروں چمکتی تلواروں اور گندم گوں نیزوں کی جھرمٹ میں فاتحانہ انداز سے اس میں داخل ہو رہے تھے۔ اور قریش کے وہ بڑے بڑے مغرور سردار اور اس کے عظیم المرتبت متکبر زعماء جنہوں نے زمین کو اپنے ظلم و جبر سے بھر دیا تھا۔ خوف و دہشت سے لرزہ براندام ان کے سامنے کھڑے، دامن پسارے رحم و کرم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ آپ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔
اور وہ انبیائی عفو و درگزر کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
"إِذْهَبُوا فَأَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ جاؤ، تم پر کوئی دار و گیر نہیں ہے۔ آج تم سب آزاد ہو۔"

اس وقت سراقہ نے اپنی سواری تیار کی اور اس پر سوار ہو کر چل پڑا تا کہ بارگاہ رسالتمآب میں حاضر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کرے۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں وہ تحریری عہد نامہ تھا جو دس سال پہلے آپؐ نے اس کو لکھ کر دیا تھا۔ سراقہؓ بیان کرتے ہیں۔

"میں اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جب آپؐ مقام "جِعِرَّانَہ" پر قیام پذیر تھے۔ میں اسلامی فوج کے ایک دستے میں داخل ہوا جو انصاری سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ وہ مجھ کو اپنے نیزوں کے

پچھلے سروں سے مار مار کر کہہ رہے تھے ,, دور ہٹ ، دور ہٹ ، کیا چاہتا ہے"!
لیکن میں برابر ان کی صفوں کو چیر کر آگے بڑھتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت آپؐ اپنی اونٹنی پر تشریف فرما تھے۔ میں نے عہد
نامے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بلند کرتے ہوئے کہا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میں سُراقہ ابن مالک ہوں اور یہ وہ تحریر ہے
جو آپ نے مجھے لکھ کر دی تھی۔"

تو آپؐ نے فرمایا۔

"اُدْنُ مِنّی یَا سُرَاقَہ اُدْنُ.... سُراقہ! میرے قریب آؤ... میرے قریب
هٰذَا یَوْمُ وَفَاءٍ وَبِرٍّ۔ ...... یہ ایفاءِ عہد اور حسنِ سلوک کا
دن ہے۔"

پھر میں نے سامنے پہنچ کر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور آپؐ کے احسان اور
حسن سلوک سے بہرہ یاب ہوا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت سُراقہ ابن مالک رضی اللہ
عنہ کی اس ملاقات کو ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا۔ حضرت سُراقہؓ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی وفات پر بے حد غمگین ہوئے اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس
روز کا منظر گردش کرنے لگا جب انھوں نے سو اونٹوں کے لالچ میں آکر آپؐ کو
قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور آج یہ حال ہے کہ دنیا کے سارے اونٹوں کی
حیثیت ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناخن کے ایک تراشے
کے برابر بھی نہیں تھی۔ وہ بار بار حضورؐ کی اس بات کو دہرا رہے تھے۔

"کَیْفَ بِکَ یَا سُرَاقَۃُ اِذَا لَبِسْتَ سُراقہ! اُس وقت تمہاری کیا کیفیت

سِوَارَیْ کِسْرٰی۔ ہوگی جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے؟"

اور ان کو اس بات میں ذرہ برابر شک وشبہ نہیں تھا کہ ایک دن وہ انھیں ضرور پہنیں گے۔

زمانے کی گردش نے حالات وواقعات میں انقلاب وتبدیلی کے اپنے عمل کو مسلسل جاری رکھا یہاں تک کہ مسلمانوں کی خلافت کی ذمہ داری خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آپڑی۔ اور ان کے عہدِ مبارک میں مسلمانوں کی فوجیں آندھی طوفان کی طرح ایران کی سلطنت پر ٹوٹ پڑیں۔ وہ پے در پے قلعوں پر قلعے فتح کرتی، فوجوں کو شکست پر شکست دیتی، تختوں کو اُلٹتی اور اموالِ غنیمت سمیٹتی چلی جارہی تھیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں شاہانِ کسریٰ کی عظیم سلطنت کا خاتمہ کرادیا۔

یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے آخری زمانے کی بات ہے۔ ایک روز حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کے قاصد فتح کی بشارت لے کر دربارِ خلافت میں حاضر ہوئے۔ وہ اپنے ساتھ مسلمانوں کے بیت المال کے لیے اُس مالِ غنیمت کا خمس بھی لائے تھے جس کو غازیانِ اسلام نے حاصل کیا تھا۔ جب وہ تمام چیزیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھی گئیں تو انھیں دیکھ کر حیران شُشدر رہ گئے۔ ان چیزوں میں کسریٰ کا وہ تاج تھا جو موتیوں سے مرصع تھا، اس کے وہ کپڑے تھے جن کے اُوپر زر دوزی کا کام ہوا تھا، اس کا وہ پٹکا تھا جس میں جواہرات اور ہیرے جڑے ہوئے تھے، اُس کے وہ کنگن تھے جن کے مثل کسی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور ان کے علاوہ دوسری بیشمار قیمتی اور نفیس چیزیں تھیں۔ حضرت عمرؓ اس قیمتی خزانے کو ایک چھڑی

سے ـــ جو اس وقت ان کے ہاتھ میں تھی ـــ اُلٹ پلٹ کر رہے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جن لوگوں نے اس امانت کو ادا کیا ہے، یقیناً وہ انتہائی امانت دار لوگ ہیں۔"

خلیفہ کی یہ بات سُن کر حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ـــ جو اس وقت وہاں موجود تھے ـــ اُن سے کہا۔

"امیر المومنین! آپ نے لوگوں کے اموال پر دست درازی سے احتراز کیا اسی لیے آپ کی رعایا بھی ان سے مُجتَنِب رہی۔ اگر آپ ان کا مال غلط طریقے سے کھاتے تو وہ بھی کھاتی۔"

اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سُراقہ ابن مالکؓ کو طلب فرمایا، ان کو کِسریٰ کی قمیص، اس کا پائجامہ، اس کی قبا، اور اس کے موزے پہنائے، اس کی تلوار اور پٹکا ان کی کمر میں باندھا اور اس کا تاج اُن کے سر پر رکھا۔ پھر دونوں کنگن، جی ہاں دونوں کنگن ان کے ہاتھوں میں پہنائے۔ اس وقت مسلمانوں نے بلند آواز سے نعرہ لگایا، اللہ اکبر... اللہ اکبر ... اللہ اکبر......

پھر حضرت عمرؓ نے ان کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرمایا،

"واہ وا...... خُدا کی شان، بنی مدلج کا ایک معمولی بدو اور اس کے سر پہ کسریٰ کا تاج اور ہاتھوں میں اس کے کنگن!!"

پھر آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہا۔

"خدایا! تو نے یہ مال اپنے رسولؐ کو نہیں دیا، حالانکہ وہ تیرے

نزدیک مجھ سے زیادہ محبوب و مکرم تھے۔ اور تو نے یہ مال ابوبکرؓ کو بھی نہیں دیا، حالانکہ وہ بھی تیرے نزدیک مجھ سے زیادہ محبوب و مکرم تھے اور تو نے یہ مال مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ میرے معبود! میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ یہ مال تو نے مجھے اس کے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے دیا ہو۔"

پھر جب تک انھوں نے وہ سارا مال مسلمانوں میں تقسیم نہیں کر لیا، اپنی جگہ سے نہیں اُٹھے۔
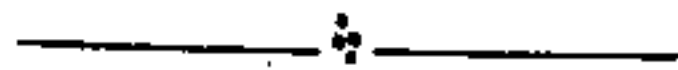
حضرت فیروز دَیلمی رضی اللہ عنہٗ

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد مرض الموت میں بتلا ہوئے اور پورے جزیرۃُ العرب میں آپ کی بیماری کی خبر مشہور ہوگئی تو یمن میں اسود عنسی، یمامہ میں مُسَیلمہ کذّاب اور بلادِ اسد میں طُلَیحہ اسدی اسلام سے مرتد ہو گئے۔ اور ان تینوں کذّابوں نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ وہ نبی ہیں اور بالکل اسی طرح اپنی اپنی قوموں کی طرف رسُول بنا کر بھیجے گئے ہیں جس طرح محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قریش کی طرف بھیجا گیا ہے۔

اسود عنسی ایک شعبدہ باز کاہن، بدباطن و شرپسند اور طاقت ور و قوی ہیکل شخص تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہایت فصیح و بلیغ اور جادو بیان مقرر تھا۔ وہ اپنی قوتِ تقریر اور زورِ خطابت کے ذریعہ لوگوں کی عقلوں کو مسخر کرلیتا۔ وہ اتنا عیّار تھا کہ اپنی بے بنیاد اور جھوٹی باتوں کے سہارے عوام کے جذبات سے کھیلنے اور خواص کو مال و دولت اور جاہ و منصب کی طلب پر برانگیختہ کرنے کی پُوری قدرت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کے اُوپر اپنی ہیبت طاری رکھنے کے لیے ہمیشہ ان کے سامنے نقاب پوش ہوکر نکلتا تھا۔

اس وقت یمن پر "ابناء" کی حکومت تھی اور ان کے سربراہ صحابیٔ رسولؐ

حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے آباء و اجداد ایرانی تھے اور ترکِ وطن کر کے یمن میں آباد ہو گئے تھے اور ان کی مائیں عربی النسل تھیں۔ اِن تارکینِ وطن کے سردار "باذان" ظہورِ اسلام کے وقت شاہِ ایران کی طرف سے یمن کے حاکم تھے۔ جب رسُول اللہ کی صداقت اور ان کی دعوت کی برتری ان کے سامنے واضح ہو گئی تو انھوں نے کسریٰ کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور اپنی قوم سمیت اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو اس منصب پر برقرار رکھا۔ یہاں تک کہ اسود عنسی کے دعوئ نبوت سے کچھ عرصہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔

اسود عنسی کی دعوت پر جن لوگوں نے سب سے پہلے لبیک کہا، وہ اس کے اپنے قبیلے بنو مذحج کے لوگ تھے۔ اس نے ان کو لے کر صنعاء پر حملہ کیا اور اس کے حاکم "شہر ابن باذان" کو قتل کر کے ان کی بیوہ "واذا" سے شادی کر لی۔ پھر صنعاء سے دوسرے علاقوں پر چڑھ دوڑا اور وہ سارے علاقے اس کے حملوں کی تاب نہ لا کر حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ پے در پے اس کے آگے سرنگوں ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ حضرموت سے طائف تک اور بحرین احسار سے عدن تک کے سارے علاقے اس کے زیرنگیں آ گئے۔

لوگوں کو فریب دینے اور انھیں اپنی طرف مائل کرنے میں اسود عنسی کو سب سے زیادہ جس چیز سے تقویت ملی، وہ اس کی غیر معمولی عیاری تھی۔ وہ اپنے متبعین سے کہتا تھا کہ ایک فرشتہ اس کے پاس وحی لاتا اور اسے غیب کی باتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اس جھوٹے اور بے بنیاد دعوے کو ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے جاسوسوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں، جنھیں اس نے اس غرض سے ہر طرف پھیلا رکھا تھا کہ وہ لوگوں کے حالات معلوم کریں، ان کی پوشیدہ

باتوں کی ٹوہ لگائیں، ان کی مشکلات سے آگاہ ہوں اور ان کے دلوں میں پیدا ہونے والی تمناؤں اور اُمیدوں سے واقفیت حاصل کریں اور پھر یہ ساری معلومات چپکے سے اس کے پاس پہنچا دیا کریں۔ پھر وہ جاسوسوں کی ان فراہم کردہ معلومات کے مطابق ہر ضرورت منداور پریشان حال شخص سے اس کی ضرورت و پریشانی کے لحاظ سے ملاقات اور گفتگو کا آغاز کرتا تھا۔ وہ اپنے متبعین کے سامنے ایسی ایسی عجیب و غریب چیزیں پیش کرتا کہ ان کی عقلیں دنگ رہ جاتیں۔ یہاں تک کہ اس کی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی اور اس کی دعوت جنگل کی آگ کی طرح لوگوں کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسود عنسی کے ارتداد اور یمن پر اس کے حملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے یمن میں اسلام کی طرف سبقت کرنے والے ان دس صحابۂ کرام کو خطوط لکھے جن سے آپؐ کو خیر و تعاون کی اُمید تھی۔ ان خطوط میں آپؐ نے ایمان اور ہوشیاری کے ساتھ ان کو اس اندھے فتنے کا مقابلہ کرنے پر اُبھارا اور ہر صورت میں اسود عنسی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام جس کے پاس بھی پہنچا، اس نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا اور فی الفور اسے نافذ کرنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ اس دعوت پر لبیک کہنے والوں میں سب سے پیش پیش ہمارے اس قصے کے ہیرو فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھی تھے۔ ہم اس دل چسپ اور انوکھے قصّے کو بیان کرنے کے لیے انھیں کے الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

"میں نے اور "ابناء" میں سے میرے ساتھیوں نے نہ تو اسلام کی صداقت میں ایک لمحے کے لیے شک کیا نہ کسی کے دل میں دشمنِ خدا ــــــ اسود عنسی ــــــ کی تصدیق کا خیال پیدا ہوا ...

اور ہر ممکن طریقے سے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ جب ہمارے اور اصحابِ سابقہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط پہنچے تو ہمیں ایک دوسرے سے بڑی تقویت ملی اور ہر شخص اپنے منصوبے کے مطابق اس پر عمل کرنے کے لیے سرگرم ہوگیا۔

اپنی غیر متوقع اور زبردست کامیابیوں کی وجہ سے اسود عنسی کے اندر غرور تکبر نے گھر کرلیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار قیس بن عبد یغوث کے معاملے میں اپنا رویّہ بدل دیا اور اس کے ساتھ رعونت سے پیش آنے لگا، یہاں تک کہ جب قیس کو اس کی طرف سے اپنی جان کا شدید خطرہ لاحق ہوگیا تو میں اپنے چچازاد بھائی " داذویہ " کو ساتھ لے کر اس کے پاس گیا، اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچایا اور اس سے کہا کہ قبل اس کے کہ وہ ہمارے اوپر ہاتھ ڈالے ہمیں اس کا کام تمام کردینا چاہیئے۔ اس نے ہماری دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرلیا اور ہمارے سامنے اپنے دل کی باتیں ظاہر کرتے ہوئے ایسا محسوس کیا جیسے ہم تائید غیبی کی شکل میں اس کے اوپر آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔

پھر ہم تینوں نے آپس میں یہ طے کیا کہ ہم لوگ اس مرتد اور جھوٹے مدّعیٔ نبوت سے اندرونی طور پر نمٹیں گے اور ہمارے دوسرے بھائی باہر سے اس کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اپنا رول ادا کریں گے۔ اور ہمارے درمیان یہ بات بھی طے ہوئی کہ ہم اس معاملے میں اپنی چچازاد بہن " داذا " کا تعاون بھی حاصل کریں گے جس سے اسود عنسی نے ـــــ اس کے شوہر " شہر ابن باذان " کو قتل کرکے ـــــ شادی کرلی ہے۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے اسود عنسی کے محل میں جاکر اپنی چچازاد بہن سے ملاقات کی اور اس سے کہا:

"بہن! تم جانتی ہو کہ اس شخص نے ہمیں اور تم کو کیسی پریشانی اور تکلیف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس نے تمہارے خاوند کو قتل کیا، تمہاری قوم کی عورتوں کو رسوا اور بے عزت کیا، اس کے بہت سے افراد کو موت کے گھاٹ اُتارا اور ان کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط ہے جس میں آپؐ نے تمام اہلِ یمن اور خصوصیت کے ساتھ ہم لوگوں کو اس فتنے کی سرکوبی کا حکم دیا ہے، تو کیا تم اس میں ہمارے ساتھ تعاون کر سکتی ہو؟"

"میں کس چیز میں تمہارے ساتھ تعاون کروں؟" اس نے دریافت کیا۔

"اس کے نکالنے میں۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں، بلکہ اس کے قتل میں۔" اس نے جواب دیا۔

"خدا کی قسم، میرا مقصد بھی یہی تھا لیکن یہ بات تمہارے سامنے کہنے سے ڈر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"قسم اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے، میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے دین کی حقانیت اور اس کی صداقت کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی آدمی نہیں پیدا کیا ہے جو میرے نزدیک اس شیطان سے زیادہ قابلِ نفرت ہو۔ خدا کی قسم جب سے میں نے اس کو دیکھا ہے، اُس کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتی کہ یہ ایک فاجر اور بدکار شخص ہے جو نہ کسی حق کی رعایت کرتا ہے نہ کسی مُنکر کے ارتکاب سے باز رہتا ہے۔"

"ہمارے لیے اس کو قتل کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ نہایت محتاط ہے اور اپنی حفاظت کے لیے اس [illegible]

انتظام کر رکھا ہے۔ محل میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جس کو اس کے محافظوں نے اپنے گھیرے میں نہ لے رکھا ہو۔ البتہ اس دُور والے کمرے کی ـــــ جس میں کوئی نہیں رہتا ـــــ نگرانی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اُس کی پُشت پر ایک بیابان ہے۔ تم رات کی تاریکی میں اس کمرے میں نقب لگاؤ۔ اس میں تم کو اسلحہ اور چراغ ملے گا۔ وہیں تم مجھے بھی اپنے انتظار میں پاؤ گے۔ پھر اس کی خواب گاہ میں داخل ہو کر اسے قتل کر دینا۔" اس نے پوری اسکیم سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن ایسے محل کے کسی کمرے میں نقب لگانا سہل نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُدھر سے کسی آدمی کا گزر ہو اور وہ ہمیں دیکھ کر محافظوں کو آواز دیدے، پھر تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"تمہارا یہ اندیشہ غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سلسلے میں میری ایک رائے ہے۔" اُس نے کہا۔

"وہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کل تم اپنے کچھ قابلِ اعتماد آدمیوں کو کاریگروں اور مزدوروں کے بھیس میں میرے پاس بھیج دینا۔ میں ان سے کہہ کر اندرونی جانب سے کمرے میں نقب لگوا دوں گی، اس طرح نقب لگانے کا کام بہت تھوڑا سا بچ جائے گا جس کو تم لوگ باہر سے معمولی کوشش کر کے مکمل کر لوگے۔" اُس نے رائے دی۔

"تمہاری یہ رائے بہت مناسب اور معقول ہے۔" میں نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد میں نے واپس جا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو وہ ساری باتیں بتائیں جو میرے اور اس کے درمیان طے ہوئی تھیں۔ انھوں نے ان باتوں کو پسند کیا اور کامیابی کی دعا کی اور ہم اسی وقت اس کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ہم نے اپنے

معاونین میں سے خاص خاص مسلمانوں کو "کوڈ لفظ" بتایا اور ان کو تیار رہنے کی تاکید کی اور ہم نے اس کے لیے صبح کا وقت طے کیا۔

جب رات کی سیاہ چادر پورے ماحول پر پھیل گئی تو وقت مقرر پر میں اپنے دونوں ساتھیوں سمیت نقب کی جگہ پر پہنچ گیا۔ ہم اس کو کھود کر کمرے میں داخل ہو گئے اور چراغ روشن کر کے ہتھیار سنبھالا اور اس دشمن خدا کے خاص کمرے کی جانب چل پڑے۔ میری چچازاد پہلے ہی سے اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بے دھڑک اس میں داخل ہو گیا۔ وہ گہری نیند میں خرّاٹے لے رہا تھا۔ میں نے تلوار کی دھار اس کی گردن پر رکھ کر زور لگایا۔ پہلے تو وہ بیل کی طرح ڈکرایا پھر ذبح کیے ہوئے اونٹ کی طرح تڑپا۔ محافظوں نے اس کی آواز سنی تو یہ کہتے ہوئے اس کی خواب کی طرف دوڑے۔

"یہ کیسی آواز ہے؟"

"کچھ نہیں، اللہ کے نبی پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ تم لوگ اپنی جگہوں پر واپس جاؤ۔" میری عمزاد نے ان کو واپس بھیجتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہم لوگ محل کے اندر ہی رہے۔ جب صبح طلوع ہوئی تو میں نے ایک فصیل پر چڑھ کر اذان دینا شروع کی۔

"اَللّٰہُ اَکبَر... اَللّٰہُ اَکبَر... اَشْہَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ .... اَشْہَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰہ ... وَاَشْہَدُ اَنَّ الْاَسْوَدَ الْعَنْسِیَّ کَذَّابٌ — یہی "کوڈ لفظ" تھا۔

اس کو سنتے ہی مسلمان ہر طرف سے محل کی طرف بڑھے اور محافظ اذان کی آواز سن کر اس کی طرف لپکے اور دونوں فریق آپس میں بھڑ گئے۔ پھر میں نے اسود کا سر فصیل سے نیچے پھینک دیا جس کو دیکھ کر اس کے حامی کمزور پڑ گئے، ان کی ہمتیں ٹوٹ گئیں اور مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ دشمنوں پر ایک

زور دار حملہ کر دیا۔ اور طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی سارا معاملہ نمٹ گیا۔
دن ہوا تو ہم نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس دشمن خُدا کے قتل کی خوش خبری پر مشتمل ایک خط بھیجا۔ جب قاصد یہ بشارت لے کر مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج رات کو آپؐ کی وفات ہو گئی ہے۔ ساتھ ہی ان کو یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وحی کے ذریعہ آپؐ کو اسود عنسی کے قتل کی بشارت اسی رات مل گئی تھی جس میں وہ قتل کیا گیا تھا۔ آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا۔

"اسود عنسی کو گزشتہ رات قتل کر دیا گیا۔ اس کو ایک مبارک گھرانے کے مبارک شخص نے قتل کیا ہے۔"

جب آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسُولؐ! وہ کون شخص ہے تو آپؐ نے فرمایا تھا

"فیروز، فیروز کامیاب ہو گئے۔"

حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ

حضرت ثابت بن قیس انصاری رضؓ قبیلۂ خزرج کے نمایاں سردار اور یثرب کے معدودے چند زُعماء میں سے تھے۔ وہ نہایت ذہین، حاضر جواب، خوش بیان اور بلند آواز شخص تھے۔ جب بولتے تو محفل پر چھا جاتے اور جب تقریر کرتے تو سامعین کو مسحور کر لیتے۔ وہ یثرب کے ان افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ انھوں نے جیسے ہی نوجوان مکی داعیٔ اسلام حضرت مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو اپنی پُرسوز و دلکش آواز اور بلند و دِلگداز لہجے میں قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے سُنا، اس نے اپنی حلاوتِ تاثیر سے ان کی سماعت کو اسیر کر لیا، اپنے حُسنِ بیان سے ان کے دل کو اپنے قابو میں کر لیا اور اپنی ہدایت و تشریع سے ان کی عقل کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان کے لیے کھول دیا اور پیغمبر اسلام کی جماعت میں شمولیت اختیار کر لینے کی وجہ سے ان کے ذکر کو بلند کر دیا۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلے کے شہسواروں پر مشتمل ایک جماعت کے ساتھ آپؐ کا شاندار استقبال اور آپؐ کا اور آپؐ کے رفیقِ سفر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور آپؐ کے سامنے ایک

موثر تقریر کی جس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ، اور اس کے نبیؐ پر درود وسلام سے اور اس کا اختتام ان الفاظ پر کیا۔

"اے اللہ کے رسولؐ ! ہم آپ سے اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ ہم ہر اُس چیز سے آپ کی حفاظت کریں گے جس سے اپنی ، اپنی اولاد کی اور اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا چیز ملے گی ؟"

جواب میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جنّت "

جنّت کا لفظ جیسے ہی لوگوں کے پردۂ سماعت سے ٹکرایا ، ان کے چہرے فرطِ مسرت سے جگمگا اُٹھے اور ان کی پیشانیاں خوشی سے دمکنے لگیں اور سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

رضینا یا رسُول اللہ ۔۔۔۔ رضینا یا رسُول اللہ ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔ اور اس روز سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو اپنا خطیب بنا لیا جیسا کہ حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ آپ کے شاعر تھے۔ جب بھی عرب قبائل کے وفود اپنے فصیح البیان خطبا اور قادر الکلام شعراء کو لے کر مُفاخرہ یا مناظرہ کرنے کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے ، آپؐ ان کے خطیبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت ثابت بن قیسؓ کو اور ان کے شاعروں کا جواب دینے کے لیے حضرت حسان بن ثابتؓ کو طلب فرماتے تھے۔

حضرت ثابت بن قیسؓ پکے مومن ، سچے متقی ، اپنے رب سے ڈرنے والے اور ہر اُس چیز سے سختی کے ساتھ اجتناب کرنے والے تھے جو اللہ تعالیٰ کو غضبناک کر دے ۔ ایک دن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ بہت زیادہ خوفزدہ اور غمگین ہیں اور خوف و خشیت کے مارے کانپ رہے ہیں تو اُن سے پوچھا۔

"ابو محمد ! تمہیں کیا ہوا ہے ؟"

"اے اللہ کے رسُول! ڈرتا ہوں، کہیں میں ہلاک نہ ہو جاؤں" انھوں نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" آپؐ نے دوبارہ سوال کیا۔

"اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم لوگوں کو ناکردہ اعمال پر تعریف کی خواہش کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اپنی تعریف اچھی لگتی ہے۔ اسی طرح اس نے خود پسندی سے بھی روکا ہے اور میرا حال یہ ہے کہ میں خود کو پسند کرتا ہوں" انھوں نے جواب دیا۔

اس کے بعد آپؐ بڑی دیر تک ان کو تسلی دیتے رہے۔ پھر آخر میں ارشاد فرمایا۔

"یا ثابت! اَلَا تَرْضٰی اَنْ تَعِیْشَ حَمِیْدًا وَتُقْتَلَ شَھِیْدًا وَتَدْخُلَ الْجَنَّةَ۔

ثابت! کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم ایک قابلِ تعریف زندگی گزارو، شہید کی موت مرو اور جنّت میں داخل ہو جاؤ۔"

یہ مژدۂ جانفزا سُن کر حضرت ثابتؓ کا چہرہ خوشی سے جگمگا اُٹھا اور وہ بے ساختہ بول اُٹھے۔

"بَلٰی یَارَسُوْلَ اللہ.... بَلٰی یَارَسُوْلَ اللہ.. کیوں نہیں اے اللہ کے رسُول..... کیوں نہیں۔"

آپؐ نے فرمایا، "یہ چیزیں تمہیں حاصل ہوں گی۔"

اور جب اللہ تعالیٰ کا قول،

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی آواز کو نبیؐ کی آواز سے بلند نہ کرو، اور نہ نبیؐ کے سامنے اُونچی آواز سے بات کرو جس طرح

لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ٥ — تم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کیا کرایا سب غارت ہو جائے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔" (حجرات: ۲)

نازل ہوا تو حضرت ثابت بن قیسؓ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شدید محبت اور گہرے تعلق کے باوجود — آپ کی مجالس سے کنارہ کش ہو کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو گئے، یہاں تک کہ فرض نمازوں کی ادائیگی کے سوا دوسری کسی ضرورت سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے متعلق دریافت کرتے ہوئے فرمایا،

"ان کا حال مجھ کو کون بتا سکتا ہے؟"

تو ایک انصاری نے کہا، "اے اللہ کے رسول! ان کی خبر میں آپ کو دے سکتا ہوں۔"

اور جب وہ ان کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے گھر میں سرنگوں رنج و غم سے گھل رہے ہیں۔ اور جب ان سے پوچھا کہ ابو محمد! آپ کا کیا حال ہے تو انھوں نے جواب دیا۔

"بہت بُرا"۔ اور جب اس کا سبب دریافت کیا تو بولے۔

"تم جانتے ہو کہ میری آواز اونچی ہے جو اکثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند ہو جاتی ہے۔ اور اس کے متعلق قرآن میں جو کچھ نازل ہو چکا ہے وہ بھی تمہارے علم میں ہے۔ میں تو اپنے بارے میں یہی سمجھتا ہوں کہ میرے سارے اعمال رائگاں ہو گئے اور میں اہلِ دوزخ میں سے ہوں۔"

انصاری صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس آ کر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، سب آپؐ کے گوش گزار کر دیا تو آپؐ نے ان سے فرمایا،

"جاکران سے کہہ دو کہ تم اہلِ جہنم میں سے نہیں بلکہ اہلِ جنّت میں سے ہو"۔ یہ
ن کے لیے ایک غیر معمولی بشارت تھی جس کی اُمید وہ زندگی بھر کرتے رہے۔
حضرت ثابت بن قیسؓ غزوہ بدر کے سوا تمام غزوات میں رسُول اللہ صلی
للہ علیہ وسلم کے ہمرکاب رہے۔ اور اس شہادت کی طلب میں ــــ جس کی بشارت
ی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی ــــ جنگ کے خطرناک ترین معرکو ں
یں گھستے رہے مگر ہر بار وہ ان کے بالکل قریب سے ہوکر گزر جاتی اور وہ اسے
حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت
یں مسلمانوں اور مُسیلمہ کذّاب کے درمیان مرتدین کے خلاف جنگوں کا سلسلہ
شروع ہوگیا۔ اس وقت حضرت ثابت بن قیسؓ انصار کے علمبردار، حضرت سالم
مولیٰ ابی حُذیفہؓ مہاجرین کے سردار اور حضرت خالد بن ولیدؓ پوری فوج کے سپہ
سالار تھے جس میں انصار و مہاجرین اور عرب بادیہ نشین سب شامل تھے۔
جنگ کے پہلے مرحلے کے بیشتر معرکوں میں قوت و غلبہ کا توازن لشکرِ
مجاہدین کے مقابلے میں مُسیلمہ اور اس کے لشکر کی طرف تھا یہاں تک کہ وہ
حضرت خالد بن ولیدؓ کے خیمے میں داخل ہو گئے اور ان کی بیوی ام تمیم کو قتل
کر دینا چاہا۔ انھوں نے خیمے کی طنابیں کاٹ ڈالیں اور اس کو بُری طرح پھاڑ
ڈالا۔ حضرت ثابتؓ نے اس روز مسلمانوں کی کمزوری اور ان کے انتشار و
پراگندگی کے جو مناظر دیکھے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع اور الزام تراشی کی
جو باتیں سُنیں، انھوں نے ان کے دل کو رنج و الم اور ان کے دل کو غم واندوہ
سے بھر دیا۔ اس وقت شہروں کے رہنے والے، بادیہ نشینوں پر بزدلی کا
الزام لگا رہے تھے اور صحرا نشین شہریوں کو طعنہ دے رہے تھے کہ یہ ٹھیک
سے نہیں لڑ رہے ہیں۔ اور انھیں کیا معلوم کہ جنگ کیسے لڑی جاتی ہے۔ اس

وقت حضرت ثابتؓ نے کفن سر سے باندھا اور مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہو کر ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"مسلمانو! ہم رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اس طرح نہیں لڑا کرتے تھے۔ کتنی بُری ہے یہ حرکت کہ تم نے دشمن کو اپنے اوپر جرأت کا موقع فراہم کیا اور کیسی ناپسندیدہ ہے یہ بات کہ تم نے ان کے سامنے کم ہمتی اور پست حوصلگی کا ثبوت دیا۔" پھر اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"خدایا! مُسیلمہ اور اس کے متبعین نے جس شرک کا ارتکاب کیا ہے اور مسلمانوں نے جس کمزوری کا اظہار کیا ہے میں اس سے تیری جناب میں اپنی برأت اور لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔" پھر حضرت برار بن مالک انصاری، حضرت عمر کے بھائی حضرت زید بن خطاب اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہم جیسے مبارک و فرخندہ فال صحابہ کرام کے شانہ بشانہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے اور شجاعت و مردانگی کی ایسی مثال قائم کردی جس نے مسلمانوں کے دلوں کو غیرت وحمیت اور دشمن کے سینوں کو خوف ورعب سے بھر دیا۔ وہ برابر لڑتے اور ہر ہتھیار سے مقابلہ کرتے رہے تا آنکہ زخموں سے چوُر ہوکر میدان جنگ میں گر پڑے اور اس شہادت سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں جس کی بشارت ان کے محبوب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی اور اس فتح سے ان کا دل خوش ہوگیا جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے ذریعے عطا فرمائی۔

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے جسم پر ایک قیمتی زرہ تھی۔ ایک مسلمان اُدھر سے گزرا تو اس نے وہ زرہ ان کے جسم سے اُتار کر اپنے پاس رکھ لی۔ ان کی شہادت کی اگلی رات کو ایک مسلمان نے ان کو خواب میں دیکھا، انھوں نے

اس سے کہا۔

"میں ثابت بن قیس ہوں۔ تم مجھے پہچانتے ہو؟"

اس نے کہا۔ "ہاں" تو انھوں نے کہا۔

"میں تم کو ایک وصیت کر رہا ہوں۔ خبردار اس کو ایک خواب کی بات کہہ کر ٹال نہ دینا۔ کل جب میں قتل کر دیا گیا تو اس حلیے کے ایک مسلمان کا گزر میری طرف سے ہوا۔ اس نے میری زرہ اُتار لی اور اسے اپنے خیمے میں —— جو کیمپ کی فلاں سمت میں واقع ہے —— لے گیا اور اس کو ایک ہانڈی کے نیچے رکھ کر اس کے اُوپر سے کجاوہ رکھ دیا۔ تم خالد بن ولیدؓ کے پاس جاکر ان سے کہنا کہ وہ زرہ لینے کے لیے کسی آدمی کو اس کے پاس بھیج دیں۔ وہ زرہ ابھی تک اسی جگہ پر ہے۔ اور میں تم کو ایک دوسری وصیت بھی کر رہا ہوں۔ خبردار اس کو ایک سونے والے کا خواب سمجھ کر نظرانداز نہ کرنا۔ خالد سے کہنا کہ جب آپ مدینہ میں خلیفہ کے پاس پہنچیں تو ان سے کہیں کہ ثابت بن قیس کے ذمے یہ، یہ قرضے ہیں۔ اور ان کے فلاں، فلاں غلام آزاد ہیں۔ وہ میرے قرضے ادا کر دیں اور میرے غلاموں کو آزاد کر دیں۔"

جب وہ آدمی نیند سے بیدار ہوا تو اس نے حضرت ولیدؓ کے پاس جاکر جو کچھ سنا اور دیکھا تھا سب ان کے سامنے بیان کیا تو انھوں نے ایک آدمی کو زرہ لینے کے لیے بھیجا اور وہ اس کو اسی جگہ ملی جس کی نشاندہی انھوں نے کی تھی۔ چنانچہ اسے لاکر ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اور جب حضرت خالد مدینہ واپس آئے تو انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے حضرت ثابتؓ کی بات بتائی اور ان کی وصیت بیان کی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کی وصیت کو نافذ کر دیا۔

حضرت ثابت بن قیسؓ کے سوا کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کے مرنے کے بعد کی کوئی وصیت نافذ کی گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ حضرت ثابت بن قیس سے راضی ہو اور ان کو راضی کرے۔ اور اعلیٰ علیین میں ان کا ٹھکانہ بنائے

حضرت اسمار بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما

ہماری اس صحابیہ نے مجد و شرف کو ہر طرف سے سمیٹ رکھا تھا۔ ان کے والد، ان کے دادا، ان کی بہن، ان کے خاوند اور ان کے صاحبزادے، ان سب لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یابی کا شرف حاصل تھا۔ ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رض جو زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گہرے دوست اور وفات کے بعد آپ کے خلیفہ ہوئے۔ ان کے دادا حضرت ابوبکر کے والد ابو عتیق تھے۔ ان کی بہن ام المومنین حضرت عائشہ رض طاہرہ جن کی برأت میں قرآن نازل ہوا۔ ان کے خاوند حواریِ رسول حضرت زبیر بن عوام اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم تھے۔ مختصراً اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ حضرت اسمار بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا ہیں۔

حضرت اسمار رضی اللہ عنہا سابقینِ اسلام میں سے تھیں۔ سترہ مردوں اور اور عورتوں کے سوا اس فضلِ عظیم میں کسی دوسرے انسان کو ان کے اوپر سبقت نہیں حاصل تھی۔ ان کا لقب "ذات النطاقین" تھا۔ ان کا یہ لقب اس وجہ سے پڑا تھا کہ انھوں نے ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے والد کے لیے زادِ سفر اور پانی کے مشکیزہ کا انتظام کیا اور جب ان دونو چیزوں کو باندھنے کے لیے کوئی چیز نہیں ملی تو انھوں نے اپنے کمربند کے دو

ٹکڑے کر کے ایک ٹکڑے سے توشہ دان اور دوسرے سے مشکیزے کا منہ باندھ دیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دُعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس کے عوض ان کو جنّت میں دو کمر بند عطا فرمائے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب "ذات النطاقین" پڑگیا۔

ان کی شادی حضرت زبیرؓ بن عوّام سے ہوئی تھی جو ایک مفلس نوجوان تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی خادم تھا جو ان کی خدمت کرتا نہ ایک گھوڑے کے علاوہ کوئی مال تھا جسے وہ اپنے اہل وعیال پر فراوانی کے ساتھ خرچ کرتے۔ ایسی صورت میں حضرت اسماءؓ ان کے لیے ایک بہترین رفیقۂ حیات ثابت ہوئیں۔ وہ ان کی خدمت بھی کرتیں اور ان کے گھوڑے کی دیکھ بھال اور اس کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے چارے کے لیے کھجور کی گٹھلیاں بھی پیستی تھیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زبیرؓ کو کشادگی اور فراخی سے نواز دیا اور ان کا شمار مالدار ترین صحابۂ کرام میں ہونے لگا۔

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے اندر عمدہ خصائل، شریفانہ عادات واطوار اور غیر معمولی عقل وخرد کے ساتھ ساتھ حلم وبُردباری کی جو بہترین خوبیاں یکجا تھیں وہ شاذونادر ہی کسی مرد میں بھی اکٹھا پائی جاتی ہیں۔ ان کی سخاوت ودریا دلی ضرب المثل تھی۔ ان کے صاحب زادے عبداللہ بن زبیرؓ کا بیان ہے:

"میں نے کبھی کسی دو عورتوں کو نہیں دیکھا جو میری خالہ عائشہؓ اور میری والدہ اسماءؓ سے زیادہ فیاض ہوں۔ البتہ دونوں کی فیاضی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ میری خالہ کا حال یہ تھا کہ وہ چیزوں کو جمع کرتی رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس کافی چیزیں ہوجاتیں تو وہ انھیں ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ لیکن میری والدہ کوئی چیز اگلے روز کے لیے بچا کر

نہیں رکھتی تھیں۔"

اِس کے علاوہ حضرت اسمارؓ بڑی عقل مند اور دُور اندیش خاتون تھیں اور مشکل حالات میں نہایت دانشمندانہ رویّہ اختیار کرتی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر پہ روانہ ہوئے تو اپنا سارا مال ــــ جس کی مقدار چھ ہزار درہم تھی ــــ اپنے ساتھ لیتے گئے اور اہل وعیال کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ جب ان کے والد ابو قحافہ کو ــــ جو اس وقت تک ابھی مشرک تھے ــــ ان کی روانگی کی خبر ہوئی تو انھوں نے گھر آکر حضرت اسمار سے کہا۔

"خدا کی قسم، میرا خیال ہے ابوبکر نہ صرف یہ کہ تم لوگوں کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے ہیں بلکہ اپنے ساتھ اپنا مال بھی لیتے گئے ہیں۔ اس طرح تم لوگوں کو مالی پریشانی میں مبتلا کر گئے ہیں۔"

لیکن حضرت اسمارضؓ نے ان کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں دادا جان! ایسی بات نہیں ہے وہ ہمارے لیے کافی مال چھوڑ گئے ہیں۔" پھر انھوں نے بہت سی کنکریاں جمع کیں اور انھیں دیوار میں بنے ہوئے ایک طاق میں رکھا ــــ جس میں وہ مال رکھتے تھے ــــ اور ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال کر اپنے دادا کا ــــ جو نابینا تھے ــــ ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"دادا جان! دیکھئے وہ ہمارے لیے کتنا زیادہ مال چھوڑ گئے ہیں۔" اور انھوں نے ان کے اُوپر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تب کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر وہ یہ سارا مال تم لوگوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں تو بہت اچھا کیا ہے۔"

دراصل وہ اس طرح بڑے میاں کے دل کو تسکین دینا چاہتی تھیں۔ نیز

وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ان کے اُوپر اپنا مال خرچ کریں کیونکہ ان کو کسی مشرک کا احسان گوارا نہیں تھا خواہ وہ اُن کا دادا ہی کیوں نہ ہو۔

تاریخ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کے سارے کارناموں کو بھلا سکتی ہے مگر اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے اپنی آخری ملاقات کے موقع پر انھوں نے جس دانشمندی اور بُردباری، دُوراندیشی و ہوشیاری اور قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کیا تھا، تاریخ کے لیے اس کو فراموش کر دینا ناممکن ہے۔

یزید بن معاویہ کے مرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی اور پورا حجاز، مصر، عراق، خُراسان اور شام کا بیشتر علاقہ ان کے ماتحت آگیا۔ اس کے فوراً ہی بعد بنواُمیہ نے حجّاج بن یوسف کی قیادت میں ایک لشکرِ جرّار ان کے مقابلے کے لیے روانہ کر دیا اور فریقین کے درمیان کئی زبردست معرکے برپا ہوئے۔ ان معرکہ آرائیوں میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے غیر معمولی شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کیا جو ان کے جیسے بہادر شہسواروں کے شایانِ شان تھا۔ لیکن دھیرے دھیرے ان کے بہت سے حامی ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہوتے گئے۔ آخر کار وہ اور ان کے تھوڑے سے باقی ماندہ ساتھی بیت اللہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔

حضرت عبداللہؓ بن زبیر نے اپنی شہادت سے صرف چند گھنٹے پہلے اپنی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ـــــ جو اس وقت کافی بوڑھی اور نابینا ہو چکی تھیں ـــــ حاضر ہو کر سلام کیا۔ حضرت اسماءؓ نے ان کے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

”عبداللہ! اس وقت جب کہ حجّاج کی قلعہ شکن توپوں کی شدید سنگ باری سے ـــــ جو وہ حرم میں پناہ گزیں تمہارے آدمیوں پر کر رہی ہیں ـــــ

مکّے کے درو دیوار لرز رہے ہیں، تم کس ضرورت سے آئے ہو؟"
"امّی! میں اس وقت آپ سے کچھ مشورہ لینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"
انھوں نے جواب دیا۔
"مجھ سے مشورہ لینے آئے ہو! کس معاملے میں؟" حضرت اسمارؓ نے تعجب سے پوچھا۔
"زیادہ تر لوگوں نے میری مدد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور وہ حجّاج کے خوف یا اس سے مادّی فوائد کے حصول کی اُمید پر میرا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے لڑکے اور گھر والے بھی مجھ سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اب میرے ساتھ صرف تھوڑے سے آدمی بچ گئے ہیں اور ان کا بھی حال یہ ہے کہ جب ان کی قوت برداشت جواب دے جائے گی تو وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹک سکیں گے۔ اور اُدھر بنو اُمیّہ کے قاصد برابر میرے سامنے یہ پیش کش کر رہے ہیں کہ اگر میں ہتھیار ڈال دوں اور عبدالملک بن مروان کی بیعت کروں تو وہ میرا ہر دنیاوی مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہیں۔" انھوں نے کہا۔
"عبداللہ! یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے اور تم خود اپنے بارے میں زیادہ بہتر جانتے ہو۔ اگر تمہیں اپنے موقف کی حقانیت اور صداقت کا یقین ہے اور تم حق کی طرف دعوت دے رہے ہو تو اپنے موقف پر ڈٹے رہو اور اپنے ان ساتھیوں کی طرح صبر و استقلال سے کام لو جنھوں نے تمہارے جھنڈے کے نیچے لڑتے ہوئے اپنی جانیں دے دی ہیں۔ اور اگر تم نے اس کے ذریعہ دنیا حاصل کرنا چاہا تھا تو تم ایک بہت بُرے آدمی ہو کہ خود کو بھی ہلاک کیا اور اپنے آدمیوں کو بھی۔" یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بلند ہو گئی تھی۔
"لیکن اس صورت میں میں آج لازماً قتل کر دیا جاؤں گا!" حضرت عبداللہؓ

نے کہا۔

"یہ تمہارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ تم اپنے آپ کو حجاج کے حوالے کردو اور بنو اُمیہ کے لڑکے تمہارے سر سے کھیلیں" حضرت اسمارضؓ نے فرمایا۔

"میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا بلکہ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ میرا مثلہ کردیں گے۔" حضرت عبداللہؓ نے کہا۔

"قتل ہو جانے کے بعد ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس سے آدمی خوف محسوس کرے۔ اس لیے کہ بکری جب ذبح کردی گئی تو کھال کھینچنے سے اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی" حضرت اسماءؓ نے فرمایا۔

یہ سُن کر حضرت عبداللہؓ کی پیشانی خوشی سے چمک اُٹھی اور انھوں نے کہا۔

"امّی! کتنی عظیم ہیں آپ اور کتنی عظیم ہے آپ کی سیرت میں اس وقت آپ کے پاس یہی باتیں سننے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ خدا کی قسم نہ میرے حوصلے پست ہوتے ہیں نہ میرے اندر کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ خدا شاہد ہے کہ میں جس کام کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہوں اس کا محرک دنیا اور اس کے عیش و آرام کی طلب نہیں ہے۔ بلکہ میرے پیش نظر اس بات پر اللہ کے لیے اپنے غم و غصہ کا اظہار ہے کہ اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرلیا گیا ہے۔ اور یہ لیجئے میں آپ کی پسندیدہ چیز کی طرف جارہا ہوں۔ جب میں قتل کر دیا جاؤں تو میرے اُوپر حزن و ملال کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے معاملے کو خدا کے سپرد کردیجئے گا۔"

"مجھے تمہارے اُوپر غم اس وقت ہوتا جب تم باطل کی راہ میں قتل کیے جاتے۔" حضرت اسماءؓ نے کہا۔

"امی! آپ مطمئن رہیں کہ آپ کے بیٹے نے نہ تو کبھی کسی منکر کے ارتکاب کا

قصد کیا، نہ کسی بدکاری سے ملوث ہوا، نہ خدا کے حکم سے تجاوز کیا، نہ کسی کو امان دے کر اس سے غداری کی، نہ کسی مسلمان یا ذمی پر دانستہ کوئی ظلم کیا اور نہ کوئی چیز اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے زیادہ قابلِ ترجیح رہی۔ یہ باتیں میں نے اپنی پاکیزگی اور طہارت کے اظہار کے طور پر نہیں کہی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ میں نے یہ باتیں صرف آپ کی تسکینِ قلب کے لیے کہی ہیں۔" حضرت عبداللہؓ نے کہا۔

"شکر ہے اس خدا کا جس نے تم کو اپنے اور میرے پسندیدہ راستے پر گامزن کیا ہے۔ میرے بچے! میرے قریب آجاؤ تاکہ میں تمہاری خوش بو سونگھ لوں اور تمہارے جسم کو چھولوں کیونکہ یہ تم سے آخری ملاقات ہے۔" حضرت اسماءؓ نے کہا۔

اور حضرت عبداللہؓ جھک کر ان کے ہاتھوں اور پیروں کو بے تحاشا چومنے لگے اور وہ اپنی ناک کو ان کے سر، چہرے اور گردن پر پھیر کر سونگھنے اور بوسہ دینے لگیں۔ اور انھوں نے اپنے ہاتھوں کو ان کے بدن پر پھیرتے ہوئے اچانک یہ کہتے ہوئے ان کو واپس کھینچ لیا۔

"عبداللہ! یہ کیا چیز ہے جو تم پہنے ہوئے ہو؟"

"یہ میری زرہ ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔

"بیٹے! یہ اس شخص کا لباس نہیں ہے جو شہادت کا طالب ہو۔" حضرت اسماءؓ نے کہا۔

"یہ تو میں نے صرف آپ کی تسکین خاطر اور اطمینانِ قلب کے لیے پہنا ہے۔" انھوں نے کہا۔

"اس کو اپنے جسم سے الگ کر دو۔ اس طرح تم کو تیزی سے حرکت کرنے میں سہولت ہوگی اور پوری قوت کے ساتھ دشمن پر حملہ کر سکو گے۔ اور اس کی جگہ لمبا

پائجامہ پہن لو تاکہ جب تم گرو تو تمہارے ستر کے کھلنے کا اندیشہ نہ رہے۔" حضرت اسمارضؓ نے کہا۔

اس کے بعد حضرت عبداللہؓ نے اپنی زرہ اُتار دی اور اپنے پائجامے کو کس کر باندھ لیا اور یہ کہتے ہوئے جنگ کے لیے حرم کی طرف روانہ ہو گئے۔

"امّی! میرے لیے دعا، میں کوتاہی نہ کیجئے گا" اور حضرت اسماءؓ نے دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اُٹھا دیا۔

"بارالٰہا! رات کی تاریکیوں میں جب لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں ـــــ اس کے طویل قیام، اس کی شدتِ گریہ وزاری اور اس کی سسکیوں پر رحم فرمانا۔"

"خدایا! مکّہ اور مدینہ کی گرم دوپہر میں روزہ رکھ کر اس کے بھوک پیاس کی سختی برداشت کرنے پر رحم کرنا۔"

"میرے رب! اس کے اپنے والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک پر رحم کرنا۔"

"میرے معبود! میں نے اس کو تیری مشیّت کے حوالے کر دیا اور اس کے متعلق تیرے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اس پر مجھ کو صابرین کا اجر عطا فرمانا۔"

اور اس روز کے سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اپنے رب کے جوارِ رحمت میں پہنچ چکے تھے۔ اور ان کی شہادت پر دس سے کچھ ہی زیادہ دن گزرے تھے کہ ان کی والدہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بھی ان سے جا ملیں۔ اس وقت اگرچہ ان کی عمر ایک سو سال تھی مگر اس پیرانہ سالی کے باوجود نہ تو ان کا کوئی دانت ٹوٹا تھا نہ کوئی داڑھ گری تھی نہ ان کی عقل میں کسی قسم کا فتور پیدا ہوا تھا۔

ـــــــ ❊ ـــــــ

حضرت طلحہ بن عبیداللہ تیمی رضی اللہ عنہ

طلحہ ابن عبیداللہ تیمی اپنے ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں ایک قریشی قافلے کے ساتھ شام جارہے تھے۔ جب وہ قافلہ بصریٰ پہنچا تو قریش کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار تاجر اس کے آباد بازار میں جاکر خرید و فروخت میں مشغول ہو گئے۔ اگرچہ طلحہ ایک کم سن نوجوان تھے اور ان لوگوں کی طرح مہارت اور تجربہ نہیں رکھتے تھے مگر اپنی غیر معمولی ذہانت اور بصیرت کے بل پر وہ بہ آسانی ان کا مقابلہ کرسکتے اور اچھے سودے طے کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتے تھے۔

اس بازار میں جو مختلف مقامات سے آئے ہوئے تاجروں سے ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ صبح و شام طلحہ ابن عبیداللہ کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران ان کے ساتھ ایک ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف ان کی زندگی کی تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اس نے پوری تاریخ کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا۔ ہم یہ بات طلحہ ابنِ عبیداللہ ہی پر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس تجسس آمیز داستان کو اپنے الفاظ میں بیان کریں۔

"اس اثناء میں کہ ہم بُصریٰ کے بازار میں تھے ہم نے ایک راہب کو یہ اعلان کرتے ہوئے سُنا۔

" اے گروہِ تجار! اس مجمع کے لوگوں سے پوچھو کہ کیا ان کے اندر اہلِ مکّہ

میں سے کوئی شخص موجود ہے ؟" اس وقت میں اس کے قریب ہی تھا۔ میں نے فوراً کہا۔

"ہاں، میں اہلِ مکہ میں سے ہوں" تو اس نے پوچھا۔

"کیا تمہارے یہاں احمد کا ظہور ہو چکا ہے ؟"

"کون احمد ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب۔" اس نے کہا۔ "یہی مہینہ ہے جس میں ان کا ظہور ہونا ہے۔ وہ آخری نبی ہیں۔ وہ تمہاری سرزمین، ارضِ حرم میں مبعوث ہوں گے اور وہاں سے اس علاقے کی طرف ہجرت کر جائیں گے جہاں کالے پتھر پائے جاتے ہیں، جہاں کھجوروں کے جھنڈ ہیں اور جہاں کی مٹی نمکین ہے جس سے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ نوجوان! دیکھنا ان پر ایمان لانے میں پیچھے نہ رہ جانا۔"

طلحہ کہتے ہیں کہ اس کی یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ میں تیزی سے اپنے اونٹوں کے پاس پہنچا، انھیں تیار کیا اور قافلے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر تیز رفتاری کے ساتھ مکے کی طرف چل پڑا۔ اور وہاں پہنچ کر اپنے گھر والوں سے پوچھا کہ کیا ہماری غیر موجودگی میں یہاں کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے ؟ تو انھوں نے بتایا کہ ہاں (محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک نیا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نبی ہوں۔ اور ابوقحافہ کے بیٹے (ابوبکرؓ) نے ان کی پیروی اختیار کر لی ہے۔"

طلحہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکرؓ کو پہلے سے جانتا تھا۔ وہ نہایت نرم مزاج، ہر دل عزیز اور رحم دل آدمی تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک خوش اخلاق اور راست باز تاجر تھے۔ ہم لوگ ان سے مانوس تھے اور ان کی صحبت میں

بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ کیونکہ وہ قریش کی تاریخ سے باخبر اور ان کے انساب کے ماہر تھے۔ میں نے ان کے پاس جاکر پوچھا۔

"کیا یہ بات صحیح ہے کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور آپ نے ان کی پیروی اختیار کر لی ہے؟"

اُنھوں نے کہا کہ ہاں اور مجھے ان کے حالات سُنا کر اپنے ساتھ ان کے دین میں داخل ہونے کی ترغیب دینے لگے۔ اور جب میں نے ان کو راہب کی بات سُنائی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے اور مجھ سے کہا کہ میرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چلو تاکہ یہ واقعہ جو تمہارے ساتھ پیش آیا ہے، ان کے سامنے بیان کرو، ان کی دعوت کو ان کی زبان سے سُنو اور اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ۔"

طلحہ کہتے ہیں کہ پھر میں ان کے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے میرے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، قرآن کا کچھ حصّہ پڑھ کر سُنایا اور آخرت کی بھلائی کی بشارت دی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیا۔ جب میں نے ان کو بُصریٰ کے راہب کا قصہ سُنایا تو نہایت خوش ہوئے۔ اور اس خوشی کے آثار ان کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ پھر میں نے ان کے سامنے کلمۂ شہادت کا اقرار کیا۔ اس طرح میں چوتھا شخص تھا جو ابو بکرؓ کے ہاتھ پر ایمان لایا۔"

اِس قریشی نوجوان کے قبولِ اسلام کی خبر سُن کر اس کے گھر اور خاندان کے لوگ سکتے میں پڑ گئے، جیسے ان کے اُوپر بجلی گر پڑی ہو۔ خصوصًا ان کی ماں کو اس واقعے سے زبردست صدمہ پہنچا اور وہ غم سے نڈھال ہو گئیں کیونکہ انھیں امید تھی کہ اپنے بلند اخلاق اور کریمانہ خصائل کی بنا پر ان کا بیٹا ایک دن اپنے

قبیلے کا سردار بنے گا۔ ان کے قبیلے والوں نے انھیں اپنے دین سے پھیرنے کی بہتیری کوششیں کیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے اور ایک مضبوط پہاڑ کی طرح اِسلام پر جمے رہے۔ جب وہ لوگ ان کو نرمی ومحبت کے ریشمی پھندے میں پھانسنے میں ناکام ہوگئے تو سختی اور تعذیب کے اسلحوں سے لیس ہوکر ان کے اُوپر ٹوٹ پڑے۔ مسعود بن خراش بیان کرتے ہیں۔

"ایک روز میں صفا مروہ کے درمیان سعی کر رہا تھا۔ اسی دوران میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک نوجوان کا پیچھا کر رہے ہیں جس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے، اسے دھکّے دے رہے تھے اور اس کے سر پر مار رہے تھے۔ اس نوجوان کے پیچھے ایک بوڑھی عورت تھی جو چیخ چیخ کر اسے گالیاں دے رہی تھی میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس نوجوان کا کیا ماجرا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ طلحہ ابن عبید اللہ ہے جس نے اپنے آبائی دین کو ترک کر کے بنی ہاشم کے لونڈے (محمدؐ) کی پیروی اختیار کرلی ہے۔ میں نے پوچھا، اور اس کے پیچھے یہ بڑھیا کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ اسی نوجوان کی ماں صَعبہ بنتِ حضرمی ہے۔"

پھر نوفل بن خویلد نے ـــــ جس کا لقب شیرِ قریش تھا ـــــ حضرت طلحہ ابن عبید اللہ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کو ایک رسّی میں باندھ کر مکے کے اوباشوں اور لُچّوں لفنگوں کے حوالے کردیا تاکہ وہ انھیں سخت ترین سزائیں دیں۔ اسی وجہ سے طلحہ ابن عبید اللہ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما کو "قَرِینَین" کہا جاتا ہے۔

زمانے کی گردش جاری رہی، یکے بعد دیگرے نئے نئے حادثات و واقعات رُونما ہوتے رہے اور مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ حضرت طلحہ ابن عبید اللہؓ

ایمان کے تکمیلی مراحل طے کرتے رہے، خدا اور اس کے رسولؐ کی راہ میں ان کی آزمائشوں کا سلسلہ دراز ہوتا رہا اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے احسان اور حسنِ سلوک کا دائرہ بڑھتا اور وسعت اختیار کرتا رہا یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان کو "زندہ شہید" کا لقب دے دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "طلحۂ خیر"، "طلحۂ جُود"، اور "طلحۂ فیاض" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ ان القاب میں سے ہر لقب کا ایک پسِ منظر ہے جو ایک دوسرے سے بڑھ کر دلکشی و خوشنمائی کا حامل ہے۔

ان کے "زندہ شہید" کے لقب سے ملقب ہونے کا پسِ منظر یہ ہے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر منتشر ہو گئے اور آپؐ کے ساتھ دس انصاریوں اور مہاجرین میں سے حضرت طلحہ ابن عبیداللہ کے سوا کوئی نہیں رہ گیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے تو مشرکین کی ایک ٹولی وہاں آپہنچی جو آپؐ کو قتل کرنا چاہتی تھی تو آپؐ نے فرمایا۔

"کون ہے جو ان لوگوں کو ہم سے دُور بھگائے۔ وہ جنّت میں میرا رفیق ہوگا۔"

تو حضرت طلحہؓ نے کہا۔ "اے اللہ کے رسولؐ! میں۔" لیکن آپؐ نے فرمایا۔

"نہیں، تم اپنی جگہ پر رہو۔" تب ایک انصاری نے کہا۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میں۔"

"ہاں، تم۔" آپؐ نے فرمایا۔

وہ انصاری آگے بڑھ کر مشرکین سے لڑتے رہے یہاں تک کہ وہ شہید

ہو گئے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دَوران کچھ اور اُوپر چڑھ گئے۔ مگر مشرکین نے جلد ہی آپؐ کو آلیا۔ آپؐ نے پھر کہا۔

"کیا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی نہیں ہے؟"

"میں ہوں، اے اللہ کے رسولؐ!" حضرت طلحہؓ نے پھر پہل کی۔

"نہیں، تم اپنی جگہ پر رہو۔" آپؐ نے ان کو روک دیا۔

تب دوسرے انصاری آگے بڑھے اور بولے۔

"اے اللہ کے رسولؐ! میں حاضر ہوں؟"

"ہاں، تم ان کا مقابلہ کرو۔" آپؐ نے ان کو اجازت دی۔ اور وہ دشمنوں سے قتال کرتے رہے تاآں کہ انھوں نے بھی جامِ شہادت نوش فرمالیا۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مقابلے کے لیے اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے رہے اور حضرت طلحہؓ آپ کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو منع کر کے کسی انصاری کو اس کی اجازت دیتے رہے یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے وہ سب انصاری شہید ہو گئے اور آپؐ کے ساتھ حضرت طلحہؓ کے سوا کوئی نہیں رہ گیا۔ جب دشمن پھر آپؐ کے قریب پہنچ گئے تو آپؐ نے حضرت طلحہؓ سے فرمایا۔

"اب تمہاری باری ہے۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے تھے، پیشانی اور ہونٹ زخمی ہو گئے تھے، چہرۂ مبارک سے خون جاری تھا اور آپؐ زخموں سے نڈھال ہو گئے تھے۔ اس موقع پر حضرت طلحہؓ مشرکین پر حملہ کر کے ان کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دُور دھکیل دیتے، پھر واپس آکر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دے کر تھوڑا اوپر چڑھاتے اور زمین پر بیٹھا کر مشرکین پر دوبارہ حملہ کرتے

تھے۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ان کو مکمل طور پر پسپا کر دیا۔

حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ اس وقت میں اور ابوعبیدہ ابن جراح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دور تھے۔ جب ہم آپؐ کی مدد کے ارادے سے آپؐ کے قریب پہنچے تو آپؐ نے فرمایا۔

"مجھے چھوڑ دو اور اپنے ساتھی (طلحہؓ) کی مدد کو پہنچو۔"

جب ہم ان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کے جسم سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے اور ان کے بدن پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے ستر سے زیادہ زخم ہیں، ان کی ہتھیلی کٹ گئی ہے اور وہ ایک گڑھے میں بیہوش پڑے ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے۔

"مَنْ سَرَّهٗ اَنْ یَّنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ یَمْشِیْ عَلَی الْاَرْضِ قَدْ قَضٰی نَحْبَہٗ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی طَلْحَۃَ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ۔

" جو کسی ایسے شخص کو زمین پر چلتا پھرتا دیکھنا چاہتا ہو جو اپنی نذر (موت) پوری کر چکا ہو وہ طلحہ ابن عبیداللہ کو دیکھ لے۔"

اور حضرت ابوبکرؓ جب غزوۂ احد کا ذکر کرتے تو فرماتے،

"ذَالِكَ یَوْمٌ کُلُّہٗ لِطَلْحَۃَ — وہ پورے کا پورا طلحہ کا دن تھا۔"

یہ تھا وہ قصہ جس کی وجہ سے حضرت طلحہ ابن عبیداللہؓ کا لقب "زندہ شہید" پڑا۔ رہی ان کے "طلحۂ خیر" اور "طلحۂ جود" کے القاب کی بات تو اس کے سیکڑوں قصے ہیں۔ اور انھیں میں سے ایک یہ ہے۔

حضرت طلحہؓ بہت بڑے تاجر اور نہایت مالدار آدمی تھے۔ ایک روز ان کے پاس حضرموت سے ستر لاکھ درہم کی کثیر رقم آئی۔ وہ رات بھر غمگین اور پریشان رہے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر ان کی اہلیہ حضرت ام کلثوم بنت ابی بکرؓ نے کہا۔

"ابو محمد! آپ کو کیا ہوا ہے؟ شاید میری طرف سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے۔"

"نہیں، نہیں۔ تم تو ایک بہترین مسلمان بیوی ہو۔ میں رات بھر یہ سوچتا رہا کہ وہ شخص اپنے رب کے بارے میں کیا گمان رکھتا ہے جس کے گھر میں اتنی بڑی مقدار میں رقم پڑی ہو اور وہ بے فکر سو رہا ہو۔"

"تو اس میں فکر اور پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ اپنے محتاج اہل قبیلہ اور مفلس احباب کو کہاں بھولے ہوئے ہیں۔ صبح کو یہ ساری رقم ان کو بانٹ دیجئے۔" حضرت ام کلثوم رضؓ نے رائے دی۔

"اللہ تعالیٰ تمہارے اُوپر رحمت نازل فرمائے۔ واقعی تم صاحبِ توفیق اور صاحبِ توفیق کی بیٹی ہو۔" انھوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اور صبح کے وقت انھوں نے وہ ساری رقم تھیلیوں اور بڑے بڑے پیالوں میں رکھ کر فقراء مہاجرین و انصار میں تقسیم کرا دی۔

بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص حضرت طلحہ رضؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے مدد کا طالب ہوا۔ اور اپنی ایک رشتہ داری کا ذکر کیا جو دونوں کو باہم جوڑتی تھی۔ حضرت طلحہ رضؓ نے کہا کہ آج سے پہلے مجھ سے اس رشتے کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ بہرحال میرے پاس ایک زمین ہے جس کے لیے عثمان رضؓ ابن عفان مجھے تین لاکھ درہم دے رہے ہیں۔ اب اگر تم چاہو تو وہ زمین لے لو اور اگر چاہو تو اسے فروخت کر کے میں تم کو تین لاکھ کی نقد رقم دے دوں۔ تو اس آدمی نے کہا کہ میں اس کی قیمت ہی لوں گا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو وہ رقم دے دی۔

"طلحۂ خیر" اور "طلحۂ جود" کو یہ لقب مبارک ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرحمت فرمایا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو اور ان کی قبر کو منور کرے۔

حضرت ابوہُریرہ دوسی رضی اللہ عنہٗ

یقیناً آپ صحابۂ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم میں سے اِن کوکبِ درخشاں سے بخوبی واقف ہوں گے۔ کیا امتِ مسلمہ کا کوئی فرد ایسا بھی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نا واقف ہو؟ لوگ ان کو جاہلیت میں "عبدشمس" کے نام سے پکارتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی نعمت سے نوازا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات سے مشرف کیا تو آپؐ نے ان سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"عبدشمس" انھوں نے جواب دیا۔

"نہیں، بلکہ تمہارا نام عبدالرحمان ہے۔" حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔

"ہاں، عبدالرحمان۔ اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔" انھوں نے عرض کیا۔

رہی ان کی کنیت "ابوہریرہ"، تو اس کا سبب یہ ہے کہ بچپن میں ان کے پاس ایک بلی تھی جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے ہم جولیوں نے انھیں ابوہریرہ کہنا شروع کر دیا اور بعد میں یہ کنیت اتنی مشہور ہوئی کہ ان کے نام پر غالب آگئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلقات استوار ہوئے تو آپؐ بسا اوقات ان کو پیار سے "ابوہر" کہہ کر بلاتے۔ اسی لیے

وہ خود بھی "ابوہر" کو "ابوہریرہ" پر ترجیح دیتے اور کہتے کہ میرے محبوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اسی نام سے پکارتے تھے۔ "ہر" مذکر اور "ہریرہ" مونث ہے اور مذکر مونث سے اچھا ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ حضرت طفیلؓ بن عمر دوسی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور وہیں اپنے قبیلے میں مقیم رہے اور ۶ھ میں اپنے قبیلے بنی دوس کے ایک وفد کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور ہر چیز سے قطع تعلق کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اور صحبت کے لیے یکسو ہو گئے، مسجد نبوی کو جائے قیام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام بنا لیا۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے بیوی بچے نہیں تھے۔ صرف ان کی بوڑھی ماں تھیں جو اس وقت تک شرک پر مُصر تھیں جن کی محبت اور خیر خواہی کے پیش نظر وہ برابر ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہتے تھے مگر وہ ہمیشہ اس سے نفرت اور انکار کرتی رہتی تھیں۔ حضرت ابوہریرہؓ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے مگر ان کا دل غم سے کباب ہوتا رہتا۔ ایک روز انھوں نے اپنی ماں کو خدا اور رسول پر ایمان لانے کی دعوت دی تو اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسے نازیبا الفاظ استعمال کیے جن کو سُن کر حضرت ابوہریرہؓ کو سخت صدمہ پہنچا۔ وہ روتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے ان کو روتا دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے ابوہریرہ! کیوں رو رہے ہو؟"

"میں برابر اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیتا رہا۔ مگر وہ ہمیشہ انکار کرتی رہی۔ آج بھی جب میں نے اس کو دعوت دی تو اس نے مجھے سخت دل آزار بات سُنائی۔ اے اللہ کے رسولؐ! اللہ عزوجل سے دُعا فرمایئے کہ وہ ابوہریرہ کی ماں کو اسلام کی طرف مائل کر دے۔" انھوں نے روتے ہوئے کہا۔

اور رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک دُعا کے لیے بلند ہو گئے۔
حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ جب میں واپس گھر گیا تو دیکھا کہ دروازہ بھیڑا ہوا ہے۔ اور مجھے اندر سے پانی گرنے کی آواز سُنائی دی۔ جب میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو ماں نے کہا کہ ابوہریرہؓ ابھی وہیں کھڑے رہو۔ پھر جب انھوں نے کپڑے پہن لیے تو کہا کہ اب اندر آجاؤ۔ جب میں اندر گیا تو انھوں نے کہا۔

"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُـهٗ"

میں آنکھوں میں خوشی کے آنسو لیے پھر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے غم سے آنسو بہاتا ہوا گیا تھا۔ اور عرض کیا کہ اللہ کے رسُولؐ خوش ہو جائیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دُعا سُن لی اور ابوہریرہ کی ماں کو اِسلام کی ہدایت دیدی۔

حضرت ابوہریرہؓ کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایسی گہری محبت تھی جو ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ آپؐ کے دیدار سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے

"مَا رَاَيْتُ شَيْئًا اَمْلَحَ وَاَصْبَحَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى كَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِىْ فِىْ وَجْهِهٖ۔

"میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ دِلفریب اور خوبصورت کوئی چیز نہیں دیکھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے رُخِ تاباں میں سُورج گردش کر رہا ہے۔"

وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہتے تھے کہ اس نے ان کو اپنے دین کے اتباع کی توفیق عطا فرمائی۔ وہ کہتے تھے۔
"شکر ہے اس خدا کا جس نے ابوہریرہ کو اسلام کی ہدایت بخشی۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ابوہریرہؓ کو قرآن کا علم دیا اور شکر ہے اس خُدا کا جس نے

ابوہریرہ کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نوازا۔"

حضرت ابوہریرہؓ جس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبّت رکھتے تھے اسی طرح وہ علم کے بھی بڑے شیدائی تھے۔ انھوں نے اس کو اپنا روزمرہ کا معمول بلکہ اپنی زندگی کا منتہاءِ مقصُود بنا رکھا تھا۔ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔

"ایک روز میں، ابوہریرہؓ اور میرا ایک ساتھی، تینوں آدمی مسجدِ نبوی میں بیٹھے ذکر و دُعاء میں مصروف تھے۔ اسی دوران رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارک سے نمودار ہوئے اور آکر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ جب ہم خاموش ہوگئے تو آپؐ نے فرمایا۔

"اپنا سلسلہ جاری رکھو۔"

تب میں نے اور میرے ساتھی نے ابوہریرہ سے پہلے دعاء مانگی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری دُعاؤں پر آمین کہی۔ اس کے بعد ابوہریرہؓ نے دُعاء کی۔

"اے اللہ! میں تجھ سے وہ چیزیں بھی مانگتا ہوں جو میرے ان دونوں ساتھیوں نے مانگی ہیں اور میں تجھ سے نہ بھولنے والا علم مانگتا ہوں۔"

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دُعاء پر بھی آمین کہی۔ اس کے بعد ہم دونوں نے کہا کہ ہم بھی اللہ تعالیٰ سے نہ بھولنے والا علم مانگتے ہیں۔ تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"سَبَقَكُمْ بِهَا الْغُلَامُ الدَّوْسِيُّ۔" "یہ دوسی نوجوان تم لوگوں سے بازی لے گیا۔"

حضرت ابوہریرہؓ جس طرح علم کو اپنے لیے پسند کرتے تھے اسی طرح دُوسروں کے لیے بھی پسند کرتے تھے۔

ایک روز ان کا گزر مدینہ کے بازار میں ہوا۔ وہ لوگوں کی دنیاوی مصروفیت اور خرید وفروخت اور لین دین میں ان کے انہماک کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ انھوں نے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

"اے اہلِ مدینہ! تم لوگ کتنے عاجز اور ناکام ہو۔"

"ابو ہریرہؓ! آپ نے ہماری کون سی عاجزی اور ناکامی دیکھی ؟" لوگوں نے پوچھا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم ہو رہی ہے اور تم لوگ یہاں ہو۔ جا کر اپنا حصّہ لیتے کیوں نہیں ؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا۔

"ابو ہریرہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کہاں تقسیم ہو رہی ہے ؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"مسجد میں۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب دیا۔

یہ سُن کر لوگ تیزی سے مسجد کی طرف دوڑے اور حضرت ابو ہریرہؓ ان کے انتظار میں وہیں کھڑے رہے۔ جب ان لوگوں نے واپس آکر ان سے کہا کہ ہم لوگ مسجد میں گئے تھے مگر وہاں تو ہم نے کوئی چیز تقسیم ہوتے ہوئے نہیں دیکھی تو حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا۔

"کیا تم لوگوں نے مسجد میں کسی کو نہیں دیکھا ؟"

"کیوں نہیں، ہم نے وہاں دیکھا کہ کچھ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، کچھ تلاوتِ قرآن میں مصروف ہیں اور کچھ لوگ حلال و حرام کے متعلق بحث و مباحثہ کر رہے ہیں۔" ان لوگوں نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کا بھلا ہو، وہی تو ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث۔" حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔

اپنی غیر معمولی علمی مصروفیت و انہماک اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں کی پابندی کی وجہ سے بھوک، فاقہ کشی اور زندگی کی جو سختیاں حضرت ابوہریرہؓ نے جھیلیں، شاید ہی کسی دوسرے نے جھیلی ہوں - وہ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں۔

مجھے اتنی شدت کی بھوک لگتی تھی کہ بیتاب ہوکر میں اصحابِ رسولؐ میں سے کسی صاحب سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق پوچھتا تھا ـــــ حالانکہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوتا ـــــ تاکہ وہ مجھے اپنے گھر لے جاکر کچھ کھلائیں۔ ایک روز تو مجھے ایسی زور کی بھوک لگی کہ میں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیا۔ پھر میں صحابۂ کرام کے راستے پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے ادھر سے ابوبکر صدیقؓ کا گزر ہوا۔ میں نے کتاب اللہ کی ایک آیت کے متعلق ان سے دریافت کیا اور یہ سوال میں نے صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر بلائیں۔ مگر انھوں نے نہیں بلایا۔ پھر عمرؓ بن خطاب میری طرف سے گزرے۔ میں نے ان سے بھی ایک آیت کے بارے میں پوچھا۔ لیکن اُنھوں نے بھی مجھے کھانے کے لیے نہیں پوچھا۔ پھر وہ گزرگاہ رحمتِ مجسّمؐ کے نقوشِ پا سے منور ہوئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ میں بھوک سے بے حال ہوں۔ انھوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"ابوہریرہ ؟"

"لبیک یا رسُول اللہ"، میں نے کہا۔ اور پھر پیچھے پیچھے چلتا ہوا آپؐ کے ساتھ آپؐ کے گھر میں داخل ہوگیا۔ وہاں آپؐ نے ایک پیالے میں دُودھ دیکھ کر گھر والوں سے پوچھا۔

"یہ دُودھ تم لوگوں کو کہاں سے ملا ؟"

"یہ فلاں صاحب نے آپ کے واسطے بھیجا ہے"، اُنھوں نے فرمایا۔

تب انھوں نے مجھ سے فرمایا۔

"ابوہریرہ! جاؤ تمام اہل صفہ کو بلا لاؤ۔"

آپ کا مجھے ان سب لوگوں کو بلانے کے لیے بھیجنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اتنے سے دُودھ سے اہلِ صفہ کا کیا بنے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اس میں سے کچھ پی لوں تاکہ مجھے سہارا مل جائے پھر ان لوگوں کو بلانے جاؤں۔ بہرحال میں ان لوگوں کو بلا کر لے گیا۔ جب وہ سب لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گئے تو آپؐ نے فرمایا۔

"ابوہریرہ! یہ لو اور اسے سب لوگوں کو پلاؤ۔" میں وہ پیالہ باری باری ہر ایک کو دیتا گیا یہاں تک کہ سب نے آسُودہ ہو کر پی لیا۔ اب میں نے پیالہ اُن کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے سر مبارک اُٹھایا اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"اب میں اور تم، صرف دو آدمی بچ گئے ہیں۔"

"جی ہاں، اللہ کے رسولؐ! آپؐ نے سچ فرمایا۔" میں نے عرض کیا۔

آپؐ نے فرمایا "پیو" میں نے پیا۔

پھر فرمایا، "اور پیو" میں نے اور پی لیا۔ آپ برابر "اور پیو، اور پیو" کہتے رہے اور میں پیتا رہا۔ یہاں تک کہ میں پُورے طور پر شکم سیر ہوگیا اور عرض کیا۔

"قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔"

تب آپ نے پیالہ لے کر باقی بچے ہوئے دُودھ کو خود پیا۔"

اِس واقعے کو گزرے ابھی زیادہ مدّت نہیں ہوئی تھی کہ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں ہاتھ آنے والے غنائم کے سبب مسلمانوں میں مال و دولت کی فراوانی

ہوگئی اور حضرت ابوہریرہؓ کے پاس بھی مال و دولت، مکان واسباب اور بیوی بچے ہر چیز ہوگئی۔ مگر یہ ساری چیزیں مل کر بھی نہ توان کی فطرت اور طبیعت میں ذرہ برابر کوئی تغیر پیدا کرسکیں نہ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کو ان کے لوحِ دل سے محو کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ وہ اکثر یہ بات کہا کرتے تھے۔

"میں نے حالتِ یتیمی میں پرورش پائی اور مسکینی کی حالت میں ہجرت کی میں صرف پیٹ کی روٹی کے عوض بُسرہ بنتِ غزوان کے یہاں مزدوری کرتا تھا۔ میں حضر میں ان لوگوں کی خدمت کرتا اور سفر میں ان کے اُونٹوں کو ہانکتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی کے ساتھ میری شادی کرادی۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے دین کے ذریعے سارے حالات دُرست کردیئے اور ابوہریرہؓ کو والی بنادیا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ کی طرف سے کئی بار مدینۂ منورہ کے والی بنائے گئے۔ مگر گورنری کا یہ عہدہ بھی ان کی نرم مزاجی اور سادگی میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرسکا۔ ایک بار اپنی گورنری کے زمانے میں وہ اپنے گھر والوں کے لیے لکڑیوں کا ایک بوجھ پیٹھ پر لادے مدینہ کے راستوں سے گزر رہے تھے۔ جب ان کا گزر ثعلبہ ابن مالک کی طرف سے ہوا تو بولے:

"مالک کے بیٹے! گورنر کو جانے کے لیے راستہ دیدو"۔

"اللہ آپ پر رحم فرمائے، کیا اتنی ساری جگہ آپ کے گزرنے کے واسطے کافی نہیں ہے؟" ابن مالک نے کہا۔

تو انھوں نے کہا۔ "گورنر کے ساتھ اس گٹھر کے لیے بھی راستہ دو۔ جو اس کی پیٹھ پر لدا ہوا ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں وفورِ علم اور نرم مزاجی کے ساتھ تقویٰ اور پرہیزگاری کی وافر مقدار بھی جمع ہوگئی تھی۔ وہ دن کو روزہ

رکھتے اور تہائی رات تک عبادت اور ذکر الٰہی میں مصروف رہتے، پھر اپنی بیوی کو بیدار کر دیتے جو رات کا دوسرا تہائی حصہ عبادت میں گزارتیں پھر وہ اپنی بیٹی کو جگا دیتیں اور وہ رات کے آخری حصے میں قیام کرتیں۔ اس طرح ان کے گھر میں عبادت کا سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔

ان کے پاس ایک حبشن لونڈی تھی۔ ایک دفعہ اس سے کوئی ایسی نازیبا حرکت سرزد ہو گئی جس سے ان کو اور گھر والوں کو بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے اس کو مارنے کے لیے کوڑا اٹھایا۔ پھر رک گئے اور کوڑا رکھتے ہوئے لونڈی سے کہا "اگر قیامت کے دن قصاص کا ڈر نہ ہوتا تو جو اذیت تو نے ہمیں پہنچائی ہے، میں تجھے ضرور اس کی سزا دیتا لیکن میں تجھ کو ایک ایسی ہستی کے ہاتھ فروخت کر دوں گا جو تیری قیمت مجھے اس روز ادا کرے گی جب میں اس کا سب سے زیادہ ضرورت مند ہوں گا۔ جا تو اللہ کے لیے آزاد ہے۔"

ان کی صاحب زادی ان سے کہتی تھیں۔

"ابو جان! میری ہم جولی لڑکیاں مجھے طعنہ دیتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تیرے ابا تجھے سونے کے زیورات کیوں نہیں پہناتے؟" تو وہ جواب دیتے۔

"بیٹی! ان سے کہہ دینا کہ میرے والد میرے اوپر جہنم کی آگ سے ڈرتے ہیں۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کا اپنی بیٹی کو سونے کے زیورات نہ پہنانا کسی بخالت یا مالی طمع کی وجہ سے نہیں تھا کیونکہ وہ انفاق فی سبیل اللہ میں نہایت فیاض اور بڑے کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ ایک دفعہ مروان ابن حکم نے ان کے پاس ایک سو دینار بھجوائے اور دوسرے دن کہلا بھیجا کہ خادم نے غلطی سے وہ رقم آپ کو دیدی۔ حالانکہ میں نے آپ کے یہاں نہیں کسی دوسرے کے یہاں

بھجوائی تھی۔ اِس لیے وہ رقم واپس بھیج دیجیے۔ یہ سُن کر وہ سخت نادم ہوئے اور مروان کے یہاں کہلا بھیجا کہ "میں نے وہ ساری رقم خدا کی راہ میں خرچ کر دی۔ اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس باقی نہیں بچا ہے۔ جب بیت المال سے میرا وظیفہ برآمد ہو تو اس میں سے یہ رقم وضع کر لینا"۔ دراصل مروان نے ایسا صرف ان کو آزمانے کے لیے کیا تھا۔ مگر جب پتہ لگا تو اس کو صحیح پایا۔

حضرت ابوہریرہؓ زندگی بھر اپنی والدہ کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتے رہے۔ جب وہ گھر سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو سب سے پہلے ان کے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہتے۔

"امی جان! السّلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔"

"میرے بیٹے! وعلیک السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ"۔ وہ جواب دیتیں۔

پھر وہ کہتے، "اللہ آپ پر رحم فرمائے جیسا کہ آپ نے بچپن میں میری پرورش کی۔"

تو وہ جواب میں کہتیں۔ "اور اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر بھی رحم کرے جیسا کہ تم نے بڑھاپے میں میرے ساتھ حُسنِ سلوک کیا۔"

حضرت ابوہریرہؓ کو اس بات سے غیر معمولی دل چسپی تھی کہ وہ لوگوں کو اپنے والد کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلۂ رحمی کی دعوت دیں۔ ایک روز انھوں نے دو آدمیوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے سن رسیدہ تھا۔ انھوں نے چھوٹی عمر والے سے پوچھا۔

"یہ آدمی تمہارا کون ہے؟"

"یہ میرے والد ہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا "ان کا نام لے کر نہ بلانا، ان کے آگے نہ چلنا اور ان سے پہلے نہ بیٹھنا۔"

حضرت ابوہریرہؓ جب مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور ان کا آخری وقت آگیا تو رو پڑے۔ جب ان سے رونے کا سبب دریافت کیا گیا تو بولے۔

"میں تمہاری اس دنیا کے لیے نہیں رو رہا ہوں بلکہ دوریٔ منزل اور قلتِ زاد کی وجہ سے رو رہا ہوں۔ میں ایک ایسے راستے کے آخری سِرے پر کھڑا ہوں۔ جو مجھے جنّت یا دوزخ میں پہنچانے والا ہے۔ اور مجھے اس بات کا قطعی کوئی علم نہیں ہے کہ میں ان دونوں میں سے کس میں پہنچوں گا۔"

مروان بن حکم عیادت کے لیے آیا تو ان سے کہا۔

"ابوہریرہؓ! اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے۔" تو انھوں نے کہا۔

"خدایا! میں تیری ملاقات کو محبوب رکھتا ہوں، تو بھی میری ملاقات کو پسند فرما اور اس میں جلدی کر۔"

اور مروان کی واپسی سے پہلے ہی ان کی یہ دعا درِ قبولیت کو دستک دے چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر اپنی رحمت کا دامن وسیع کرے۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک ہزار[1] چھ سو نوے ۱۶۹۰ زیادہ حدیثیں یاد کیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین اجر عطا فرمائے۔

---

[1] اکثر محدثین ان کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ بیان کرتے ہیں۔ م

حضرت سلمہ بن قیس اشجعی رضی اللہ عنہٗ

حضرت فاروقِ اعظمؓ نے مدینۂ منورہ کے محلّوں میں گشت کرتے ہوئے وہ پُوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تاکہ لوگ امن و اطمینان کے ساتھ بھرپور نیند سوئیں۔ وہ مدینے کے مکانوں اور بازاروں کا چکّر لگاتے ہوئے اپنے ذہن میں اصحابِ رسولؐ میں سے ان عظیم بہادروں کو تلاش کر رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو اس فوج کی قیادت سونپ سکیں جو اہوازؔ[1] کی فتح کے لیے حرکت میں آنے والی تھی۔ پھر بے ساختہ بول اُٹھے۔

"میں اس کو پا گیا ...... ہاں ان شاء اللہ میں اسے پا گیا۔" اور صبح کو حضرت سلمہ ابن قیس اشجعی کو بلا کر ان سے کہا۔

"میں اہواز جانے والے لشکر کی قیادت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ خُدا کا نام لے کر روانہ ہو جاؤ اور اس کی راہ میں ان لوگوں سے قتال کرو۔ جو اس کے منکر ہیں۔ جب تمہارے دشمن مشرکین سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو سب سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ تمہاری دعوت قبول کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں اور جنگ میں تمہارا ساتھ دینے کے بجائے اپنے علاقوں میں

---

[1] ایران کا ایک علاقہ جو اس کے مغربی حصّے میں واقع ہے۔

رہنا پسند کریں تو ان کے اوپر زکوٰۃ کے علاوہ اور کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہے۔ البتہ مالِ غنیمت میں ان کا کوئی حصہ بھی نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ دشمن کے خلاف جنگوں میں تمہارا ساتھ دینا پسند کریں تو ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو تم کو حاصل ہیں اور ان کے اوپر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو تمہارے اوپر عائد ہیں۔ اور اگر وہ قبولِ اسلام سے انکار کر دیں تو ان کو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دینا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کرنا اور کوئی ایسی ذمہ داری ان کے اُوپر نہ ڈالنا جو ان کی استطاعت سے باہر ہو۔ لیکن اگر وہ جزیہ کی ادائیگی سے بھی انکار کر دیں تو ان سے جنگ کرنا۔ ایسی صورت میں خدائے تعالیٰ کی نصرت و تائید تمہاری پشتیبان ہوگی۔ اگر وہ کسی قلعہ میں پناہ گیر ہو کر خدا اور رسُول کے حکم کے مطابق تم سے صلح کی خواہش ظاہر کریں تو ان کا یہ مطالبہ ہرگز تسلیم نہ کرنا اس لیے کہ تم نہیں جانتے کہ اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسُول کا کیا حکم ہے۔ اور اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری پر صلح کا مطالبہ کریں تو ان کا یہ مطالبہ بھی رد کر دینا۔ البتہ تم اپنی ذمہ داری پر ان سے صلح کا معاہدہ کر سکتے ہو۔ اور جب جنگ میں تم کو فتح حاصل ہو جائے تو حد سے تجاوز نہ کرنا، نہ غداری کے مرتکب ہونا۔ لاشوں کا مثلہ نہ کرنا نہ کسی بچے کے خون سے اپنا ہاتھ رنگنا۔"

حضرت سلمہ ابن قیسؓ نے فاروقِ اعظم کی ان قیمتی ہدایات کو سن کر ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"سَمْعًا وَّطَاعَةً یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ!"

پھر حضرت عمرؓ نے زور سے ان کے ہاتھ کو دباتے ہوئے پوری گرم جوشی سے ان کو الوداع کہا اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ ان کی کامیابی کے لیے دعا فرمائی۔

کیونکہ انھیں اس مہم کی مشکلات اور اس کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا جو انھوں نے حضرت سلمہؓ اور ان کے لشکر کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اس لیے کہ اہواز ایک کوہستانی علاقہ تھا جس کے راستے نہایت دشوار گزار اور قلعے ناقابلِ تسخیر تھے، جو بصرہ اور ایران کی سرحد پر واقع تھا اور جس کے باشندے کُردوں سے بھی زیادہ سخت جان اور جفاکش واقع ہوئے تھے۔ اور مسلمانوں کے لیے دو اسباب سے اس علاقے کو فتح یا اس پر قبضہ کرنے کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک تو یہ کہ ایسی صورت میں ان کی پشت بصرہ کی جانب ایرانیوں کے حملوں سے محفوظ ہو جاتی اور دوسرا یہ کہ اہل فارس اسے اپنی فوجوں کی آماجگاہ بنا کر عراق کے امن اور اس کی سلامتی کے لیے کوئی خطرہ نہیں پیدا کر سکتے تھے۔

غازیانِ فی سبیل اللہ کا یہ لشکر اپنے قائد حضرت سلمہؓ ابن قیس کی سرکردگی میں مدینہ سے روانہ ہوا اور راستے کے نشیب و فراز کو طے کرتا ہوا سرزمینِ اہواز میں داخل ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ لوگ اس کے اندر زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ اس کے سخت طبعی اور جغرافیائی حالات کی وجہ سے ان کو قدم قدم پر دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پہاڑی راستوں میں اوپر چڑھتے ہوئے فوج کو کھوکھلی اور نوکیلی چٹانوں سے گزرنے کی مشقت جھیلنی پڑتی اور نیچے اُترتے ہوئے سڑے ہوئے متعفن پانی کے جوہڑوں کی تکلیف برداشت کرنی پڑتی۔ اس کے علاوہ خطرناک قسم کے جان لیوا سانپوں اور سست مگر چوکنے زہریلے بچھوؤں کی مصیبت سے الگ نمٹنا پڑتا تھا۔ لیکن حضرت سلمہ ابن قیسؓ کی صاف و شفاف اور مومن رُوح ہر وقت اپنے لشکر کے اُوپر سایہ فگن رہتی جس کی وجہ سے یہ ساری مصیبتیں خوشگوار اور دشوار راہیں آسان ہو گئی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے ان کو ایسی نصیحتیں کرتے رہتے جن سے اُن کی روحیں جھوم اُٹھتیں اور ان کی راتوں کو قرآن کی خوشبو سے معطّر

کرتے رہتے جس کی روشنی میں وہ نہا اُٹھتے اور اس کے نور میں تیرتے ہوئے اپنی ساری مشقتیں اور تکلیفیں بھول جاتے۔

حضرت سلمہ ابن قیسؓ نے خلیفۃ المسلمین کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی اور جب اہل اہواز سے ان کا سامنا ہوا تو سب سے پہلے ان کے سامنے اللہ کا دین پیش کیا مگر انھوں نے نفرت واعراض کا اظہار کیا۔ پھر ان کو جزیہ کی ادائیگی کی دعوت دی لیکن انھوں نے انکار اور استکبار کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے سامنے جنگ کے سوا دوسری کوئی صورت باقی نہیں بچی۔ چنانچہ وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اجر آخرت کے حصول کی نیت سے میدان جنگ میں کود پڑے۔ دونوں فوجیں پوری قوت کے ساتھ ایک دوسری سے ٹکرائیں۔ معرکۂ کارزار گرم ہوا اور جنگ کے شرارے اُڑنے لگے اور فریقین نے شجاعت وبسالت اور ہمت وجواں مردی کے ایسے جوہر دکھائے جن کی مثال جنگوں کی تاریخ میں شاذونادر ہی نظر آتی ہے۔ آخر کار جنگ کا خاتمہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرنے والے اہل ایمان کی فتح مبین اور دشمنان خدا، اہلِ شرک کی شکستِ فاش پر ہوا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب حضرت سلمہ ابن قیسؓ مجاہدین میں مال غنیمت کی تقسیم کی طرف متوجہ ہوئے تو اس میں ان کو ایک نہایت عمدہ اور بیش قیمت زیور ملا۔ انھوں نے چاہا کہ اسے ہدیہ کے طور پر امیر المومنین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے فوجیوں سے کہا۔

”اگر اس زیور کو تم سارے لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جائے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ تو کیا تم سب لوگ اس بات پر راضی ہو کہ اسے امیر المومنین کی خدمت میں ہدیۃً بھیج دیا جاتے؟“

سب نے خوشی سے اس کی اجازت دیدی اور انھوں نے اس زیور کو

ایک ڈبے میں رکھ کر اپنے قبیلے بنو اشجع کے ایک شخص کو بلایا اور اس سے کہا کہ اپنے غلام کے ساتھ مدینہ جاؤ۔ پہلے امیرالمومنین کو فتح کی خوش خبری سُنانا پھر ان کی خدمت میں یہ زیور ہدیہ کے طور پر پیش کر دینا۔ جب وہ اشجعی حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس کے اور حضرت عمرؓ کے درمیان ایک نہایت عبرت انگیز ماجرا پیش آیا۔ ہم وہ ماجرا اسی کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

"میں اپنے غلام کے ساتھ پہلے بصرہ پہنچا وہاں ہم نے سلمہؓ ابن قیس کی دی ہوئی رقم سے اپنے سفر کے لیے دو اونٹنیاں خریدیں اور ان کے اوپر اپنا سامان اور زادِ راہ لاد کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر میں نے امیرالمومنین کو تلاش کیا۔ وہ مسلمانوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس پر وہ کسی چرواہے کی طرح ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ وہ کھانے والوں کے برتنوں کو دیکھ دیکھ کر اپنے غلام یرفاؔ سے کہتے جا رہے تھے۔

"یرفاؔ! ان کے برتن میں اور گوشت ڈالو، ان کو اور روٹیاں دو۔ ان کے پیالے میں اور شوربہ ڈالو۔"

جب میں ان کے سامنے پہنچا تو انھوں نے مجھے بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں قریب ہی لوگوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر میرے سامنے کھانا لایا گیا اور میں نے کھالیا۔ جب سارے لوگ کھانے سے فارغ ہو چکے تو وہ یرفاؔ کو برتن سمیٹنے کا حکم دے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے چلا۔ جب وہ گھر میں داخل ہو گئے تو میں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے مجھے اجازت دیدی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک نمدے پر دو تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں جن کے اندر کھجور کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان میں سے ایک تکیہ میری طرف سرکا دیا جس پر میں بیٹھ گیا۔ ان کی پشت کی طرف ایک دروازہ تھا

جس پر پردہ لٹک رہا تھا۔ انھوں نے پردے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

"ام کلثوم! میرا کھانا۔"

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ دیکھوں، امیر المومنین کا مخصوص کھانا کیسا ہے۔ ان کی اہلیہ نے ان کو روغن زیتون لگی ہوئی روٹی دی جس پر نمک کی ایک ڈلی رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کھانے کے لیے کہا اور میں نے امتثال امر کے طور پر تھوڑا سا کھایا۔ میں نے ان کے سوا کسی دوسرے آدمی کو اتنی رغبت اور شوق سے کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے کہا، مجھے پلاؤ۔ گھر والے ایک پیالہ لائے جس میں جو کے ستو کا گھول تھا۔ انھوں نے کہا، پہلے اس کو پلاؤ۔ میں نے پیالہ لے کر اس میں سے بہت تھوڑا سا پیا۔ کیونکہ میرا ستو اس سے زیادہ لذیذ اور عمدہ تھا۔ پھر انھوں نے خوب آسودہ ہو کر پیا اور پی چکنے کے بعد کہا۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی اَطْعَمَنَا فَاَشْبَعَنَا وَسَقَانَا فَاَرْوَانَا۔ — شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم کو کھلا کر آسودہ اور پلا کر سیراب کیا۔"

اس وقت میں نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"امیر المومنین! میں آپ کے پاس ایک پیغام لایا ہوں۔"

"کہاں سے؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"سلمۂ ابن قیس کے یہاں سے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں سلمۂ ابن قیس اور ان کے قاصد کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"... مجھے مسلمانوں کے لشکر کا حال بتاؤ۔" انھوں نے کہا۔

"امیر المومنین! جیسا کہ آپ پسند کرتے ہیں، فوج بخیر و عافیت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے اور اللہ کے دشمنوں پر فتح و کامرانی عطا فرمائی ہے۔" میں نے عرض کیا۔ پھر میں نے ان کو فتح کی خوش خبری سنائی اور تفصیل کے ساتھ فوج کے

حالات بتائے تو انھوں نے کہا۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ... اَعْطٰی فَتَفَضَّلَ وَ اَنْعَمَ فَاَجْزَلَ۔ شکر ہے خدا کا جس نے اپنی مہربانی سے عطا کیا اور اپنے انعام سے خوب نوازا۔"

پھر پوچھا، "کیا بصرہ کی طرف سے ہو کر آئے ہو؟"

میں نے کہا، "جی ہاں امیرالمومنین!"

"وہاں مسلمان کیسے ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"خدا کے فضل سے بخیریت ہیں" میں نے جواب دیا۔

"اشیاءِ ضرورت کے نرخ کیسے ہیں؟" انھوں نے دریافت کیا۔

"ہر چیز انتہائی ارزاں ہے" میں نے جواب دیا۔

پھر پوچھا، "گوشت کا کیا حال ہے؟ اس لیے کہ گوشت عربوں کی بنیادی غذا ہے۔ اس کے بغیر ان کی معیشت درست نہیں ہو سکتی۔"

میں نے عرض کیا، "گوشت بہت وافر مقدار میں ہے۔"

پھر انھوں نے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمن پر فتح دی اور ہم نے مالِ غنیمت اکٹھا کیا تو سلمہؓ ابن قیس نے اس میں اس زیور کو دیکھ کر فوج سے کہا۔

"اگر اس زیور کو تمہارے درمیان تقسیم کیا جائے تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں لگے گا۔ اگر میں اسے امیرالمومنین کی خدمت میں بھیج دوں تو کیا تم سب لوگ اس پر راضی ہو؟" تو سب نے کہا، "ہاں!" یہ کہہ کر میں نے وہ ڈبہ ان کے حوالے کر دیا۔ جب انھوں نے ڈبے کو کھولا اور ان کی نظر زیور اور اس میں جڑے ہوئے سُرخ، زرد اور سبز نگینوں پر پڑی تو اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑے ہو گئے اور ڈبے

کو زمین پر پھینکتے ہوئے اپنے ہاتھ کو کمر پر رکھ لیا۔ زمین پر گرنے کے بعد نگینے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ ان کی عورتوں نے سمجھا کہ میں دھوکے سے ان کو قتل کرنا چاہتا ہوں اس لیے وہ سب دروازے کی طرف لپکیں۔

پھر خلیفہ نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"انھیں اکٹھا کرو"، اور اپنے غلام یرفأ کو حکم دیا۔

"اسے خوب اچھی طرح مارو۔"

میں ڈبے سے نکل کر بکھرے ہوئے نگینوں کو جمع کرنے لگا اس دوران یرفأ مجھے برابر مارے جا رہا تھا۔

پھر انھوں نے کہا، "اُٹھ، نہ تُو اچھا ہے نہ تیرا قائد۔"

میں نے اُٹھ کر عرض کیا، امیرالمومنین! اہواز تک جانے کے واسطے میرے اور میرے غلام کے لیے سواریوں کا انتظام کرا دیجئے۔ کیونکہ آپ کے غلام نے ہماری سواریاں لے لی ہیں۔ تو انھوں نے یرفأ سے کہا کہ "اس کو اور اس کے غلام کو صدقہ کے اونٹوں میں سے دو سواریاں دے دو۔" پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جب تمہاری ضرورت پوری ہو جاتے تو یہ دونوں اونٹنیاں ان لوگوں کو دیدینا جو تم سے زیادہ ان کے ضرورت مند ہوں۔"

تو میں نے کہا۔ "امیرالمومنین! میں ایسا ہی کروں گا۔ جی ہاں ان شاء اللہ آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔"

پھر انھوں نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"سُن لو!! خدا کی قسم ان زیورات کی تقسیم سے پہلے اگر فوج اِدھر اُدھر بکھر گئی تو تمہیں اور تمہارے قائد دونوں کو سخت عبرت ناک سزا دوں گا۔"

میں نے اسی وقت وہاں سے کوچ کر دیا اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا ہوا سلمہؓ ابن قیس کے پاس پہنچا اور ان سے کہا۔

"جس کام کے لیے آپ نے مجھے اپنا خصوصی ایلچی بنایا تھا وہ میرے لیے بڑا نامبارک ثابت ہوا قبل اس کے کہ میرے اور آپ کے اُوپر کوئی بھاری مصیبت نازل ہو اِن زیورات کو فوراً فوج میں تقسیم کر دیجیے۔" اس کے بعد میں نے ان کو وہ پُوری سرگزشت سُنائی جو میرے اُوپر بیتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس مجلس کو برخاست کرنے سے پہلے پہلے وہ زیورات فوج میں تقسیم کر دیے۔"

حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہٗ

وہ اس یثربی نوجوان "مُعاذ بن جبل" کے عُنفوانِ شباب کا زمانہ تھا جب خاورِ اسلام کی ہدایت ریز شعاعیں جزیرۂ عرب کی تاریک فضاؤں میں ضَوفگن ہو ئی تھیں۔ وہ اپنے ہم جولیوں میں اپنی تیز فہمی، قوتِ استدلال، خوش بیانی اور بلند ہمتی کے لحاظ سے ایک منفرد و ممتاز مقام کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک خوبرو اور حسین و جمیل نوجوان تھا۔ اس کی آنکھیں سُرمگیں، سَر کے بال گھونگھریالے اور دانت موتی کی طرح سفید ُبراق تھے۔ وہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے راستے اُتر کر ان کے دل میں گھر کر لیتا تھا۔ نوجوان مُعاذ بن جبل مکی داعیٔ اسلام حضرت مُصعب بن عمیرؓ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اور لیلۃ العقبہ میں اس کے ہاتھوں نے بڑھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے مصافحہ اور ان پر بیعت کی۔ وہ ان بہتّر پاک نفس انسانوں میں شامل تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت و ملاقات کا شرف حاصل کرنے اور تاریخ کے صفحات میں اپنے ہاتھوں سے ایک دل کش اور روشن ترین باب رقم کرنے مکہ گئے تھے۔

نوجوان مُعاذ بن جبل نے مکہ سے مدینہ واپس پہنچتے ہی اپنے ہم جولیوں کی ایک مختصر ٹولی کے ساتھ مل کر بتوں کو توڑنے اور ان کو خفیہ یا علانیہ طور پر مشرکین کے گھروں سے نکال پھینکنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ اور ان کم سن نوجوانوں کی اس کارروائی

کا اثر یہ ہوا کہ یثرب کا ایک بہت بڑا آدمی "عمرو بن جموح" اِسلامی جماعت میں شامل ہوگیا۔

عمرو بن جموح کا شمار قبیلہ بنو سلمہ کے سربرآوردہ رئیسوں اور بڑے سرداروں میں ہوتا تھا۔ دُوسرے شرفار کی طرح انھوں نے بھی اپنے لیے نہایت نفیس اور بیش قیمت لکڑی کا ایک بت بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے رکھ رکھاؤ کا نہایت اہتمام کرتے، اس کے اُوپر ریشمی کپڑے ڈالتے اور ہر روز صبح کو اسے خوش بُو سے معطر کرتے۔

ایک رات ان نوجوانوں نے ان کے بت کو اس کی جگہ سے اُٹھایا اور اسے لے جاکر بنو سلمہ کی آبادی کے پیچھے ایک گڑھے میں پھینک دیا جس میں کوڑا کرکٹ اور غلاظت ڈالی جاتی تھی۔ جب صبح کو بڑے میاں بیدار ہوئے اور بت کو اپنی جگہ پر نہیں پایا تو اسے ہر طرف تلاش کرتے پھرے۔ آخر کار اس کو ایک گڑھے میں گندگی میں لت پت مُنہ کے بل پڑا ہوا دیکھا تو بولے۔

"تمہارا بُرا ہو، آج رات ہمارے معبُود کے ساتھ کس نے یہ زیادتی کی ہے؟"

پھر اس کو گڑھے سے نکالا، دھو کر صاف کیا اور خوش بُو لگا کر یہ کہتے ہوئے دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

"مناۃ! خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ تمہارے ساتھ یہ حرکت کس نے کی ہے تو میں اسے سخت ذلت آمیز سزا دوں گا۔"

اور رات کو جب بڑے میاں سو گئے تو لڑکے چپکے سے بُت کے پاس پہنچے اور اس کے ساتھ پھر وہی کارروائی کی جو گزشتہ رات کر چکے تھے۔ صبح کو وہ پھر اسے ڈھونڈنے نکلے اور جب وہ ایک دوسرے گڑھے میں پڑا ہوا مل گیا تو اس کو نکال کر دھویا اور صاف ستھرا کر کے خوشبو لگائی اور زیادتی کرنے والوں کو سخت دھمکی دی۔

تیسری رات جب لڑکوں کی طرف سے پھر اسی حرکت کا اعادہ ہوا تو انھوں نے ان کو

گڑھے سے نکال کر صاف کیا اور اس کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر اپنی تلوار لائے اور اس کو بُت کی گردن کے ساتھ لٹکاتے ہوئے اس کو مخاطب کر کے کہا۔

"مناۃ! خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ تیرے ساتھ یہ نازیبا حرکت کون کرتا ہے۔ اگر تمہارے اندر ذرا بھی خیر ہے تو یہ تلوار تمہارے ساتھ ہے اس سے تم خود اپنا دفاع کرنا۔"

رات کو جب شیخ سو گئے تو لڑکوں نے اس بُت کے ساتھ پھر وہی حرکت کی۔ انھوں نے اس کی گردن سے تلوار اُتار لی، اس کو ایک مُردہ کتّے کی گردن کے ساتھ باندھا اور ان دونوں کو لے جا کر گڑھے میں پھینک آئے۔ صبح کو شیخ نے بڑی سرگرمی کے ساتھ اس کی تلاش شروع کی۔ آخر وہ ان کو مُردہ کتّے کے ساتھ بندھا ہوا غلاظت میں ملوث گڑھے میں اوندھے مُنہ پڑا ہوا ملا۔ اس وقت انھوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تَاللّٰهِ لَوْ كُنْتَ إِلٰهًا لَمْ تَكُنْ أَنْتَ وَكَلْبٌ وَسْطَ بِئْرٍ فِي قَرَنْ۔ خدا کی قسم! اگر تو معبود ہوتا تو، کتّے کے ساتھ بندھا ہوا گڑھے میں نہ پڑا ہوتا۔"

اس کے بعد بنو سلمہ کے اس شیخ نے اسلام قبول کر لیا اور بڑے اچھے مسلمان ہوئے۔

جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سائے کی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ لگے رہتے۔ انھوں نے آپ سے قرآن سیکھا اور شرائع اسلام کا علم حاصل کیا یہاں تک کہ ان کا شمار اصحابِ رسُول میں کتاب اللہ کے بڑے قاریوں اور شریعت خداوندی کے زبردست عالموں میں ہونے لگا۔ یزید ابنِ قُطَیب کا بیان ہے۔

"میں حمص کی مسجد میں داخل ہوا۔ میں نے وہاں دیکھا کہ ایک نوجوان کے گرد

لوگوں کا بہت بڑا مجمع اکٹھا ہے، جس کے بال گھونگھریالے ہیں۔ جب وہ بولتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے منھ سے روشنی نکل رہی ہے اور موتی جھڑ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟" تو لوگوں نے کہا۔ "معاذ بن جبلؓ"۔

اور ابو مسلم خولانی کہتے ہیں کہ "میں دمشق کی مسجد میں گیا۔ وہاں ایک علمی مجلس منعقد تھی جس میں بڑے بڑے سن رسیدہ صحابۂ کرام تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں سُرمگیں آنکھوں اور چمکدار دانتوں والا ایک نوجوان بھی شریک تھا۔ جب لوگوں کے درمیان کسی علمی مسئلے میں اختلافِ رائے واقع ہوتا تو اسی نوجوان کی طرف رجوع کرتے۔ میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ تو اس نے کہا۔ معاذ بن جبلؓ"۔

اور اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے بچپن ہی سے اپنی تعلیم و تربیت کے سارے مراحل درس گاہِ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں طے کیے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرچشمۂ علم و معرفت سے سیراب ہو کر انھیں کے ہاتھوں فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ سب سے اچھے معلّم کے سب سے اچھے شاگرد تھے اور معاذ بن جبلؓ کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول کافی ہے،

"اَعْلَمُ اُمَّتِیْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ۔" میری اُمّت میں حلال و حرام کے سب سے بڑے عالم معاذ بن جبلؓ ہیں۔"

اور اُمّت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ ان چھ خوش نصیب افراد میں سے تھے جنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں قرآن جمع کیا تھا۔ اسی لیے اصحابِ رسُول کا یہ حال تھا کہ جب وہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی موجودگی میں کوئی علمی بات کرتے تو ان کی ہیبت اور

علمی عظمت کی وجہ سے سب کی نظریں اُن کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔
رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آپؐ کے دونوں ساتھیوں حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ان کی بے مثال علمی قوت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا کام لیا۔
یہ ہیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو فتحِ مکہ کے بعد قریش کو فوج در فوج مسلمان ہوتے دیکھتے ہیں اور نئے مسلمانوں کے لیے کسی اچھے معلّم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو ان کو اسلام کی تعلیم دے اور اس کے احکام سے روشناس کرائے۔ چنانچہ آپؐ مکہ میں حضرت عتاب بن اُسیدؓ کو اپنا نائب بناتے ہیں اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم اور اسلام کی تفہیم کے لیے حضرت معاذ بن جبلؓ کو ان کے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ اور جب شاہانِ یمن کے نمائندوں نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اپنے اور اپنی قوم کے قبولِ اسلام کا اعلان کیا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی ایسے شخص کو اپنے ساتھ بھیجنے کی درخواست کی جو وہاں لوگوں کو دین کی تعلیم دے سکے تو آپؐ نے اس اہم کام کے لیے اپنے اصحاب کرام پر مشتمل داعیوں اور ہادیوں کی ایک جماعت تشکیل دی اور ان کا سربراہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو مقرر فرمایا۔ اور روشنی کے ان سفیروں کو الوداع کہنے کے لیے بہ نفسِ نفیس نکلے اور حضرت معاذؓ کی سواری کے ساتھ ساتھ دیر تک چلتے رہے۔ گویا آپؐ ان کو جی بھر کر دیکھ لینا چاہتے تھے۔ اس پُورے عرصے میں حضرت معاذؓ اپنی اونٹنی پر سوار رہے۔ آپؐ نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

"معاذ! شاید اس کے بعد تمہاری ملاقات مجھ سے نہ ہو سکے۔ اب تمہارا گزر میری مسجد اور قبر پر ہوگا۔"

حضرت معاذؓ اپنے نبی، اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی

کے صدمے سے رو پڑے اور ان کے ساتھ ہی دُوسرے مسلمانوں کی آنکھوں کے پیمانے بھی لبریز ہو کر چھلکنے لگے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور واقعی حضرت معاذ بن جبلؓ کی آنکھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے پھر کبھی روشن نہ ہو سکیں۔ کیونکہ ان کی یمن سے واپسی کے پہلے ہی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو چکا تھا۔ جب وہ مدینہ واپس آئے اور اس کو اپنے محبوب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُنس و محبت سے خالی پایا تو بہت روئے۔

جب خلافت کی زمامِ کار حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے حضرت معاذؓ کو بنی کلاب میں ان کے وظائف تقسیم کرنے اور اغنیا سے وصول کی ہوئی صدقہ و زکوٰۃ کی رقمیں فقراء و مساکین میں بانٹنے کے لیے بھیجا تو وہاں انھوں نے اپنی ذمہ داری نہایت دیانتداری کے ساتھ ادا کی اور گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالنے کا ٹاٹ جو گھر سے لے کر نکلے تھے اسی کو اپنے گلے میں لپیٹے ہوئے اپنی اہلیہ کے پاس واپس آ گئے۔ اہلیہ نے پوچھا کہ وہ ہدیے کہاں ہیں جو والی لوگ اپنے گھر والوں کے لیے لاتے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ "میرے ساتھ ایک نہایت ہوشیار نگراں تھا جو ہر وقت میرے اُوپر نظر رکھتا تھا۔"

"آپ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کے نزدیک قابلِ اعتماد اور امین تھے۔ پھر عمرؓ آئے تو اُنھوں نے آپ کی نگرانی کے لیے نگراں مقرر کر دیا؟"

بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ پھر انہوں نے اس بات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیویوں سے کہہ کر ان کی شکایت کی۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت معاذؓ کو بلا کر پوچھا۔

"کیا میں نے تمہاری نگرانی کے لیے تمہارے ساتھ کوئی نگراں بھیجا تھا؟"

"نہیں تو امیر المومنین! لیکن اس سے بہانہ کرنے کے لیے اس کے سوا دُوسری کوئی بات مجھے نہیں سوجھی۔" یہ سُن کر حضرت عمرؓ ہنس پڑے اور ان کو کچھ دے کر کہا کہ "اِس کے ذریعے اُس کو راضی کرلو۔"

اور حضرت فاروق اعظمؓ ہی کے دورِ خلافت کی بات ہے کہ شام کے گورنر حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ نے ان کے یہاں پیغام بھیجا۔

"امیرالمومنین! شام کی آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ان کو ایسے لوگوں کی سخت ضرورت ہے جو ان کو قرآن کی تعلیم دے سکیں اور دین سکھا سکیں امیرالمومنین! آپ ایسے لوگوں کے ذریعے ہماری مدد فرمائیں جو یہ خدمت انجام دے سکیں۔"

تو حضرت عمرؓ نے ان پانچ اصحاب کو طلب فرمایا جنھوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں جمعِ قرآن کی خدمت انجام دی تھی۔ اور وہ تھے حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ ابن صامِت، حضرت ابوایوب انصاریؓ حضرت اُبَیّ بن کعب اور حضرت ابودردار رضوان اللہ علیہم اجمعین ——— اور ان سے کہا۔

"آپ کے شامی بھائیوں نے مجھ سے کچھ ایسے اصحابِ علم کی خدمات طلب کی ہیں جو انھیں قرآن اور فقہِ دین کی تعلیم دے سکیں۔ آپ لوگ اپنے میں سے تین آدمیوں کے ذریعے میری مدد کریں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کے لیے قرعہ اندازی کرلیں ورنہ میں اپنی پسند سے تین آدمیوں کو بھیج دوں گا۔"

تو ان لوگوں نے کہا کہ "اِس میں قرعہ اندازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ابوایوب کافی ضعیف ہوگئے ہیں اور اُبَیّ بن کعب ایک مریض آدمی ہیں۔ باقی ہم تین آدمی بچتے ہیں۔" ان کا یہ جواب سُن کر حضرت عمرؓ نے کہا۔

"آپ لوگ سب سے پہلے حمص جائیں اگر اہل حمص کا حال آپ کو پسند آئے تو اپنے میں سے ایک آدمی کو وہاں چھوڑ دیں، ایک آدمی دمشق اور ایک فلسطین چلا جائے۔"

حضرت فاروقِ اعظم کے حکم کے مطابق تینوں حضرات پہلے حمص پہنچے اور وہاں حضرت عُبادہؓ ابنِ صامت کو چھوڑا۔ پھر حضرت ابودرداءؓ نے دمشق کی راہ لی اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فلسطین چلے گئے۔

وہاں حضرت معاذ بن جبلؓ ایک وبائی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ جب ان کی وفات کا وقت قریب آگیا تو انھوں نے اپنا رُخ قبلہ کی طرف کر لیا۔ اس وقت ان کے ہونٹوں پر یہ ترانہ مچل رہا تھا۔

" مَرْحَبًا بِالْمَوْتِ مَرْحَبًا زَائِرٌ جَاءَ بعدَ غِيَابٍ وَحَبِيبٌ وَفَدَ عَلٰى شَوْقٍ۔

میں بصد شوق موت کو خوش آمدید کہتا ہوں، ایک ملاقاتی طویل غیر حاضری کے بعد آیا ہے، اور ایک محبوب بڑی تمناؤں کے بعد ملا ہے۔"

پھر آسمان کی طرف نظر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

" میرے معبود! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے دنیا اور اس کی زندگی کو اس لیے نہیں چاہا تھا کہ اس میں باغات لگاؤں اور نہریں جاری کروں بلکہ اگر اس کو چاہا تھا تو صرف اس غرض سے کہ گرمیوں کی دوپہر میں بھوک پیاس کی شدت برداشت کروں، کٹھن حالات کی سختیاں جھیلوں اور ذکر و تعلیم کی مجالس میں علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کروں۔ خدایا! تو کسی نفسِ مومنہ کی طرح میری جان کو اپنی کفالت میں لے لے۔"

پھر ان کی مقدس رُوح ـــ دعوت الی اللہ اور ہجرت فی سبیل اللہ کی حالت میں ـــ جسدِ خاکی کو چھوڑ کر اپنے رب کے حضور پہنچ گئی۔

مآخذ

(الف)

انساب الاشراف — بلاذری
اعلام النساء — کحالہ
اخبار القضاۃ — وکیع
القصص الاسلامیہ فی عہد النبویہ — احمد حافظ
المستطرف — البشیہی
البیان والتبیین — جاحظ
الصدیق — حسین ہیکل
المعارف — ابن قتیبہ
المعمرون — ابوحاتم سجستانی
القادسیہ — محمد احمد باشمیل
الکواکب الدریہ — محمد ابن سعید صحاجی بوصیری
الاستیعاب — حافظ ابن عبدالبر
الملل والنحل — عبدالکریم شہرستانی
الدرر فی اختصار المغازی والسیر — حافظ ابن عبدالبر
النجوم الزاہرہ — ابن تغری بردی
الاصابہ فی تمیز الصحابہ — حافظ ابن حجر عسقلانی
اسد الغابہ — ابن اثیر
البدایہ والنہایہ فی عہد النبوۃ — نشار
امتاع الاسماع — مقریزی
المحبر فی التاریخ — محمد بن حبیب
الطبقات الکبریٰ — ابن سعد
الکامل فی التاریخ — ابن اثیر
الشعر والشعراء — ابن قتیبہ
الاعلام ومراجعہ — زرکلی
الجرح والتعدیل — ابن ابی حاتم رازی
العبر — حافظ شمس الدین بن محمد ذہبی

کتاب	مصنف
الجمع بین رجال الصحیحین	محمد بن طاہر المقدسی
البدء والتاریخ	ابوزید احمد بن سہل بلخی
اشہر مشاہیر الاسلام	
الریاض النضرہ	محب الدین الطبری
الاغانی	ابوالفرج الاصفہانی
التاریخ الکبیر	محمد بن اسمٰعیل بخاری
ابوہریرۃ من سلسلۃ اعلام العرب	محمد عجاج خطیب
الزہد	امام احمد بن حنبل
اصحاب بدر	شیخ حسین غلامی

(ب)

کتاب	مصنف
صحیح بخاری	امام محمد بن اسمٰعیل بخاری

(ت)

کتاب	مصنف
تہذیب التہذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی
تہذیب	ابن عساکر
تاریخ الاسلام	حافظ ذہبی
تاریخ الطبری	ابن جریر الطبری
تقریب التہذیب	حافظ ابن حجر عسقلانی
تجرید اسماء الصحابہ	حافظ ذہبی
تاریخ الخمیس	الدیار بکری
تذکرۃ الحفاظ	حافظ ذہبی
تاریخ الامم والملوک	ابن جریر طبری
تاریخ خلیفہ ابن خیاط	العصفری
تحفۃ الاحوذی	عبیداللہ رحمانی مبارکپوری
تاریخ الخلفاء	حافظ جلال الدین سیوطی
تہذیب الاسماء واللغات	امام شرف الدین نووی
تاج العروس من جواہر القاموس	مرتضیٰ زبیدی

(ث)

کتاب	مصنف
ثمار القلوب فی المضاف والمنسوب	ثعالبی

(ج)

کتاب	مصنف
جمہرۃ انساب العرب	ابن حزم
جمہرۃ الاولیاء	
جامع الاصول من احادیث الرسول	ابن اثیر

(ح)

کتاب	مصنف
حماۃ الاسلام	مجد الدین
حلیۃ الاولیاء	ابونعیم اصفہانی
حیاۃ الصحابہ	محمد یوسف کاندھلوی

حسن الصحابہ

(خ)

خلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال

خزانۃ الادب — البغدادی

(د)

دیوان حسان بن ثابت وشروحہ — عبدالرحمٰن برقوقی

دائرۃ المعارف الاسلامیہ — فرید وجدی

دُوَل الاسلام — حافظ ذہبی

(ذ)

ذیل تاریخ الطبری

ذیل المذیل — الطبری

(ر)

رغبۃ الآمل فی شرح الکامل — مرصفی

رجال حول الرسول — خالد محمد خالد

(ز)

زُعماء الاسلام — حسن ابراہیم حسن

(س)

سیر اعلام النبلاء — حافظ شمس الدین ذہبی

سیرۃ بطل — محمد زیدان

سلسلہ اعلام المسلمین

سمط اللآلی — محمد قولیم بن علی الشریف التونسی

سعد بن ابی وقاص و ابطال قادسیہ — سحّار

(ش)

شہداء الاسلام فی عہد النبوۃ — نشّار

شذرات الذہب — ابو الفلاح عبدالحی بن العماد حنبلی

شرح الفیہ — العراقی

(ص)

صفوۃ الصفوہ — ابن جوزی

(ط)

طبقات علماء افریقیہ و تونس

طبقات فحول الشعرا — محمد بن سلام الجمحی

طبقات — الشعرانی

طبقات — ابن سعد

طبقات فقہاء الیمن — ابن سمرہ الجعدی

(ع)

عبداللہ بن زبیر — ڈاکٹر علی خربوطلی

(غ)

غایۃ النہایہ — محمد بن محمد الجوزی

(ف)

فتوح مصر واخبارہا — عبدالرحمن بن عبداللہ بن عبدالحکیم

فتح الباری — حافظ ابن حجر عسقلانی

فتوح البلدان — بلاذری

(ق)

قلائد الجمان فی التعریف بقبائل الزمان — القلقشندی

قادۃ فتح فارس — محمود شیث خطاب

قادۃ فتح العراق والجزیرہ — محمود شیث خطاب

(ک)

کنز العمال — شیخ علی متقی

(م)

مرآۃ الجنان — یافعی

محاضرات الادباء — راغب اصفہانی

مروج الذہب — المسعودی

مجمع الزوائد — حافظ ابوبکر الہیثمی

مسند ابی داؤد — امام ابوداؤد سجستانی

مختصر تاریخ دمشق

مجموعۃ الوثائق السیاسیہ — ڈاکٹر محمد حمید اللہ

معجم البلدان — یاقوت حموی

مسلم — امام مسلم نیشاپوری

معرفۃ القراء الکبار علی الطبقات والاعصار — تحقیق محمد جاد الحق

مع الرعیل الاول — محب اللہ بن خطیب

(ن)

نسب قریش — زبیری

نہایۃ الادب — احمد بن علی القلقشندی

(و)

وفیات الاعیان — ابن خلکان